مزاحیہ شرحِ دیوانِ غالب

غلام احمد فرقت

بار اوّل ستمبر ۱۹۶۴ء

پرنٹر : سرفراز قومی پریس ناداں محل روڈ لکھنؤ

پبلشر :- ادارۂ فروغِ اردو
نمبر ۳۷ امین آباد۔ لکھنؤ
فون نمبر - 26135

قیمت آٹھ روپیہ

میں اپنی اس کتاب کو

محمد حسین شمس علوی

مالک ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ

کے

نام نامی سے معنون کرتا ہوں

فرقت کاکوروی

مقدمہ

مرزا اسد اللہ خاں غالب

میاں! ہوش کے ناخن لو۔ یوں کیوں میری رسوائی کے درپے ہوئے ہو کہ مجھ سے ہی میرے کلام پر مقدمہ لکھواتے اور مجھ ہی سے زہر کھلواتے ہو۔ کیا اندھیر ہے ؎

زہر دیں اُس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا

ایک تو سیاہ کار اُس پر طرہ یہ کہ آپ اپنی سیاہ کاریوں کا تجزیہ کروں اور اقبالی مجرم بنوں۔ بہتر ہوا جو میں اپنے کلام کے پہلے ہی نسخہ کو دیکھ کر مر لیا اور موت کا بھاری پتھر اپنے سینے پر دھر لیا ورنہ تم دنیا والے ؎

ابھی اور کیا نہ کرتے اگر اختیار ہوتا

جب مجبوری پر یہ عالم ہے تو با اختیار ہونے پر کیا کچھ اٹھا رہتا۔ اس ستم ظریفی کا کیا ٹھکانا کہ مجھ سے ہی محضر کی عبارت لکھواتے ہو اور اُس پر دستخط کراتے ہو۔ تمھارے یہاں کے ایک ادبی گورکن میاں نظم طباطبائی میرے گڑے مردے اکھاڑ کر آئے ہیں اور میرے اشعار کے وہ مطالب بتائے ہیں جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ رائی کا ایک اچھا بھلا پہاڑ کھڑا کیا ہے جس پر آنے والوں نے نیا نیا رنگ بھرا ہے۔ سبھوں کی شرحیں میری

نگاہ سے گذریں مگر مجھے تمھارے علاوہ سبھوں کے معنی و مطالب سے اختلاف ہے۔ شعر فہمی چیزے دیگر است۔ بہتوں نے میرے شعروں کا خون کر کے مجھے مطعون اور بدنام کیا۔ شارحین میں اگر کسی نے میری تلمیحات پر صحیح نگاہ ڈالی تو وہ صرف تمہاری ذات تھی جس نے تمام پچھلی شرحوں کو کالعدم کر دیا۔ اب جو تمھیں پڑھے گا وہی مجھے سمجھے گا۔ تم نے ایسے ایسے داخلی اور خارجی حالات لکھے ہیں جنھیں میں ہی سمجھتا ہوں۔

دوسروں کے کلام پر تقریظ لکھنا بار سمجھتا ہوں تو خود اپنے کلام اور اس کی شرح پر مقدمہ لکھنا کیسے ممکن ہے۔ پر کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ایرانی اُردو لکھنے والوں کی سمجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کر یں۔ میرے قصیدے دیکھو تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے، مدح کے شعر کمتر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔

نواب مصطفیٰ خاں کے تذکرے کی تقریظ کو ملاحظہ کرو کہ ان کی مدح کتنی ہے۔ مرزا رحیم الدین بہادر حیا تخلص کے دیوان کے دیباچے کو دیکھو۔ وہ جو تقریظ دیوان حافظ کی بموجب فرمائش جان جاکوب بہادر کی لکھی ہے۔ اس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت میں اُن کا نام اور اُن کی مدح آئی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی مطالب ہیں۔ واللہ باللہ اگر کسی شہزادے یا امیر زادے کے دیوان کے دیباچے لکھتا تو اس کی اتنی مدح نہ کرتا جتنا تمھارا مداح ہوں۔ ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے ہو تو اس لکھے کو بہت جانو۔ بیشتر ترقی پسند حضرات اس تقریظ کو مہمل کہیں گے کس واسطے کہ اُن کے کان اس کے آشنا ہیں۔ جو لوگ آل احمد سرور اور میاں احتشام کے مقدموں کے عادی ہیں وہ میری نثر کو دیوانے کی بڑ نہ کہیں گے تو اور کیا کہیں گے۔

ہائے میرے اس شعر کی غالب فروشوں نے کیا رڑیدہ ماری ہے۔

حسن اور اُس پہ حسن ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائیں کیوں

ہائے اس شعر کے معنے تم نے کیا بتائے ہیں اور ٹھیک کہا ہے کہ میرزا صاحب کے محبوب کے رخسار سرخ سرخ ٹماٹر جیسے تھے۔ یہ یاد دلا کر اک ایسا تیر سینہ پہ مارا کہ ہائے ہائے۔ اپنی جوانی یاد آ گئی۔ عالم برزخ میں تمھاری شرح کے اقتباسات پڑھ کر اُن کے رُخسار اور اُن کی خوش اعتمادی سینے پر لوٹ رہی ہے تم کو معلوم ہے کہ معشوق کی یہی دو صفتیں عشاق کو اپنا اسیر بناتی ہیں اور اُس کے حسن کی مٹھاس میں خوش اعتمادی کی تلخی دیسا ہی مزہ دیتی ہے جیسا شراب پینے کے بعد کباب۔ بہر حال جیسا کہ تم نے لکھا ہے کہ وہ ایک طرف تو حسین تھیں اور دوسری طرف جو بات وہ صحیح سمجھ لیتی تھیں اسے ہر قیمت پر صحیح مانتی تھیں۔ اس شعر میں جو تلمیح ہے آپ سے بند بند اُن کے ڈر سے رقیب پر چسپاں کر کے کہا ہے کہ جب اُن کو اپنے اوپر ایسا بھروسہ ہے تو رقیب کا امتحان کیوں کرے چنانچہ اس حسن ظن نے رقیب کی شرم رکھ لی ورنہ حقیقتاً وہ سخت مغالطہ میں مبتلا تھیں رقیب صادق نہ تھا۔ ہوس ناک آدمی تھا اگر پائے امتحان درمیان میں آتا تو اُس کی حقیقت آشکار ہو جاتی۔ اب تلمیح ملاحظہ ہو۔

اُن کے یہاں ایک شخص گھسیٹے نامی ملازم تھا جو مادر زاد چور اور اٹھائی گیرا تھا ہر سودے سلف میں دو چار پیسے مار دیتا تھا۔ میں نے لاکھ لاکھ سمجھایا کہ تم اُس کی بے ایمانی کو ایمانداری سمجھے ہوئے ہو وہ پرلے سرے کا بے ایمان اور نمک حرام ہے تمھارے سامنے جو وہ میاؤں میاؤں کرنے لگتا ہے تم یہ سمجھتی ہو کہ وہ بڑا وفادار اور دیانتدار ہے اور تم سے اُسے اُنس ہے۔ تمھارے سر عزیز کی قسم ایسا نہیں ہے۔ بڑا ہی بدبخت، مطلب پرست

(بوالہوس) اور نمک حرام ہے مگر وہ نہ ماننا تھا نہ مانیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ ارے ایک مرتبہ جب سودا لینے جائے تو پیچھے پیچھے مجھے ساتھ کردو۔ اگر ہاتھ کے ہاتھ نہ پکڑلوں تو بجائے اُس کے مجھے چور سمجھنا مگر کسی طرح اس پر تیار نہ ہوئیں۔ اور زندگی میں ایک بار بھی محض میری ضد اور اپنی خوش عقیدگی کی بنا پر مجھے اُس کا امتحان نہ لینے دیا چنانچہ مرتے مرتے وہ جیسا کا تیسا بے ایمان رہا۔ آسے ایماندار اور مجھے ہمیشہ جھوٹا سمجھتی رہیں اگر ایک مرتبہ وہ مجھے ساتھ کردیتیں تو میں اُس کی ساری ایمانداری کا بھانڈا پھوڑ دیتا۔ یہ دوسرا شعر میرے ذاتی ملازم سے تعلق رہے۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم   میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

اس شعر میں بھی ایک تلمیح ہے۔ میرے خدمتگار قدیم میاں رسولے جنھیں میں نے بڑا ٹھوک بجا کر رکھا تھا اور اُن کی جنسی قسم کو ان کی رفتار و گفتار سے بھانپ کر کہا تھا تیسری جنس سے تعلق رکھتے تھے جوانی میں میں اُن سے نامہ بر کا کام لیتا تھا۔ میرا پیغام لے جاتے اور اُن کا جواب پہنچا جاتے یہ حقیقت ہے کہ تیسری جنس والے کھوٹ کیا جانیں اللہ بخشے بڑے صفدار اور معتمد علیہ تھے جب وہ مجھ سے بگڑ کر چل دیئے تو میں بستہ پا ہوگیا۔ ایسے لوگ صرف بنوانے سے بنتے ہیں رکھے لگائے کہاں ملتے ہیں۔ اِس واقعہ کے کچھ دن بعد میرے ایک کرم فرما تشریف لائے اور ایک عدد رسولے نما صاحبزادے کو ہمراہ لائے۔ تعارف یوں کرایا کہ مادر زاد وفادار اور نمک کی حد تک نیت کا پابند ہے چہرے مہرے رفتار و گفتار سے ساری کی ساری باتیں رسولے سے ملتی جلتی تھیں بلکہ ظاہر میں اُن سے بھی بڑھ چڑھ کر تھیں بولے آپ اِس سے کام لیں میں ضامن ہوں کہ یہ ایسی ویسی حرکت نہ کرے گا۔ بات گئی گذری ہوئی۔ میں نے اُسے رکھ لیا

پر دل میں گمان رہا کہ چوٹ نہ دے جائے کیونکہ سُنے بیٹھا تھا کہ :-

بھولی بھالی شکل والے ہوتے ہیں جالی کبھی

قضا را میرا گمان صحیح ہوا۔ قاصد مکتوب الیہ کو جو دو بچیوں کی ماں ہو چکی تھی دیکھ کر والہ و شیفتہ ہوگیا کیا خط اور کیا جواب ایک رداس اور دو پٹوں کو لے نوک دم چلتا بنا تین دن بعد جب وہ گدھے کے سر کا سینگ بنا رہا تو میں نے اپنے ندیم وہمنشین کو بلا بھیجا اور کہا کہ صاحب غیب کا علم تو خدا کو ہے کسی کے ظاہر و باطن اور رگ پٹھوں کی کسی کو کیا خبر۔ بہرصورت اب آپ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اگر وہ صاحبزادے کہیں دکھائی پڑیں تو انھیں میرا اسلام کہیئے گا اور فرما دیجئے گا کہ کیوں بچّہ! خوب چوٹ دی اور اچھا سوانگ بدلا۔ اور ظاہر میں اپنے کو اصل سے ملا کر ایک بیوی بچّوں والے کو چوٹ دے گئے۔ اور...... اگویا کبوتری کو انڈوں پر سے اٹھالے گئے۔ کیا کیا دعوے عاشق نہ ہونے کے کر گئے تھے انجام کار کیا ہوا۔

یہی صورت اس شعر کے ساتھ ہوئی کہ اس میں تلمیح ہے۔ اُس کا ذکر صرف تم نے اپنی شرح میں کیا ہے ورنہ ساری شرحیں گول ہیں

کوئی دن گر زندگانی اور ہے   اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

صاحب! اس شعر کی شان نزول یہ ہے کہ بڑھاپے میں آدمی یوں ہی چڑچڑا ہو جاتا ہے اور زندگی کے جو گنے چُنے دن رہ جاتے ہیں وہ جوں توں گذارتا ہے اور دوسروں کا دست نگر بن کر رہ جاتا ہے چنانچہ ایک دن میرے یہاں گھر میں بفرعیدی خلیفہ کے لڑکے گھوڑ چڑھائی میں بغیر پوچھے گچھے چلی گئی نہ انھوں نے یخنی تیار کی اور نہ شوربہ چھانا۔ شام کو جب وہ پلٹ کر آئیں اور مجھے ضعف میں پڑا دیکھا تو بولیں

اٹھو گے کر یوں ہی پڑے رہو گے اس پر میں نے اُن سے بگڑ کر اور کانکھ کا نکھ کر کہنا شروع کیا کہ صاحب! سُن لیجئے اگر آپ اسی طرح بے پوچھے گچھے گئیں تو جو اس زندگی کے گنے چنے دن رہ گئے ہیں تو سہی جو شہر میں یا نواح میں کسی مزار پر تکیہ دار بن کر نہ گذار دیے ہوں یا وبیس بدیس کسی ایسی جگہ چلا جاؤں گا کہ تم زندگی میں اپنے کو رانڈ محسوس کرنے پر مجبور رہو گی بس شعر میں اتنی سی بات ہے جو الفاظ ہیں وہی معنی ہیں شاعر اپنا مقصد کیوں بتائے کہ میں کیا کروں گا۔ مبہم کہتا ہے کہ کچھ کروں گا یا شہر یا نواح شہر میں تکیہ دار بنکر زندگی گذار دوں گا۔ ورنہ گھر سے ایسا رفو چکر ہوں گا کہ پھر کسی کو ہوا تک نہ ملے گی۔

میاں! کتابیں چھپوانا لوہے کے چنے چبانے سے کم نہیں۔ میری جو کتاب زندگی میں چھپی وہ بھی خیرات و زکوٰۃ میں۔ میں کتابیں چھپواتا ہی کہاں سے؟ روٹی کھانے کو نہ تھی، شراب پینے کو نہ تھی۔ جاڑے آتے تھے۔ لحاف توشک کی فکر اپنے ہمراہ لاتے تھے۔ کتابیں کیسے چھپواتا منشی امید سنگھ اندور والے دِلّی آئے تھے۔ سابقہ معرفت مجھ سے نہ تھا ایک دوست ان کو میرے گھر لے آیا۔ انھوں نے وہ نسخہ دیکھا چھپوانے کا قصد کیا۔ آگرہ میں میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ تھا۔ اس کو میں نے لکھا اس نے اس اہتمام کو اپنے ذمہ لیا مسودہ بھیجا۔ ۸ آنہ جلد قیمت ٹھہری دو سو جلد پر منشی امید سنگھ نے لے لیں پچاس روپے چھاپے خانے میں بطریق ہنڈوی بھجوا دیئے۔ صاحب مطبع نے بشمول سعی منشی ہرگوپال تفتہ چھاپنا شروع کیا۔ آگرہ کے حکام کو دکھایا۔ اجازت چاہی۔ حکام نے بکمال خوشی اجازت دی۔ ڈھائی سو جلد چھاپی گئیں اُس پچاس جلدوں میں جو میرے حصے میں آئیں وہ نذر دوستاں ہو گئیں میرے نامۂ اعمال میں صفر ہاتھ لگا۔ اب تک ہاتھ جھاڑ منہ پھاڑ بیٹھا ہوں۔ سوائے کفن اور گور کے تختوں کے کچھ نہیں لایا سودہ

بھی قبر میں چھوڑ آیا۔

کیوں صاحب! یہ میاں شمس محسن کاکوری کے پر پوتے "صاحب نور اللغات" کے پوتے یعنی مالک فروغ اردو کو بٹھے بٹھائے یہ کیا سوجھی جو وہ بھی تمھاری منیبت میں میری آبرو ریزی پر اتر آئے جب داور محشر کے روبرو حاضری دوں گا تو دونوں ہاتھ تم دونوں کے گریبانوں میں پھنسالوں گا۔ ایک میاں شمس کے گریبان میں ہوگا کہ وہ اس شرح کے ناشر ہیں دوسرا تمھارے گریبان میں کہ تم اس کے شارح ہو۔ تم نے میاں شمس کا جو قلمی نقشہ کھینچا ہے اُس سے تو وہ آدمی مسلمان معلوم ہوتے ہیں کھچڑی داڑھی صوم وصلوٰۃ کے پابند ماتھے پر عبادت کا گھٹا۔ دیوبندی وضع کا گھٹنا ہر دم سدا الیہ جمبلہ کا نشان بنے کتابوں کے انبار میں گم وودونی چار کہتے ہیں۔ میں نے اُن کی شائع کردہ کتابیں دیکھیں۔ قاعدۂ بغدادی سے لے کر ناچیز کے اُن مکتوبات تک جو منشی دھیش پرشاد نے ترتیب دیے ہیں۔ میں نے جب منشی دھیش پرشاد سے استفسار کیا کہ صاحب! یہ آپ میرے مکتوبات کے کتنے نسخے دنیاوالوں میں بانٹ آئے تھے کہ جو آتا ہے انھیں کا ذکر زبان پر لاتا ہے اس پر وہ بتاتے تھے کہ صاحب میں نے تو آنجناب پہ نہلا ہی لگایا تھا فروغ اردو نے میری ذات پر دہلا رسید کیا اور ہزاروں کی تعداد میں اسے چھاپ لیا۔ وہ تو حضور کے پرانے قدر دانوں میں ہیں آج کل ہندوستان اور پاکستان کے تمام ادبا اور تنقید نگاروں کے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کیے بیٹھے ہیں۔ اس دور میں داڑھی رکھ کر حساب کے صاف کردار میں براق انھیں کو دیکھا۔ دوکان پر ادیبوں کے جمگھٹے رہتے ہیں کاتب کی لکھی ہوئی کاپیوں کی تصحیح تو وہ نہیں کراتے مگر کتاب میں غلط نامہ چھاپ کر

اُس کا حجم بڑھاتے ہیں اور جب مصنفین آنکھیں دکھاتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ ملاحظہ ہو غلط نامہ اور یاد کرو ہجے اور معنی۔ کاغذ کے کھُردرے پن پہ نہ جائیے۔ لکھائی چھپائی کی کمزوری پہ نگاہ نہ دوڑائیے۔ یہ دیکھئے کہ ماشاء اللہ کتاب کا حجم کیسا جوکھا ہے۔

اِن صاحب، خیر ہو روی کو نہ بھولیے انھوں نے بھی ادب پر بڑے کرم کئے ہیں۔ ان کا بھی شکریہ ادا کیجئے اور صاحب لگے ہاتھوں میاں عبدالرحمن چغتائی کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ انھوں نے میری عالمِ برزخ کی ایک خیالی تصویر بنائی ہے اب جو اسے اپنے سے ملاتا ہوں تو ہو بہو یہاں جس حال میں ہوں ویسی پاتا ہوں۔ اب جن و ٹی وی والوں نے مجھے جوانی میں دیکھا ہے وہ اگر خود میرا شعر پڑھ کر کہیں کہ

مر رہے ہیں خوب رویوں پر اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

تو کیسی رہے۔

لو صاحب! میرے کھانے کا وقت آیا۔ آدھی چپاتی شوربہ میں ڈال کر کھاؤں گا اور بستر رہ تو لے یخنی چڑھا کر پڑھ رہوں گا۔ مقدمہ سپردِ ڈاک کرتا ہوں۔ رسید کا انتظار رہے گا۔

نجات کا طالب
اسد اللہ خاں غالب

ردیف الف

غزل نمبرا

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

مشکل الفاظ :۔ نقش ؍ تصویر ۔ تحریر ؍ مصوری ۔ پیکر ؍ جسم ۔ کاغذی پیرہن : فریادیوں کا لباس ۔ ناپائندہ پیرہن ۔

معنے ۔ اس شعر میں تلمیح ہے ۔ مرزا صاحب ایک دن کسی مشاعرہ میں شریک تھے جس میں مرد، عورتیں اور بچے سب ہی مرزا صاحب کا کلام سننے آئے ہوئے تھے مرزا صاحب اپنا کلام سنانے جا ہی رہے تھے کہ ایک محترمہ کے بچے نے جسے چھوڑ کر وہ کسی خاص ضرورت سے باہر گئی ہوئی تھیں رونا شروع کر دیا اور اپنی فلک شگاف چیخوں سے زمین و آسمان سر پر اٹھا لیا ۔ اتنے میں اسٹیج سے مرزا صاحب کا نام پکارا گیا ۔ مرزا صاحب جو اپنے دور کے ایک ممتاز اور بلند پایہ شاعر تھے اُس لڑکے کی چیخ پکار سے ان کی طبیعت موزوں ہو گئی اور انھوں نے روتے ہوئے بچے کو دونوں بازوؤں سے لٹکا کر مشاعرہ والوں کے سامنے یہ مصرع پڑھا ۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا[1]

---

[1] بعد میں معلوم ہوا کہ یہ لطیفہ مجاز مرحوم سے منسوب ہے اس لیے ان کی روح سے معذرت کے ساتھ درج کیا جاتا ہے ۔ اس کے معنی اور مطالب کے سلسلہ میں وہ عالم برزخ میں مرزا صاحب سے بحث کریں گے راقم الحروف مرزا صاحب اور مجاز دونوں کے حق میں اپنے مطلب سے دست بردار ہو تا ہے ۔

اس کے بعد گھر آکر جب انھوں نے مصرعۂ ثانی کہہ کر شعر مکمل کیا تو اس میں ایک معنویت پیدا ہو گئی اور ایک مولوی صاحب نے جب یہ شعر سنا تو اس کے معنے یہ بتائے کہ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں وہ سب بڑے میاں (اللہ میاں) کی مصوری کا ایک نمونہ ہیں اور یہ نقش و نگار جب تک ان کے ذہن میں محفوظ ہے اور انھوں نے کاغذی لباس نہیں پہنا تھا ہر شخص ان کی دل کشی سے محروم تھا اور اس کی اصل بڑے میاں کے پاس محفوظ تھی۔ اور اب چونکہ وہ نقوش بڑے میاں کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں اور ان سے دوری پیدا ہو گئی اس لیے وہ نقش و نگار یعنی بنی آدم آلام و مصائب میں مبتلا ہے۔

آگہی، دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

مشکل الفاظ۔ آگہی: عقل، سمجھ۔ دام شنیدن: سامعہ۔ عالم: حال۔ تقریر: کلام

یہ شعر مرزا صاحب نے اس زمانہ میں کہا تھا جس زمانہ میں وہ اپنے دوستوں سے حد درجہ بیزار اور متنفر تھے کیونکہ مرزا صاحب کی مشکل پسندی کے سبب لوگ ان کو مہمل گو سمجھنے لگے تھے۔ دوسری طرف مرزا صاحب اُن دوستوں اور اعتراض کرنے والوں کو سقیم العقل سمجھتے تھے اس کے بعد جب مرزا صاحب آسان شعر کہنے لگے تو اُن کے دوست اُن کو مبارک باد دینے حاضر ہوئے۔ مرزا صاحب تو غصّے میں بھرے بیٹھے ہی تھے ان کو دیکھتے ہی ...... اپنے آپے سے باہر ہو کر بولے۔ سنئے صاحب میں مغل بچہ اور بات کا سچا ہوں میرا ظاہر اور باطن ایک ہے جو بات دل میں وہی بات منہ پر اگر آپ لوگوں کی عقل میرے اشعار سمجھنے سے قاصر ہے تو بجائے مجھے مہمل گو قرار دینے کے اپنی عقل و خرد پر ماتم کیجئے۔ اور میرا شعر پڑھنے کے بعد سب سے پہلے آپ اپنی عقل سے کہئے کہ وہ بازار جا کر مبلغ ایک عدد دام شنیدن خرید لائے اس کے بعد اسے بچھائیے اور اس پر دانا بکھیر کر چلائے "آ و بیٹا آ و"

تب کہیں عنقائے معانی اُس پر اترے گا ورنہ اُس کا پکڑنا یعنی میرے اشعار سمجھنا کوئی آسان کام نہیں مطلب یہ ہے کہ شعر فہمی علم دریاؤ ہے اور صرف وہی لوگ میرے اشعار کا مطلب سمجھ سکتے ہیں جن کی فکر چڑیمار وں جیسی ہو جو اڑتی چڑیا کو پہچانتے ہوں ۔

غزل ۲

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ   جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

مشکل الفاظ کے معنی ۔ خواب = غفلت ۔ سود و زیاں = جنت و دوزخ یا نفع و نقصان ۔

اس شعر میں تجھ سے مراد روزمرہ کا خرچ ہے ۔

یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں کہ مرزا صاحب مفلسین زمرہ میں سے تھے اس لیے رات دن اس چکر میں مبتلا رہتے کہ کہاں سے (بقول دلّی والوں کے) "نادا" آئے اور گھر کا خرچ چلے چنانچہ ایک دن جب اسی چکّر میں پڑے پڑے سو گئے تو خواب میں دیکھا کہ کچھ لوگوں کو قتل کے مقدمہ میں ایک جھوٹے گواہ کی ضرورت ہے اور اس سلسلہ میں وہ خاص رقم دینے پر آمادہ ہیں ۔ مرزا صاحب سوچے کہ جہاں ستیاناس وہاں ساڑھے ستیاناس، جہاں شراب خواری کرتے ہو اور جوا کھیلتے ہو وہاں ایک گناہ یہ بھی سہی ۔ بہرحال جھوٹی گواہی میں کچھ تو رقم ہاتھ آئے گی اور اس سے تھوڑا بہت قرض ہی ادا ہو جائے گا ۔ معاملہ کرنے والے دو ہزار روپئے دے رہے تھے مگر یہ سوچے کہ اس وقت گردن پھنسی ہے جو بھی مانگو گے دے مریں گے ۔ چنانچہ انھوں نے کہا کہ جھوٹی گواہی کے پانچ ہزار سے کم نہ لونگا اس پر ایک نے کہا کہ اچھا مرزا صاحب ! نہ آپ کے پانچ ہزار اور نہ ہمارے دو ہزار تین ہزار پر توڑ کیجیے مگر یہ کسی طرح راضی نہ ہوئے اور فرمانے لگے کہ قبلہ ! قول مرداں جان دارد ۔ جو زبان سے نکل گیا ، نکل گیا ۔ ایک چھدام کم نہ ہوگا ۔ غرض ایک طرف

ارفی اور دوسری طرف لنترانی کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک دم مرزا صاحب کی آنکھ کھل گئی اور اُنھوں نے دیکھا کہ حسب دستور قدیم چارپائی پر پڑے ہیں یہ دیکھ کر جلدی سے ایک ہاتھ سے دونوں آنکھیں بند کرلیں اور دوسرا ہاتھ بڑھا کر بولے کہ اچھا صاحب! دو ہی ہزار دلوا دیجئے مگر اب آنکھ کھل جانے پر نفع ونقصان کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہا تھا اسی لیے دوسرے مصرع میں آنکھ کھل جانے والی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا۔

غزل نمبر ۳

شور پند ناصح نے، زخم پر نمک چھڑکا آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا
(شوربائے)

مشکل الفاظ کے معنی۔ پند = نصیحت۔ ناصح۔ نصیحت کرنے والا۔

یہ شعر شاید کیا یقینی غلط چھپ گیا ہے شور پند کی جگہ "شوربہ" ہے۔

مطلب صاف ہے۔ مرزا صاحب کے ایک دفعہ معمولی سا دانہ نکل آیا جس نے بڑھتے بڑھتے اچھے خاصے زخم کی شکل اختیار کرلی۔ ایک دن وہ کھانا کھانے جارہے تھے کہ کچھ ناصح صاحبان پہنچ گئے۔ مرزا صاحب کا قاعدہ تھا کہ کھانا کھانے کے بعد شوربہ پیتے تھے جس کا پیالہ علیحدہ رکھا رہتا تھا۔ جب مرزا صاحب کھانا کھا چکے تو مرزا صاحب نے ان میں سے ایک مولوی صاحب سے۔ جو ایک مونڈھے پر بیٹھے تھے کہا کہ حضرت! تکلیف تو ہوگی ایک ذرا شوربہ کا پیالہ اٹھا دیجئے۔ مولوی صاحب سے شوربے کا پیالہ چھلک گیا اور سارا کا سارا شوربہ مرزا صاحب کے اُس مقام پر گرا جہاں پر زخم تھا۔ مرزا تلملا اٹھے۔ مولوی صاحب نے معذرت کی آدمی چونکہ بامروت تھے لہٰذا اُس وقت تو کچھ نہیں بولے۔ البتہ مولوی صاحبان کے چلے جانے کے بعد

اور ان کی نصیحتوں کا شور و غوغا ختم ہونے کے بعد بیوی سے کہنے لگے کہ دیکھو اول تو شرابیوں کبابیوں کا اپنے شور و غل سے وقت ضائع کرتے ہیں اور ان کے جذبات پر نمک چھڑکتے ہیں اور پھر یہ دیکھو چیختے چلاتے شوربہ کا گرم گرم پیالہ زخم پر چھڑک گئے جس میں نمک بھی کم تھا اب بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ آپ کو اس سے کیا فائدہ ہوا اور کون سا آپ کے منہ کا ذائقہ بدل گیا۔

غزل نمبر ۴

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

مشکل الفاظ کے معنی ۔ وصل = ملاقات ۔ ذوق ۔ خواہش ۔

مرزا صاحب جوانی میں نہایت ہی دل پھینک اور منچلے واقع ہوئے تھے نہ جانے کون کون سے کشتے اور گرم گرم دوائیں کھائی تھیں کہ ہر وقت دل میں ایک آگ سی لگی رہتی تھی۔ ایک دن ایسا ہوا کہ دل نے جس میں آرزوؤں اور تمناؤں کے پلنگ اور مسہریاں بچھا رکھی تھیں اور مسہریاں پر ذوقِ وصل کی چادریں بچھی ہوئی تھیں انھوں نے آگ پکڑ لی اور سارے کا سارا اثاثہ جل کر خاکستر ہو گیا اب جو یہ چیزیں جلیں تو یادِ یار جو ایک آتش گیر مادہ تھا وہ بھی نذر آتش ہو گیا اور آخر میں اللہ ہو اللہ ہو کے سوا کچھ نہ رہا اور فنا فی الذات ہو کر رہ گئے ۔

غزل نمبر ۵

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

مشکل الفاظ کے معنے ۔ مائدہ = دسترخوان ۔ بقدرِ لب و دندان = تھوڑا سا یا ان کے ہر قسم کے حوصلے کے مطابق مرزا صاحب جہاں شراب کے بے حد دلدادہ تھے وہاں کھانے پینے کے بھی بڑے شوقین تھے ان کے دسترخوان پہ ہر قسم کی بڑھیا اور لذیذ غذائیں ہوا کرتی تھیں یہی حال ان کے دل کا تھا جہاں نہایت لطیف آرزوؤں اور تمناؤں کا نوے فی

ڈنر دل کی میز پر چھایا رہتا تھا۔ حالت یہ تھی کہ اگر کسی پلیٹ میں بھنی ہوئی آرزوئیں ہیں تو کسی میں وصل محبوب کی مسلّم رانیں۔ اس دسترخوان پر مرزا صاحب کے ہم مشرب اور ہم عمر دوست و احباب بھی ہوتے جن میں بہتوں کے پیرانہ سالی کے سبب دانت گر گئے تھے اس شعر میں دوستوں کے دانت نہ ہونے کا ماتم کیا ہے۔ "کام یاروں کا بقدر لبِ دنداں نکلا" یعنی وہ ان غذاؤں سے پورے طور پر لطف اندوز نہ ہو سکے۔

غزل نمبر ۶

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

مشکل الفاظ کے معنی۔ وفا: عشق۔ مجموعۂ خیال: تمام فنون سے متعلق جو کتابیں اس وقت موجود ہیں وہ بیک وقت مرتب نہیں ہوئیں اور نہ کسی ایک مفکر کی فکر کا نتیجہ ہیں۔ جو خیال فرد فرد تھے ہزاروں سال بعد اب مرتب ہوتے ہیں۔ نسخہ ہائے وفا سے مراد اشعار۔

یہ تو آپ سب ہی لوگوں کو معلوم ہے کہ مرزا صاحب شاعر بھی تھے اور حکیم بھی مگر آخر میں جب قویٰ مضمحل ہو گئے تو "اتراشحنہ مردک نام" کے مصداق انھوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ طبابت کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ مقصد یہ کہ زندگی چونکہ رندی اور شوقینی میں گذری تھی اور ساری عمر حکیموں کے نسخے استعمال کرنے میں بسر ہوئی تھی اس لیے مرزا صاحب اپنے فرصت کے اوقات میں بیکار مباش کچھ کیا کر کے اصول کے تحت اپنے تمام استعمال شدہ نسخوں کی گڈیوں کو ادھر سے اُدھر ترتیب دے کر وقت گذاری کرتے تھے چونکہ یہ تمام نسخے مختلف حکیموں اور طبیبوں کی فکر کا نتیجہ تھے اور اُن میں سے ایک ہی مرض کے بارے میں مختلف طبیبوں کی مختلف تشخیص درج تھیں اس

لیے وہ چاہتے تھے کہ اُن سب کو اس طرح ترتیب دے دیا جائے کہ آئندہ نسلیں اُن سے فائدہ اٹھا سکیں۔ دراصل یہ بڑی محنت کا کام تھا جو مرزا صاحب نے انجام دیا۔ اسی لیے مصرع ثانی میں فرماتے ہیں کہ مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا یعنی جن بیاضوں نے نسخے لکھے تھے وہ منتشر حالت میں اِدھر اُدھر پڑے تھے اور ان میں ترتیب مفقود تھی افسوس کہ اُن کے ترتیب دیے ہوئے نسخوں کا وہ مجموعہ ان کے مرنے کے بعد تلف ہو گیا ورنہ اُن طلباء کو بڑی آسانی ہوتی جو غالب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی مقالے لکھتے ہیں۔

غزل نمبر ۲

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا   عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

مرزا صاحب سے اور عشق سے زندگی بھر دنگل رہا اور مرزا صاحب عمر بھر عشق کو محبت کے اکھاڑے میں دو ہاتھ دکھاتے رہے۔ چنانچہ اس شعر میں مرزا صاحب اپنے دونوں پٹھوں پر ہاتھ مار کر کہتے ہیں کہ جناب عشق صاحب کی ساری ڈینگیں اور شیخیاں خاک میں مل کر رہ گئیں۔ وہ اپنی جگہ بڑے بھاری رستم ہند بنتے تھے اور جس کو پاتے تھے دے مارتے تھے۔ چنانچہ آخر میں جب ان کا مرزا صاحب سے سابقہ پڑا تو ان کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا ورنہ عشق صاحب کا عالم یہ تھا کہ اُن کے ہاتھ پیر دیکھ کر ہی ایرے غیرے اور نتھو خیرے دہشت میں آ جاتے تھے اور ان کا دم نکل جاتا تھا مگر جب مرزا صاحب جیسے کڑی ہڈی والوں سے اُن کا سابقہ پڑا تو اُن کے ہوش و حواس باختہ ہو گئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ ہم جیسے رستموں ہی کا دل گردہ ہے کہ اُس سے مقابلہ کرتے ہیں اور وہ بھی آدمی ذرا وضع دار ہے کہ اگرچہ جیت

ہوجاتا ہے مگر ہم ہی جیسے مردوں کو طلب کرتا ہے۔

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا — اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

قاعدہ یہ ہے کہ آدمی کے مرنے کے بعد اس کا رنگ اڑجاتا ہے مرزا صاحب اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میرا زندگی ہی میں مردوں سے بدتر حال تھا یعنی موت کا بسنت منانے سے پہلے میں نے بسنتی کپڑے پہن رکھے تھے اصل میں مرزا صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ چونکہ زندگی بھر موت کا کھٹکا لگا ہوا تھا اس لیے میں نے پہلے سے اپنی شکل پورے طور پر مردوں جیسی بنا رکھی تھی اور اب موت کے آنے سے پہلے میں نے کفن دفن خرید کر اور اُسے زیب تن کر لیا تھا تاکہ اس وقت کوئی فوری زحمت پیش نہ آئے۔

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے — حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

مرزا صاحب زندگی بھر بے سروساماں رہے یہاں تک کہ تکلیفیں اٹھاتے اٹھاتے اُن کا انتقال ہو گیا ظاہر ہے کہ انتقال ہونے کے بعد تجہیز و تکفین کا سوال پیدا ہوتا ہے مرزا صاحب آدمی چونکہ نہایت رنگین تھے لہٰذا انھیں اپنے مرنے کے بعد کی چنداں فکر نہ تھی اور یہ جانتے تھے کہ ایسا تو ناممکن ہے کہ تجہیز و تکفین کی کوئی صورت نہ پیدا ہو کوئی نہ کوئی انتظام تو غیر سرکاری طریقے پر نہ سہی سرکاری ہی طریقے پر ہو ہی جائے گی اس طرح گویا درویش کی موت سے اپنی موت کو ملا دیں گے۔ مغفرت کے لیے درویشی سے زیادہ اور کیا چاہیئے۔ لہٰذا مرنے کے بعد دعا کرتے ہیں کہ اے خدا اسد اللہ خاں اسد کو بخشش دے اس لیے کہ وہ لائق بخشش تھا جس وقت کہ مرا ہے۔

غزل نمبر ۷

مبارک باد اسدؔ غمخوارِ جانِ درد مند آیا ۔۔۔ جراحت، تحفہ، الماس، ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ

مشکل الفاظ کے معنے۔ الماس = ہیرا۔ ایک بیش قیمت تلوار کو بھی کہتے ہیں۔ تحفہ، ارمغان اور ہدیہ سب کے معنے۔ انعام کے ہیں۔ اس شعر میں مرزا صاحب نے ایک دن کا واقعہ بیان کیا ہے کہ وہ ایک مرتبہ اپنی ڈومنی کے انتظار میں بیٹھے ہر آنے جانے والے پر مسمریزم کی مشق کر رہے تھے کہ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ وہ لدی پھندی چلی آ رہی ہیں۔ آگے آگے خود ہیں اور ان کے پیچھے ایک جھلی والے کے سر پہ تحفے تحائف کا ایک انبار چلا آ رہا ہے ان کو ڈومنی ہی کے آنے کی کیا کم خوشی تھی کہ جھوا بھر تحفے تحائف دیکھ کر مارے خوشی کے گل گل ہو گئے۔ جب جھوا اتار آگیا، تو اس میں بیسوں طرح کا سامان تھا۔ کچھ جراحتیں تھیں، کچھ جبہ کے لگانے والی قیمتی تلواریں تھیں۔ کچھ قلمتراش تھے اور کچھ جگر کے داغ تھے چنانچہ ان ساری چیزوں کو دیکھ کر مرزا صاحب نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو مبارک باد دینا شروع کی کہ لو صاحب! غمخوارِ جانِ درد مند یعنی ڈومنی تو آئی ہی تھی مگر اپنے ساتھ کیا کیا تحفے لائی ہے کہ زندگی بھر یاد رہیں گے۔

غزل نمبر ۸

وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا ۔۔۔ میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں

اندوہِ وفا = وفاداری میں جن تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مرنا ایک اختیاری فعل ہے۔ مرد کو غصہ آیا اور اُس نے کرمتا کھا کر جان دیدی یا کسی برگد در گد کے پیڑ میں پھانسی لگا کر لٹک لیا یا پھر

قطب مینار پر چڑھ کر پھاند لیا یہی حال عورت کا ہے کہ اگر عورت پر عشق کا بھوت سوار ہوا تو اسنے یا تو اپنے جسم پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگالی یا چوہیاں میں کر پی لیں ورنہ انشاءاللہ غفیل ہوگئی۔ غالب کا معاملہ کچھ ایسا تھا کہ یہ مرنا بھی چاہتے تھے اور نہیں بھی چاہتے تھے اور عشق میں جینے کے بہانے ڈھونڈ رہے تھے چنانچہ جوئندہ یابندہ۔ سوچتے سوچتے ایک ترکیب سمجھ میں آئی جس سے ان کو ایک مسلم الثبوت عاشق بھی مان لیا گیا۔ اور ان کی جان بھی بچ گئی۔ ایک دن لیٹے لیٹے سوچتے رہے کہ آخر کب تک عشق کی دُگن دریائے حسن و محبت میں ڈوبے پڑے رہو گے یا اس پار یا اُس پار یا تو محبوب آئے ورنہ سہ حیف ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں۔ چنانچہ یہ طے کر کے چلے کہ خواہ مسماۃ پر قتل کا سنگین سے سنگین مقدمہ کیوں نہ چل جائے ہم اب جان دے کر رہیں گے اور اُٹھ کر قطب مینار پر سے پھاند نے رہے تھے کہ رستہ میں خیال آیا کہ یار یہ تو کوئی بات ہی نہ ہوئی یعنی چڑیا اپنی جان سے گئی مگر کھانے والے کو مزہ نہیں ملا۔ لہٰذا آپ نے محبوبہ کے نام ایک عدد خط لکھا جس میں بحضور فیض گنجور کے بعد عرض کی کہ آپکے تغافل سے تنگ آکر اب ہم مرنے کا فیصلہ کئے قطب مینار پر سے پھاندنے جا رہے ہیں، مگر چونکہ تابعدار زندگی بھر حضور کا عاشق صادق رہا ہے لہٰذا اب جدائی برداشت سے باہر ہے اور مرنے کی اجازت دی جائے۔ میں قطب مینار کے نیچے بیٹھا جواب کا منتظر ہوں چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد جواب آیا کہ آپ اور جو چاہیں کریں مگر مرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ چنانچہ دوسرے مصرع میں محبوب کی عدم رضامندی کا تذکرہ کیا ہے کہ:-

وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

گوشِ منت کشِ گلبانگ تسلی نہ ہوا ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی

مشکل الفاظ کے معنی۔ گوش = کان۔ منت کش = احسانمند۔ گلبانگ = خوشخبری۔

غالب کا یہ شعر اس واقعہ کے مصداق ہے کہ ایک صاحب اپنے ملازم کو جھکا جھکا کر تنخواہ دیتے تھے جس سے ملازم حد درجہ بیزار تھا۔ مگر بزدل اتنا بڑا کہ کبھی آقا سے دو بدو شکایت کی ہمت نہیں ہوتی تھی مگر بیٹھ پیچھے اس طرح بگڑتا کہ اگر آقا تنہا مل جائے تو کچا چبا لے۔ اس واقعہ کی اطلاع جب ان حضرت کے آقائے نامدار کو ہوئی تو وہ بے حد ناراض ہوا اور اس نے ان حضرت کو بلا بھیجا۔ آپ نہایت جلے بھنے انداز میں بھیگی بلی بنے پہنچے۔ آقا نے صورت دیکھتے ہی کہا۔ کیوں بے؟ یہ تو میرے بیٹھ پیچھے کیا کیا بکا کرتا ہے؟ یہ حضرت ہاتھ جوڑ کر بولے۔ حضور! تنخواہ بہت کم ہے اور وہ بھی وقت سے نہیں ملتی اور کام بھی بہت زیادہ ہے۔ آقا نے جھلا کر اور آپے سے باہر ہو کر کہا تنخواہ جس طرح پر ملتی ہے اسی طرح ملے گی اور کام بھی اتنا ہی کرنا پڑے گا۔ کوئی کمی نہ ہوگی۔ اس پر یہ حضرت سر جھکا کر بولے۔ حضور یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ ایسی بے انصافی آجتک کسی کے ساتھ نہیں ہوئی ورنہ؟ اس ورنہ کے لفظ پر آقائے نامدار نے بالکل آپے سے باہر ہو کر کرخت لہجے میں کہا۔ کیا کہا ہے؟ ورنہ کیا۔ ؟ بتا ورنہ تو کیا کرے گا؟ مردود، بدتمیز گستاخ۔ بتا ورنہ کیا؟ ملازم صاحب بولے۔ ورنہ پھر اسی تنخواہ پر کام کروں گا۔

غالب کے اس شعر کا مفہوم بھی کچھ اسی قسم کا ہے یعنی یہ کہ مساۃ کی طرف سے کوئی وعدہ وعید بھی نہیں ہے۔ پھر بھی آپ اُن پر جان دیے ہوتے ہیں۔ گویا بے تنخواہ کے ملازم ہیں۔ چنانچہ جب لوگوں نے مرزا صاحب کو سمجھایا کہ حضور! یہ آپ

کیا محبت کے جھمیلے میں پڑے ہوئے ہیں کوئی دوسرا کام کیجیے یا کسی یادِ خدا محبوبہ کا در دیکھئے۔ یا اس پر مرزا صاحب نے بھی وہی وضعداری بات کہی کہ ارے بھائی وعدہ وعید نہ سہی یہی کیا کم فائدہ ہے کہ ایک دھندے سے لگے ہوئے ہیں۔ گویا تنخواہ نہ سہی بر سرِ کار تو ہیں لوگ بے روزگار تو نہ کہیں گے یعنی محبوب کے وعدہ وصل یا ملاقات نہ کرنے پر بھی آپ اپنی جگہ مطمئن ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ بھائی یہی کیا کم فائدہ ہے کہ ہمارے کان کسی خوش خبری کے احسانمند تو نہیں ہیں۔ گویا ناک ٹوٹی تو ٹوٹی مکھیوں کے عذاب سے تو چھوٹی۔ محبوب کے احسان ہی سے بچے ہوئے ہیں یہی کیا کم خوش نصیبی ہے

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

مشکل الفاظ کے معنے۔ دمِ عیسیٰ۔ یہ اعجاز مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پھونک ڈالنے سے مردہ زندہ ہو جاتا تھا۔

مرزا صاحب عشق میں گھلتے گھلتے کچا لو کا تنکا ہو کر رہ گئے ہیں اور ضعیفی کا یہ عالم ہے کہ پھونک دو تو اڑ جائیں۔ اسی حالت میں وہ اپنے محبوب کے بنگلے پر پہنچتے ہیں برآمدہ میں تند تو کی چاپ سن کر اندر سے محبوب نے ڈانٹ کر پوچھا کون؟ اور یہ وہیں ڈھیر ہو جاتے ہیں حالانکہ اُن ہی کے خاطر زندہ تھے اور محبوب کو مسیحا سمجھے بیٹھے ہوئے تھے انھیں اپنی وفاؤں کے بل بوتے پہ اُمید تھی کہ محبوب کے لبوں کی حرکت طاقت کے انجکشن کا کام کرے گی اور ان کی ساری کمزوری دور ہو جائے گی اس "کون" کا لفظ سننا تھا کہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اور بجائے اور جنبشِ لب سے بندہ بست ہونے کے انتقال فر گئے۔

غزل نمبر

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

مشکل الفاظ کے معنی ۔ سروِ چراغاں یہ ایک قسم کے مصنوعی درخت کو کہتے ہیں جو سرِ غنا بنایا جاتا ہے اور شادی بیاہ کے موقعوں پر اُسے روشن کرتے ہیں ۔

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اگر زمانے نے اجازت دی اور پیسے سے کبھی فراغت نصیب ہوئی تو میں دنیا والوں کو ایک اچھا بھلا سرکس کا تماشہ دکھاؤں گا چونکہ میرے سارے جسم میں عشق کی کرنٹ دوڑ رہی ہے اس لیئے اس کرنٹ سے بجلی لے کر اُس کے تار اپنے دل کے داغوں سے بلا کر سوئچ آن کردوں گا پھر دیکھئے گا کہ کتنے سروِ چراغاں روشن ہو جاتے ہیں ۔ اِس شعر میں تخم سے مراد بلب (قمقمے) ہے مقصد یہ ہے کہ ایسے ایسے بڑھیا اشعار کے بلب روشن کردوں گا کہ پڑھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ جائیں گی ۔

ہنوز اک پرتو نقشِ خیالِ یار باقی ہے ‏ ‏ ‏ دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

مشکل الفاظ کے معنے ۔ پرتو = سایہ تک ۔

مرزا صاحب کا دل آتش عشق نے پگھلتے پگھلتے ایک اچھی بھلی کوٹھری بنکر رہ گیا تھا ۔ اور حضرت یوسف جس کال کوٹھری میں قید تھے وہ اُسی کے لگ بھگ معلوم ہونے لگا تھا ۔ روشنی بھی دونوں جگہ برابر کی تھی وہاں یوسف کے نورِ جہاں کی روشنی تھی اور ان کے دل کی کوٹھری میں یار کے تصور کا بلب ٹمٹما رہا تھا ۔ مقصد یہ کہ ایسے ہوا کی تاریکی میں بھی اپنے محبوب کے تصور کا بلب آن کئے لیٹے رہتے تھے ۔

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا ‏ ‏ ‏ قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

مشکل الفاظ ۔ لہو پانی ہونا = لہو بہنا یا قتل ہونا ۔ قیامت ہے = غضب ہے ۔ سرشک آلودہ ہونا = آبدیدہ ہونا ۔ غالب کی محبوبہ کا معاملہ کچھ ایسا تھا کہ مرزا صاحب اپنی جگہ پر

کے عشق کے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کئے تھے درانحالیکہ اُن کے علم میں یہ بھی تھا کہ جن پر وہ عاشق ہیں اُن پر جان دینے والوں کا ایک جم غفیر ہے۔ ان عاشقان بلت کا یہ عالم تھا کہ جہاں اُنھوں نے اِن محترمہ کو ذرا افسردہ دیکھا اپنی اپنی جگہ پر رینگنا شروع کر دیا۔ اور زمین پر لوٹنیں مارنے لگے۔ ایک دن اِن ہی محترمہ کے ماں باپ میں سے کسی نے نہ جانے کس بات پر ان کو ڈانٹا ڈپٹا تو ان کے آنسو آ گئے۔ مرزا صاحب نے جب اُن کی آنسو بھری آنکھوں کو دیکھا تو فرمانے لگے کہ بخدا تمھاری اشک آلود نگاہوں کو دیکھا نہیں جاتا اور ایک ہم ہی پر کیا موقوف ہے تمھارے درجنوں عاشقوں کو اگر تمھارے رونے دھونے کا حال معلوم ہوا تو وہ تمھارے والدین کی اِس حرکت کو سُن کر مارے غصّے کے آگ پر لوٹنا شروع کریں گے واللہ کیا غضب ہے ارے صاحب اِس کا کبھی خیال نہیں کیا کہ صاحبزادی کی ہرنی سے زیادہ بڑی بڑی آنکھوں میں اگر آنسو آ گئے تو اُس کے ڈھائی درجن عشّاق کے دلوں پر کیا گذرے گی۔

غزل نمبر۱

نہ ہوگا ایک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا

مشکل الفاظ: یک بیابان ماندگی = اس قدر تھکن جو ایک جنگل میں ٹہلنے ٹہلنے سے پیدا ہو۔ حباب = بلبلا

جس کے پاؤں میں سنیچر ہوتا ہے اس کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ دن رات وہ آوارہ گردی میں زندگی گزار دیتا ہے۔ اور گھومنے پھرنے سے اُس کا دل نہیں بھرتا۔ مرزا صاحب کا بھی یہی حال تھا کہ ان کے دل میں عشق کی آگ ہر وقت

سُلگا کرتی تھی اور وہ محبوب کے تصور میں خیالی گھوڑے دوڑایا کرتے تھے اور تھکنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ جس طرح دریا میں مسلسل لہریں اُٹھتی رہتی ہیں۔ اور بلبلے نمودار ہوتے رہتے ہیں اُسی طرح مرزا صاحب کہتے ہیں کہ بیابانوں اور صحراؤں میں میرے قدم اٹھا بیٹھی کیا کرتے تھے اور تھکنے کا نام نہ لیتے تھے۔ بلبلوں کو نقش سے تشبیہ دی گئی ہے اور رفتار کو موج سے اس کے معنے یہ ہوئے کہ مرزا صاحب ننانوے ۹۹ میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلتے رہتے تھے۔

غزل نمبر ۱۱

سراپا رہنِ عشق و ناگزیر الفت ہستی　　　عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

مشکل الفاظ۔ رہنِ عشق = عشق کا بندہ ہونا۔ ناگزیر = جس سے بچ نہ سکیں مجبور برق = بجلی یہاں مراد عشق سے ہے۔

مرزا صاحب اس شعر میں اپنے آپ کو دو گھوڑوں پر سوار بتاتے ہیں یعنی ایک طرف تو عشق کے بندے ہیں اور دوسری طرف اپنی ہستی یعنی زندگی سے بھی محبت کرتے ہیں۔ گویا بکار خویش ہشیار ہیں۔ حالانکہ عشق اور ہستی دو متضاد چیزیں ہیں ایک طرف تو مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ؎

جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

اور دوسری طرف اپنی ہستی بھی عزیز ہے گویا مرزا صاحب اپنی سواری میں سیاہ اور سفید دونوں گھوڑے جوتے ہوئے ہیں۔

ارے صاحب! یا تو عشق فرمایئے یا پھر زندگی سے ہاتھ دھویئے۔ کیونکہ عشق کا کام تو ہستی کو مٹانا ہے۔ مگر آپ کو ہستی بھی عزیز ہے۔ آپ کی مثال تو

اُس کسان کی سی ہے جو برق کی پرستش بھی کرتا ہے جو کھیتی کو خاکستر کر دیتی ہے اور خرمن یعنی ہستی کے جلنے کا افسوس بھی کرتا ہے۔ گیا اردب میں گوٹ پھنسی ہے: جائے ماندن نہ پائے رفتن۔

غزل نمبر ۱۲

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے   یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا

مشکل الفاظ۔ رنگ شکستہ: بحالت غصہ سر گردن اور ہاتھ پاؤں کا حرکت کرنا غصہ کی حالت کو کہتے ہیں۔ شکستن کے معنی تند شدن کے ہیں اور غصہ کے عالم میں آپ جانتے ہیں کہ انسان بالکل بے قابو ہو کر عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتا ہے اور نئے نئے کرتب دکھاتا ہے۔

مرزا صاحب کا معاملہ کچھ ایسا تھا کہ جن صاحبہ سے آپ کو محبت تھی وہ حد درجہ بدمزاج تھیں اور غصے کے عالم میں ان کا سر گردن، چشم وابرو قابو میں نہیں رہتے تھے اور مرزا صاحب چونکہ ایک دشوار پسند طبیعت لے کر آئے تھے اس لیے اُن کو اُن کی یہی ادا پسند تھی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ محترمہ جب آپے سے باہر ہوتیں تو ان کی زبان بھی قینچی کی طرح چلتی تھی۔ یہ چیز اور سونے میں سہاگا تھی۔ اس شعر میں مرزا صاحب انھیں کا ذکر خیر فرماتے ہوئے کہتے ہیں دیکھو کس طرح اپنی ایک جھپک دکھاتی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ مجھے تو اس وقت صبح بہاراں کا مزا آتا ہے جب وہ جھاڑو پنجہ لے کر میرے اوپر مسلط ہو جاتی ہیں۔ اُس حالت میں ان کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے ہیں۔ مُنہ سے جھاگ بہنے لگتا ہے وہ اپنے جھوٹے مارے غصہ کے نوچنے لگتی ہیں اور دانت پیس پیس کر میری طرف جھپٹتی ہیں اور اس طرح ان کی بھرپور ادائیں ظہور میں آتی ہیں۔

غزل نمبر ۱۳

ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال   خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

مشکل الفاظ۔ خلد = جنت ۔ گور = قبر۔

مرزا صاحب نے کہیں سن پایا تھا کہ آدمی جس خیال میں مرتا ہے قبر میں ویسا ہی سلوک اُس کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر مرتے وقت کسی شخص کے دماغ میں پلاؤ کھانے کی خواہش ہے تو مرنے کے بعد جب فرشتے قبر میں آتے ہیں تو اپنے ہمراہ گرم گرم پلاؤ کی پلیٹیں ساتھ لاتے ہیں اور سوال وجواب سے قبل اس کے سامنے پلاؤ کی پلیٹیں پیش کرتے ہیں اور جب وہ سیر ہو کر کھا لیتا ہے اور تولیہ سے ہاتھ اور منہ پونچھ چکتا ہے تب اُس سے سوالات کا سلسلہ شروع کرتے ہیں۔ مرزا صاحب بھی آدمی تکڑے تھے سوچے کہ اُستاد مرنے کے بعد تو قبر میں تنہا پڑے پڑے دیوالے کھسک جائیں گے لہذا ع اسیروں کو نہ کچھ رہائی کی باتیں۔ کیوں نہ مرتے وقت محبوب کا تصور کر لو تاکہ قبر میں مزے رہیں اور جنت سے محبوب کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہے چنانچہ مرتے وقت جھٹ محبوب کا تصور کر لیا اور گذر گئے۔ اس شعر میں فرماتے ہیں کہ چونکہ مرتے وقت میں نے اپنے محبوب کا خیال کر لیا تھا اس لیئے میری قبر میں ایک دروازہ ایسا لگا دیا گیا ہے جو جنت کی طرف کھلتا ہے تاکہ جنت سے میری محبوبہ کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہے اور میرے حسن خیال یعنی محبوبہ کے تصور کو عملی جامہ کی شکل دی جا سکے۔

اس طرح مرزا صاحب۔ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی کے مصداق قبر میں بھی جنت کے مزے لوٹتے رہے۔

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسے پھر گیا   جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

مشکل الفاظ۔ کھلا خط موت یا حادثہ کی علامت ہے۔

مرزا صاحب اپنے مقدمہ کے سلسلہ میں کلکتہ گئے ہوئے تھے تاکہ مقدمہ لڑ لڑا کر وہاں سے کچھ روپیہ وصول کرلائیں گے مگر وہاں پہنچتے ہی گھر سے مسماۃ کا خط پہنچا کہ عارف کے بچوں کی طبیعت بہت خراب ہے آپ خط دیکھتے ہی فوراً چلے آیئے کھانا دانہ کھا اور ہاتھ یہاں دھویئے چنانچہ یہ شعر اسی خط سے متعلق ہے چنانچہ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ نہ گھر میں چین ہے نہ گھر سے باہر۔ وطن (گھر) میں رہتا ہوں تو گھر والی گھر کے خرچہ کے سلسلہ میں تنگ کرتی ہے اور گھر سے بھاگ کر اگر خرچ کے انتظام کے بہانے سے کچھ دن باہر رہ کر خوش ہونا چاہتا ہوں تو نئے نئے حادثہ پیش آتے ہیں چنانچہ ملاحظہ ہو حوادث کا حال کہ ابھی پوری طرح کپڑے بھی نہیں اتارنے پایا ہوں کہ بیوی کے پاس سے کھلی چٹھی چلی آرہی ہے اور مسافرت کے عالم میں بھی گھر سے پریشان کن خبریں چلی آرہی ہیں۔

غزل ۱۴

شب کو ذوقِ گفتگو سے تیرے دل بیتاب تھا شوخیٔ وحشت سے افسانہ فسونِ خواب تھا

مشکل الفاظ۔ شوخیٔ وحشت = وحشت کی تیزی۔ ذوق = لطف۔ فسوں = دھوکا۔ جادو۔

اس شعر میں مرزا صاحب کو بقول شخصے خواب میں بھی ہرا ہی ہرا نظر آرہا ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ رات جو میں سویا تو دیکھا کہ مساۃ (محبوبہ) نے انٹرویو کا وقت دیا ہے اور مجھ سے ہمکلام ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ یہ خطرہ بھی لگا ہوا ہے کہ کہیں وہ یہ کہکر اُٹھ نہ جائیں کہ۔ جایئے اب آپ کا وقت ختم ہو گیا اب دوسرے لوگوں کو آنے دیجئے چنانچہ اس خیال سے دل دھڑک رہا ہے یا دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ خواب میں دل مارے خوشی کے بے تاب ہے کیونکہ خلاف وعدہ اور خلاف اُمید

اُن سے ہم کلام ہونے کا فخر حاصل ہوگیا ہے بہرحال اسی خواب میں نہ جانے وحشت کی تیزی میں یا گھبراہٹ میں ان سے کون سا فعل سرزد ہوا کہ ایک دم ان کی آنکھ کھُل گئی اب جو آنکھیں مل کر ادھر ادھر دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ ساری ملاقات محض ایک خواب یا افسانہ تھی چنانچہ لاحول ولا قوۃ کہہ کر یہ دوسرے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام　　گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

مشکل الفاظ۔ کرم بخشش۔ کرم فرما۔ دوست۔ عناں گیر = روکنے والا پنبۂ بالش تکیہ کی روئی۔

اس شعر میں بارش اور کیچڑ نے مرزا صاحب کا سارا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ان کے محبوب کے دل میں کرم کرنے کی جولانی پیدا ہوئی تو اتفاق دیکھئے کہ برسات کا موسم تھا۔ ممکن ہے کہ آسمان پر گھنگھور گھٹائیں دیکھ ہی کر وعدہ کیا ہو تا کہ مفت کرم داشتن کے مصداق کرم کا وعدہ بھی کریں اور وعدہ کی عدم تکمیل کا جواز بھی پیدا ہو جائے۔ چنانچہ وعدہ کرنے کے بعد ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی لہٰذا محبوبہ نے پانی اور کیچڑ کے خیال سے اپنا جانا ملتوی کر دیا۔ ادھر مرزا صاحب پہلے تو دیر تک محبوبہ کا انتظار فرماتے رہے اس کے بعد جب ناامید ہو گئے تو رولائی پتالی شروع کر دی اور محبوب کی جدائی میں انھوں نے گھڑوں آنسو بہا ڈالے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روئی جھاگ کی طرح پانی میں تیرنے لگی۔ اسے کہتے ہیں مقدر کا پھوٹا ہونا۔

یاں سر پرشور بے خوابی سے تھا دیوار جُو　　واں وہ فرقِ ناز محوِ بالش کمخواب تھا

بالش = تکیہ۔ دیوارجو = دیوار کا متجسس۔ سہارا ڈھونڈھنے والا۔

اِس شعر میں دونوں طرف کے ٹھاٹھ ملاحظہ ہوں کہ یہاں تو یہ عالم ہے کہ جدائی میں تڑپ رہے ہیں اور دیوار کی تلاش میں ہیں کہ دکھائی دے تو اپنا سرِ شوریدہ اُس سے دے ماریں۔ غرض مرزا صاحب ایک طرف تو اپنے محلّہ کی سڑک پر ٹکرا ٹکرا کر دیواریں گراتے پھر رہے ہیں اور نئی نئی دیواروں کی تلاش میں ہیں اور دوسری طرف فارغ البالی اور آرام طلبی ملاحظہ ہو کہ آپ گھوڑے بیچ کے سو رہے ہیں اور کمخواب کے بستر پر پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔

یاں نفس کرتا تھا روشن شمع بزمِ بیخودی   جلوۂ گل واں بساطِ صحبت احباب تھا

اس کو کہتے ہیں براہ راست بد نصیبی۔ یہاں تو گھر پر مرزا صاحب اپنے نفس کی شمع شرر بار سے اپنی بزم بیخودی کا بیڑا جلائے پڑے ہیں اور وہاں محبوبہ...... کو دیکھئے کہ وہ اپنے دوست احباب کو لئے ہوئے پھولوں کا فرش بچھائے واہ واہ اور سبحان اللہ فرما رہی ہیں مقصد یہ کہ اُدھر وہ مبتلائے دادِ عیش و نشاط تھیں اور ادھر مرزا صاحب جو اُن پہ جان چھڑکتے تھے خود اور ٹڈھال پڑے تھے۔

غزل نمبر ۱۵

نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا   تھا سپند بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا

مشکل الفاظ۔ سپند = ایک قسم کا سیاہ دانہ جو نظر بد دور کرنے کے لیے جلایا جاتا ہے۔ دل اور دانہ میں مشابہت ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ نہ جانے کیا بات تھی کہ رات ...... وہی نالے جن سے بیتابی میں میں زمین و آسمان سر پر اٹھا لیتا تھا۔ ..... اُن میں بارود کی جگہ نرے کوئلے ہی کوئلے آ گئے تھے۔ اور

ان میں ذرہ برابر اثر باقی نہ رہا تھا اگرچہ میں جانتا تھا کہ میرے نالوں سے وہ خاک متاثر نہ ہوں گے۔ اور رقیب کے ساتھ مزے اڑاتے رہیں گے مگر میں محض رقیب کی بزم میں بلوہ مچانے کی غرض سے ایسا کرتا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک نالہ سر کر دیتا تھا۔ مگر چونکہ رات شبنم کے سبب نالے سیل گئے تھے اس لیے ان نالوں سے رقیب کی بزم میں ذرہ برابر بھی نہیں پیدا ہوئی اور وہاں لوگ بڑی دلجمعی سے مزے اڑاتے رہے لہٰذا خیال ہوتا ہے کہ ہمارا دل بھی محبوب اور ان کے چاہنے والوں سے ملا ہوا تھا اور اس بزم کو نظر بد سے بچانے کے لیے دانۂ سپند کے بجائے خود جلنے لگا تھا۔ غرض غیر کے مزے اڑانے پر مرزا صاحب ادھر رشک و حسد میں جل رہے تھے اور ادھر رقیب خوش ہو ہو کر بغلیں بجا رہا تھا۔

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے　　کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

اس شعر میں مرزا صاحب نے موجودہ دور کے واقعات کو نظم کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں علم غیب بھی تھا آپ کو یاد ہوگا کہ انگریزی دور حکومت میں جب اہل وطن آزادیٔ وطن کی راہ میں گرفتار ہوتے تھے اور جیل جاتے تھے تو ان کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی اور قربانی کے بکرے کی طرح اگر ایک اُنھیں ٹھنڈا پانی پلاتا تھا تو دوسرا ہری گھاس کھلاتا تھا۔ اُن کے جیل جانے کے بعد نجی طور پر امداد کی جاتی تھی جیل میں اگر ان پر سختیاں ہوتی تھیں تو اُس کے خلاف احتجاجی جلوس نکالتے تھے۔ جلسے کرتے تھے اور برطانوی حکومت کے خلاف فلک شگاف تقریروں سے زمین و آسمان ہلا کر رکھ دیتے تھے مگر جب انگریز بھاگ

گیا اور ملک میں قومی حکومت قائم ہوئی تو اب اگر عوام کسی بات پر احتجاج کرتے ہیں اور ستیہ گرہ پر اُتر آتے ہیں تو اُن پر لاٹھی چارج ہوتا ہے ان کو منتشر کرنے کے لیے اشک آور گیس کا استعمال ہوتا ہے اور ستیہ گرہ کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا ہے چنانچہ اس قسم کے سیاسی ستیہ گرہ کرنے والوں کی زبان میں مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ابھی کل کی بات ہے کہ تو اسیروں کے ساتھ حد درجہ اخلاص و محبت سے پیش آتا تھا مگر اب انھیں اسیروں پر ستیہ گرہ کرنے یا مرلی بہت رکھنے پر گدھا مار پڑتی ہے۔ اور جب وہ جیل جاتے ہیں تو جیل میں ان کے دانے گھاس تک کا انتظام نہیں کیا جاتا اور حد درجہ لاپروائی برتی جاتی ہے۔

یاد کریہ وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا انتظار صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

مشکل الفاظ کے معنی۔ زلف کے پیچ و خم اور حلقوں کا جال کے پھندوں سے تشبیہ دی ہے

صید: شکار۔ دیدۂ بے خواب: وہ آنکھ جس میں نیند نہ ہو۔

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ جب ہمارے قویٰ مضمحل ہو گئے اور ہم جھینکنے پر لٹکانے والے ہو گئے تو اب محبوب ان کو گھاس تک نہیں ڈالتا حالانکہ جوانی میں اُن کی آؤ بھگت کا یہ عالم تھا کہ محبوب ان کے انتظار میں ہمہ وقت سوالیہ جملہ کا نشان بنا رہتا تھا اور رات رات بھر جاگ کر سویرا کر دیتا تھا مگر اب بڑھاپے میں کوئی پوچھتا تک نہیں کہ ہم پر کیا گزر رہی ہے۔

میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے اس کے سیل گریہ میں گردوں کف سیلاب تھا

مشکل الفاظ: سیل: سیلاب۔ طغیانی۔ کف۔ پھین۔ جھاگ۔

مرزا صاحب یوں دیکھنے میں تو نحیف الجثہ تھے مگر جب رونے پر آتے تو زمین آسمان غرق کر دینے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ تنگ آمد بجنگ آمد۔ آخر کرتے بھی کیا۔ کیونکہ محبوب نے ان کا مکمل بائیکاٹ کر دیا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں وہ تو کہئے میں نے رات کو اپنے آپ کو روکے رکھا۔ میں نے رونے والوں کی سی شکل بنالی تھی مگر دل نے کہا کہ حضور! اس وقت کہاں روئے گا۔ لوگ اپنے اپنے مکانوں میں سو رہے ہوں گے اگر آپ کے رونے سے سیلاب آگیا تو لوگ اپنے مکانوں سے کس طرح بھاگ پائیں گے۔ چنانچہ مرزا صاحب راضی ہو گئے ورنہ وہ طوفان نوح سے بھی بڑا سیلاب لانے پر آمادہ تھے یقین مانئے کہ اگر وہ ذرا ڈٹے رہتے تو دنیا تو تباہ ہو ہی جاتی لیکن آسمان کی بھی خیریت نہ تھی وہ بھی سیلاب کے جھاگ اور پھین کی طرح اڑتا نظر آتا۔

غزل نمبر ۱۶

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

مشکل الفاظ۔ ودیعت = امانت۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر مرزا صاحب نے کسی چیز کا عرق کشید کرتے وقت کہا ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ مژگانِ یار نے جگر کو کدو کش کرکے چھیدنا شروع کر دیا اور اس سے خون رس رس کر عرق کی طرح نکلنے لگا صورت حال یہ تھی کہ مرزا صاحب کو دبلا پتلا دیکھ کر ان کے پاس اُن کا محبوب بطور امانت کچھ خون دے گیا تھا اور کہہ گیا تھا کہ جب آپ تگڑے ہو جائیں تو برابر کا خون واپس کر دیں۔ در حقیقت میں مرزا صاحب کو بلڈ بنک سمجھے ہوئے تھا۔ جب مرزا صاحب اچھے ہو گئے تو اس نے اپنے

خون کا ایک ایک قطرہ تلوا کر وصول کرلیا۔ اب مرزا صاحب کا دل گردہ اور ایمانداری ملاحظہ ہو کہ انھوں نے ذرہ برابر امانت میں خیانت نہیں کی۔

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

مشکل الفاظ۔ یک شہر آرزو۔ اتنی آرزوئیں جن سے ایک شہر بس جائے۔ آئینہ تمثال بدار وہ آئینہ جس میں محبوب کی خیالی تصویریں ہوں۔

اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ مرزا صاحب کا دل سوز عشق سے پگھلتے پگھلتے خاصا وسیع ہو گیا تھا چنانچہ اُس لق ودق میدان کو دیکھ کر آرزوؤں نے اُس میں مکانات اور بازار بنوا کر اُسے ایک اچھے بھلے شہر کی حیثیت دے دی تھی۔ اس شہر میں مرزا صاحب نے بھی ایک مکان لے کر رہنا شروع کر دیا تھا مرزا صاحب نے اپنے گھر کی آرائش اور زیبائش بڑھانے کے لیئے اپنے محبوب کے مختلف پوز لے کر اُنھیں فریم کرا کے اپنے کمرہ میں ٹانگ لیا تھا لیکن جب اس شہر کو محبوب ہی نے توڑ پھوڑ کر تباہ کر دیا تو ظاہر ہے سارا کا سارا فرنیچر بھی تباہ ہو گیا۔ اُس میں دوست کی تصویر بھی تھی جو تباہ ہو گئی اور اس تصویر کے منتشر ٹکڑوں سے جمال یار کا ایک اچھا خاصا شہر بن گیا۔ غالب اپنے فرصت کے اوقات میں محبوب کی تصاویر پر مسمریزم کی مشق کیا کرتے تھے مگر جب دل ٹوٹ گیا تو ان کی اس دلچسپی کا بھی خاتمہ ہو گیا اور اب وہ صرف اُس کا ماتم کرنے کو رہ گئے۔

غزل نمبر ۱۷

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

مرزا صاحب آدمی ذہین تھے۔ سوچ لیا کہ یوں آسانی سے تو محبوب نہ انٹرویو دے گا

اور نہ کبھی اس کا موقع کہ اُس کا خوب حُسن کے نظارہ کیا جا سکے لہٰذا انھوں نے اپنے شوق دید پر دارفتگی اور دیوانگی طاری کر لی اور دیوانہ وار کوچۂ محبوب کے چکر لگانا شروع کر دیئے۔ جب کوئی جاننے والا مرزا صاحب سے دریافت کرتا کہ فرمایئے مرزا صاحب آج ادھر کیسے نکل پڑے تو فرما دیتے کہ میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں۔ جنون یہاں کھینچ لایا ہے۔ کوچۂ محبوب میں پہنچکر مرزا صاحب ایک حرکت یہ کرتے ہیں کہ اپنے اوپر حیرانی کی کیفیت بھی طاری کی ہے۔ اور حیران ہو ہو کر محبوب کا نظارہ کرتے ہیں اگرچہ اس کے بعد بھی اُنھیں محبوب سے مخاطب ہونے کا شرف نہ حاصل ہو سکا مگر ذکر العیش نصف العیش نظارہ بھر پور مزہ تو حاصل ہی ہو گیا اور آمد و رفت کی قیمت وصول ہو گئی

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

مشکل الفاظ ۔ زود پشیماں ۔ جلد شرمندہ ہونے والا۔

اس شعر میں مرزا صاحب نے اپنے محبوب کی تکرم بازی کو طشت از بام کیا ہے محبوب نے مرزا صاحب کو تغندو سے قتل کر دیا ہے۔ اور مرزا صاحب برضا و رغبت مر بھی گئے ہیں چنانچہ محبوب نے جب پورے طور پر اطمینان کر لیا کہ مرزا صاحب واقعی انتقال فرما گئے ہیں تو اُس نے اپنے جھوٹے و ونٹے نوچ کر رونا پیٹنا اور بین کرنا شروع کر دیا۔ اور جگہ جگہ مرزا صاحب کے قتل پر اپنی شرمندگی کا اظہار شروع کر دیا نیز مرزا صاحب کے اعزار سے غمخواری شروع کر دی۔ ماتمی لباس میں ان کے تیجے اور چالیسویں میں شرکت کی مگر مرزا صاحب کی شرافت ملاحظہ ہو کہ قتل ہونے کے بعد بھی محبوب کے خلاف حرف شکایت زبان پر نہیں لائے اور قبر میں اپنے قتل کی خبر سُن کر صرف اتنا کہا کہ مجھے اپنے قتل ہونے کا تو چنداں افسوس

نہیں البتہ اس کا افسوس ضرور ہے ہائے میرے مرنے کے بعد ان کو بلا وجہ کس

درجہ شرمندہ اور خجل ہونا پڑا اس شعر میں زود پشیمان پورے شعر کا رابطہ ہے۔

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

مرزا صاحب جنم کے رونے تھے اور جب رونے کے لیے کوئی جواز نہ ملتا

تو وہ سروں کے گریبانوں کو یاد کر کے اپنے اوپر رقت طاری کر لیتے تھے چنانچہ اس

شعر میں مجنوں اور فرہاد علیہ الرحمۃ کے چار انگل گریبان کی جان کو رویا گیا ہے عاشق

کو محبوبہ یا گھر والے جو بھی قمیض یا کرتہ بنوا دیتے ہیں اس کا گریبان ہر وقت چڑیا نوچن

میں مبتلا رہتا ہے ادھر محبوب کی جدائی سے عاشق صاحب تنگ آئے اُدھر

انھوں نے گریبان نوچنا شروع کر دیا۔

غزل نمبر ۱

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا تا محیطِ بادہ، صورت خانۂ خمیازہ تھا

مشکل الفاظ۔ خمار = تکلیف۔ شوق = شوق دید۔ انتظار۔ رستخیز اندازہ =

اندازۂ قیامت۔ محیطِ بادہ = پیمانہ شراب میں جو لکیروں سے دائرے بنے ہوتے ہیں۔

صورت خانۂ خمیازہ = انگڑائیوں کا تصویر خانہ۔

اب سنئے مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ تاڑی خانے یعنی میخانے کے ساقی صاحب گول

ہیں، انکی غیبت میں تاڑی باز تو تاڑی باز حتیٰ کہ خود تاڑی خانہ (شراب خانہ) خمار میں

مبتلا ہو کر بڑبڑا رہا ہے اور اُسے انگڑائیوں پر انگڑائیاں آ رہی ہیں۔ ان

انگڑائیوں کا عکس جو خالی پیمانے رکھے ہوئے ہیں اُن پر پڑ رہا ہے اور ہر پیمانہ

انگڑائیوں کا ایک تصویر گھر بنا ہوا ہے اور سارا منظر ایک قیامت کا نقشہ پیش کر رہا ہے

صورت حال یہ ہے کہ ہر ناڑی باز دخرابی، خوف و ہراس سے قربانی کا بکرا بنا
اپنی کھال پھڑ کار ہا ہے اور سب کے سب اس انتظار میں ہیں کہ تاڑی باز دن
خلیفہ یعنی ساقی صاحب تشریف لائے تو یہ پراہمٹ دور ہو اور ہر فرد مزے سے
اچک پھاند شروع کر دے مگر ہنوز روز ازل کے مصداق نہ تو ساقی صاحب آج
آتے ہیں اور نہ کل، نتیجہ یہ ہے کہ سبھوں پر انتقال کن کیفیت طاری ہے۔

مانع وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے　　خانۂ مجنون صحرا گرد بے دروازہ تھا

مشکل الفاظ۔ وحشت خرامی = دیوانہ وار چلنا صحرا گرد = یہ مجنوں کی صفت۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مجنون علیہ الرحمۃ نے صحرا کو اپنا مستقل مسکن بنایا تھا
اور وہیں درختوں کے سایہ میں یا جلتی پھکتی ریت پر پڑے پڑے ہائے لیلیٰ کے نعرے
بلند کیا کرتے تھے انھوں نے صحرا کو اپنا مسکن اس چالاکی کے تحت بنایا تھا کہ لیلیٰ کی
آمد و رفت میں زحمت نہ ہو اسے ان کے مکان پر کنڈی کھٹکھٹانا نہ پڑے اور
آواز دے کر پکارنے کی زحمت نہ ہو اور گلا پھاڑ کر یہ کہنا پڑے کہ ایک سواری اتر دا
لیجئے۔ اسی لیے صحرا میں قیام کیا تھا کہ جب دروازے کی قید نہ ہوگی تو وہ آپ سے آپ
دن دناتی چلی آئے گی مگر اس آسانی کے باوجود لیلیٰ ایسی سیانی تھی کہ ان کے پاس نہ آئی
سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر مجنوں نے اس کا کون سا باپ مارا تھا جو اسے ان سے اس قدر
نفرت تھی! اس سے پتا بت ہوتا ہے کہ لیلیٰ سے مجنوں کی محبت اور عشق بے اثر تھا اور
اس میں کوئی کشش نہ تھی محض کھیلا ہی کھیلا تھا ورنہ اگر عشق میں ذرہ برابر بھی
زور ہوتا تو مجال تھی ایک عورت کی جو اس کے پاس نہ آجاتی۔

غزل نمبر ۱۹

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا ‏ ‏ زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ آئیں گے کیا؟

ہر زخمی اور خارش زدہ کا خاصہ ہے کہ جب اُسے کھجلی معلوم ہوتی ہے تو وہ اپنی ساری جان کھسوٹ ڈالتا ہے پھر چاہے اُس کا سارا جسم لہو لہان ہی کیوں نہ ہو جائے۔ یہی حال مرزا صاحب کا تھا کہ سارا جسم عشق کی گرمی کے سبب کھجلی سے بھیلا ہوا تھا۔ ایسی حالت میں ہمدردی کرنے والوں کا ایک تانتا بندھا رہتا تھا مگر مرزا صاحب کو زخموں کے کھجانے کا مرض تھا اور کسی طرح کھجلانے سے باز نہ آتے تھے۔ لوگ دن میں کئی کئی بار مرہم پٹی کر کے چلے جاتے تھے مگر یہ پھر کھجلا کر ساری مرہم پٹی اور دوستوں کی ہمدردی پر پانی پھیر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ لوگوں نے اس خیال سے کہ کہیں زہر باد نہ ہو جائے ان کے ناخن کتروا دیئے اس پر فرماتے ہیں اچھا تو سہی جو زخموں کے مندمل ہونے پر نہ کھجلایا ہو۔ احمق یہ نہیں سمجھتے کہ چند دن کے اندر اندر ناخن پھر بڑھ آئیں گے اور ہم پھر کھجلانا شروع کر دیں گے۔ اور ان کی ساری محنت رائگاں کر دیں گے۔

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک ‏ ‏ ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے "کیا"؟

غالب کے اس شعر سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی محبوبہ بہری تھی یا عمداً بات کرتے وقت وہ بہری بن جاتی تھی۔ یہ بیچارے بندہ پرور۔ آقائے نامدار اور ظل اللہ غرض ہزار طرح کے خوشامدانہ فقرے استعمال کر کے انہیں مخاطب کرتے جس کا جواب وہ کیا کہا؟ "کیا فرمایا؟" "کیا آپ کچھ مجھ سے کہہ رہے ہیں؟" سے دیتی اور یہ جھک ہو جاتے۔ غرض وہ ان سے طرح طرح کے نخرے کرتی اور مستقل طور پر ان سے لاپروائی برتتی تھی اسی کا رونا اس شعر میں مرزا صاحب روتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صاحب ہم کو تو محبوبہ نے ایسا عاجز کر رکھا ہے کہ

خدا کسی دشمن کو اتنا عاجز نہ کرے ۔ یہ خیال فرمایئے کہ ہم تو اپنی حالت بیان کر رہے ہیں کہ آج ہم رات بھر تمھاری یاد میں اس اس طرح تڑپے اسی طرح کل سویرے سے شام تک ڈھائی تین سو نالے سر کرتے رہے مگر آپ ہیں کہ ہماری ہر بات کو سنی ان سنی کر تی رہتی ہیں اور جو کچھ ہم بیان کرنا شروع کرتے ہیں گیا گویا کی دُھن لگا دیتی ہیں ۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کسی ایک وقت تو ہمارے مطلب کی سن لیا کریں ۔

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں   عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا

مرزا صاحب کی زندگی جب ان کی محبوبہ نے اجیرن کر دی تو آخر میں انھوں نے طے کر لیا کہ اب یا اس سرے یا اُس سرے یا تو قتل ہی ہو جائیں گے یا پھر اپنا مطلب نکال لیں گے ۔ بہر حال اب ہم کسی قسم کا عذر نہیں سنیں گے ۔ اس سے قبل بھی دو ایک مرتبہ مرزا صاحب اُن کے پاس اپنے کو قتل کرانے جا چکے ہیں مگر اُنھوں نے کبھی یہ عذر کر دیا کہ اس وقت تو میں کپڑے وپڑے بدل کر نوٹنکی دیکھنے جا رہی ہوں اور کبھی یہ بہانہ کر دیا کہ اس وقت گھر میں کوئی گنڈاسا یا تلوار نہیں ہے کس چیز سے قتل کر دوں اگر مرزا صاحب کبھی تلوار لے کر گئے تو یہ عذر کر دیا کہ صاحب کفن باندھ کر آیئے ۔ قتل کے بعد کس کے پاس اتنے دام فالتو ہیں جو کفن دفن کا انتظام کرتا پھرے گا چنانچہ اس مرتبہ مرزا صاحب پوری تیاری کے ساتھ گئے ہیں ۔ سب سے پہلے مرزا صاحب نے تلوار پر باڑھ رکھوائی اس کے بعد بازار سے اٹھائیس گز نین سکھ (لٹھا) کفن کے لیے خرید لائے اور ساری چیزوں سے لیس ہو کر اور کفنا دفنا کر ان کی خدمت میں یہ سوچ کر حاضر ہوئے کہ اب دیکھیں وہ کیا عذر کرتے ہیں کیونکہ تلوار کی جگہ تلوار ہے اور کفن کی جگہ پہ کفن ۔ غرض مرزا صاحب اس کے پہنچ دیکھنا ہے گئے تھے اور جس طرح اُس نے

ان کی جان اجیرن کر دی تھی اسی طرح انھوں نے بھی اسے پریشان کرنے میں کوئی تسمہ باقی نہیں رکھا تھا۔

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں　　ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

خانہ زاد: غلام جسے بچپن سے پالا گیا ہو۔

اس شعر میں مرزا صاحب نے اپنے مادر زاد مجرم ہونے کا اقبال کیا ہے فرماتے ہیں کہ صاحب ہم بھی عادی مجرموں میں سے ہیں ان کی زلفوں کی زنجیر ہمارے پیروں میں پڑی ہوئی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ ہم ان لوگوں میں نہیں ہیں جو گرفتاری کے ڈر سے بھاگ کھڑے ہوں ہم محبوب کی محبت کے سلجھانے میں چرسٹے[1] کا ساگ کھائے ہوئے ہیں۔ ہم کو نہ تو وہ جیل سے ڈرا سکتے ہیں اور گرفتاری کی دھمکی دے کر مرعوب کر سکتے ہیں ہم کو چیر کے دینا ہنسی ٹھٹھا نہیں۔ اگر ہم سزا یافتہ نہ ہوتے تو شاید اس کی ہمت نہ کرتے مگر ہم ان کی محبت کے مادر زاد مجرم ہیں اور ان کی زلفوں کے اسیر بلکہ غلام زادہ ہیں وہ زلفیں جو زنجیر کے مانند ہم کو گرفتار کیے ہیں لہٰذا ہم اسیرانِ وفا کسی دھونس میں آنے والے نہیں اور نہ ہم کو گرفتاری سے کسی قسم کی گھبراہٹ ہے۔

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ　　ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

مشکل الفاظ۔ معمورہ شہر یہ دلّی۔ غم الفت و محبت شاعروں کی اصطلاح میں عشق یا الفت غم یہ سارے الفاظ ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔

یہ شعر مرزا صاحب نے غدر کے بعد کہا تھا جس میں فرماتے ہیں کہ اب غدر کے بعد دلّی میں رہا کون ہے سب دوست احباب اور محبوبائیں تو غدر میں کام آچکی ہیں یا بھاگ کر دوسرے شہروں میں جا بسی ہیں اب تو دلّی میں محبت کریں تو کس سے

---

[1] ایک قسم کی گھانس

کا محفل ہے محبت کرنے والا معشوق کہیں دوا کو میسّر نہیں لہٰذا اب سب سے
بڑا سوال یہ ہے کہ ہم جو دونوں وقت اُن کی محبت بطور غذا کے استعمال کرتے تھے
اور پڑے پڑے اپنڈتے تھے ہمیں اب کون گھاس ڈالے گا ایسی صورت میں
جو لوگ کہتے ہیں کہ اماں دلی چھوڑ کر کہاں جاؤ گے۔ یہیں پڑے رہو۔ تو سوال
یہ ہے کہ یہاں رہنے کو تو رہ جائیں مگر کھائیں گے کیا۔ کیونکہ ساری غذائیں (محبوبائیں)
تو دلی چھوڑ کر بھاگ چکی ہیں۔

غزل نمبر ۲

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا   کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

مرزا صاحب کو ایک سیدھا سادا انسان سمجھ کر اُن کے محبوب نے ہمیشہ ان کو
وعدوں کے سہارے رکھا مرزا صاحب بھی آدمی وضعدار قسم کے تھے چنانچہ یہ
سوچ کر کہ کبھی تو وعدہ پورا ہوگا اور ایک ایسا وقت آئے گا جب ہمیں اصل معہ
سود کے محبت کا صلہ ملے گا چنانچہ اس اُمید پر خاموش رہے اور تابڑ توڑ وفا ئیں
کرتے رہے مگر آخر میں جب مرزا صاحب محبوب کی چرکے بازیوں سے زچ ہوگئے تو
اس نتیجہ پر پہونچے کہ شاید اب ہمارے مقدر میں وصل محبوب نہیں ہے لہٰذا فرماتے
ہیں کہ اب عجیب ادب میں گوٹ پھنسی ہے۔ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ تیرے وعدے پر
جی رہے ہیں تو وہ (محبوب) یہ سمجھے گا کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں اس کے علاوہ اگر
اس نے یہ مان بھی لیا کہ ہم اُس کے وعدہ پر زندہ ہیں تو بھی وہ ہمارے اس کہنے پر
یقین نہ کرے گا اور اسے جھوٹ سمجھے گا اور دل میں یہ خیال کرے گا کہ ہم اس کی ساری
باتوں کو جھوٹ سمجھے ہوئے ہیں ورنہ اگر ہم نے اس کے وعدہ کا یقین کر لیا ہوتا تو ہمیں

مارے خوشی کے مرجانا چاہیئے تھا اور اب تک تیجہ اور چالیسواں بھی ہو چکا ہوتا۔ لہٰذا ہمارا نہ مرنا ہی اس بات کی دلیل ہے ہم اس کے وعدے اور حیلے سمجھے ہوئے ہیں اور تجھے جھوٹا سمجھتے ہیں۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرق دریا نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

مرزا صاحب کی ساری زندگی قرض لیتے گذری تھی مگر اس لین دین میں غلطی یہ ہوئی کہ منجملہ عام لوگوں کے اُنھوں نے بغیر سوچے سمجھے مغلیوں سے بھی قرض لے لیا۔ اُنھیں کیا معلوم تھا کہ مغلئے مرنے کے بعد کفن کھسوٹنے سے بھی دریغ نہیں کرتے چنانچہ یہی صورت اِن غریب کے ساتھ بھی پیش آئی اور مقدر میں جو لکھا کر لائے تھے وہ پورا ہو کر رہا مقصد یہ کہ مغلئے ان کی قبر پہ لٹھ لے کر پہنچ گئے اور قبر کھودنے پر آمادہ ہو گئے۔ اِس صورت حال کو دیکھ کر اُن کے عزیز و اقارب اور دوست احباب کو جو انھیں دفن کرکے پلٹ رہے تھے، سارا قرض ادا کرنا پڑا۔ اس شعر میں مرزا صاحب نے اِسی واقعہ کا ذکر کیا ہے مرنے کے بعد مرزا صاحب کو جب قبر میں اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو بہت آزردہ خاطر ہو کر بولے کہ کاش ایسا ہوتا کہ جب مرنا ہی تھا اور مغلیوں سے قرض لے کر ہی مرنا تھا تو دریا میں ڈوب کر مرا ہوتا تاکہ نہ جنازہ اٹھنے کی خبر مغلیوں کو ہوتی اور نہ کہیں قبر کی تعمیر ہوتی اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے قرض لیے عالم بالا کو چلے جاتے اور یہ رسوائی نہ ہوتی جو مرنے کے بعد ہوئی۔

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

قاعدہ ہے کہ تیرانداز جب تیر چلاتا ہے تو کمان کے چلّے کو کان تک کھینچ کر چھوڑتا ہے اس لیے بڑی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ایسا کر کیا ہوا تیر پوری تیزی

کے ساتھ نشانہ پر بیٹھتا ہے کمزور لوگ چلّا اس حد تک نہیں کھینچ پاتے اسی لیے
ان کے تیر میں زور بھی نہیں ہوتا۔ اب شعر ملاحظہ ہو معشوق یعنی تیر انداز بہت
نازک ہے وہ مرزا پر تیر چلا رہا ہے مگر تیر بہت سستی سے سر ہوا ہے جس کے سبب جگر
میں پیوست ہو کر رہ گیا ہے۔ اب مرزا صاحب محبوب کے ہلکے پھلکے تیر کو جگر پر کھانے
کے بعد اُس سے لطف لے رہے ہیں بہت ممکن ہے کہ مرزا صاحب کا محبوب یک چشم
ہو جس کے سبب تیر پُھسپھسا چھوٹا ہو۔ کیونکہ تیر چلانے میں دونوں آنکھوں پر زور
پڑتا ہے اور تیر انداز تیر چلاتے وقت ایک آنکھ سے نشانہ لیتا ہے اور دوسری آنکھ
داب کر نشانہ کی طرف تیر چھوڑتا ہے چونکہ مرزا صاحب کا محبوب یک چشم تھا اس لیے
اُس کا تیر چھوٹ کر مرزا صاحب کے دل میں چبھ کر رہ گیا اگر خدانا کردہ اس کے دونوں
آنکھیں ہوتیں تو شاید ایک ہی تیر میں مرزا صاحب اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔
مرزا صاحب اس شعر میں فرماتے ہیں کہ صاحب نہیں تو ایک آنکھ سے سر ہونے
تیر سے پورے پیسے وصول ہو گئے اور مزہ آ گیا ورنہ اگر یہی تیر جگر کے پار ہو جاتا تو رہ رہ
کر یہ مزیدار چبھن جو ہو رہی ہے وہ کہاں نصیب تھا۔

غزل نمبر ۲۱

نگاہ بے محابہ چاہتا ہوں تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

مشکل الفاظ۔ نگاہ بے محابہ = کامل التفات۔ تمکین آزما = صبر آزما۔

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ مرزا صاحب کی محبوبہ کو مرزا صاحب
پھوٹی آنکھ نہ بھاتے تھے اس لیے وہ ان کی غیر موجودگی میں رقیبوں پر طرح طرح کی
نوازشیں کرتی رہتی تھیں۔ کبھی انھیں حلوے بنا کر بھیج رہی ہیں تو کبھی میٹھی کھجوریں۔

مرزا صاحب کو گھر بیٹھے اس کی اطلاع ہوتی رہتی تھی اور لوگ مرزا صاحب کو سناتے رہتے تھے کہ آج فلاں چیز بک گئی ہے اور کل فلاں چیز بک کر جانے والی ہے مگر چونکہ یہ اپنی محبوبہ سے بے حد ڈرتے تھے لہذا ایک دن فرمانے لگے کہ میں تم سے شکایت کے طور پر نہیں کہتا کہ تم رقیبوں کو تحفے تحائف نہ بھیجو البتہ یہ جو تم میری طرف سے بے التفاتی برتی ہو اور میری طرف سے اس درجہ لاپروائی اختیار کیے ہوا سے چھوڑ دو اور جو کچھ رقیبوں کو بھیجتی ہو اس میں سے کچھ بچا کھچا ہی مجھے چکھا دیا کرو بخدا اس کے بعد مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تم جو چاہو کرو میں صرف کامل التفات چاہتا ہوں ورنہ یہ جو صبر آزما بے التفاتی اور تغافل کی شکایت ہے وہ ہمیشہ قائم رہے گی۔

حمایہ کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ   شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا

مشکل الفاظ: حمایہ بمعنی گو یہ لحاظ و مروت کے ہیں مگر یہاں فکر و اندیشے کے معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ خوں بہا = خون کی قیمت۔

اس شعر میں مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ قسم آپ کے سر عزیز کی جو اس بندۂ ناچیز کو اپنے مرنے کا ذرہ برابر بھی غم ہو لہذا تم بھرپور میری طرف دیکھ لو پھر چاہے میرا انتقالِ پُر ملال ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اور اس سلسلہ میں میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ تم پر کوئی آنچ نہ آئے گی اور پولیس والے تم سے کوئی مواخذہ نہ کریں گے اس لیے کہ تم کسی دھار دار اسلحہ یا گنڈا سے سے مجھے تھوڑے مار رہی ہو جس سے تمھیں یہ خوف ہو کہ اسلحہ کے برآمد ہونے پر تم کو پولیس والے دھر لیں گے اور تم پر ۳۰۲ کا مقدمہ دائر کرا دیں گے اور نہ تم سے میرے ورثا کسی قسم کا خون بہا طلب کریں گے کیونکہ نظر سے مرنے والے کا خون بہا ہی کیا؟

غزل نمبر ۲۲

درخور قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

مشکل الفاظ ۔ درخور معنی : لائق ۔

مرزا صاحب نے چونکہ محبوب کے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کر لیے ہیں اس لیے فرماتے ہیں کہ دوست کا قہر و عتاب صرف ہمیں پر نازل ہوا کرتا ہے کیونکہ ہمیں پتلی گردن کے ہیں۔ کسی دوسرے پر اس وجہ سے قہر و غضب نہیں ہوتا کہ ان کی دوسروں کے کھانے کی کوئی وجہ نہیں ہم ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ہم ان کے اور نازو عاشقوں میں ہیں اور ہم جیسا سچا عاشق نہ آج تک پیدا ہوا ہے اور نہ انشاء اللہ آئندہ پیدا ہونے کا کوئی امکان ہے۔ یہ کہہ کر مرزا صاحب محض اس بات پر اپنی یکتائی ثابت کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جتنی ڈانٹ ڈپٹ ہم پر پڑتی ہے اتنی ڈانٹ ڈپٹ کھا کر کوئی دوسرے صاحب دکھائیں تو ہم جانیں۔

کم نہیں نازش ہم نامی چشم خوباں تیرا بیمار برا کیا ہے جو اچھا نہ ہوا

مشکل الفاظ ۔ نازش : ناز، فخر ۔ چشم خوباں : نرگس بیمار ۔ نیم باز مست آنکھ جو معشوقوں کی ہوا کرتی ہے۔ عاشقوں کے نزدیک تمام معشوقوں کی ہوا کرتی ہے۔

ایک صاحب جن کا نام شیخ مبارک تھا محض اس بات پر فخر کیا کرتے تھے کہ ابوالفضل اور فیضی کے باپ کا نام بھی شیخ مبارک تھا جو شہنشاہ اکبر کے حاشیہ نشینوں میں تھے چنانچہ اس شعر میں محبوب سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ ہم آپ کی محبت میں بیمار ہیں اور آپ کی آنکھ نرگس بیمار ہے اس اعتبار سے لفظ بیمار ہمارے اور آپ کے درمیان مشترک ہے اور یہ ہم نامی ہمارے لیے باعث فخر ہے اس پر ہم جس قدر بھی نازاں ہوں بجا ہیں کم ہے۔ کیونکہ

ایسی بیماری پر ہزاروں تندرستیاں قربان۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو ہمارا بیمار ہونا اچھا ہی ہے برا نہیں۔

نام کا میرے ہے وہ دکھ کہ کسی کو نہ ملا کام میں میرے ہے وہ فتنہ جو برپا نہ ہوا

اس شعر میں مرزا صاحب محض اس بات پر خوش اور مگن ہیں کہ دنیا میں جب مختلف امراض اور دکھوں کی تقسیم ہونے لگی تو عام لوگوں کے حصے میں صرف ایک دکھ آیا اور جناب بقیہ تمام دکھ جو فاضل بچے تھے، بٹور لائے۔ لہذا جب آپ دنیا میں لاکھوں دکھوں کا پلندہ لیے ہوئے حاضر ہوئے تو ظاہر ہے کہ آپ کو طرح طرح کے امراض سے دوچار ہونا پڑا۔ جن میں بہت سے خفیہ امراض بھی تھے چنانچہ فرماتے ہیں کہ یہ سب امراض ایک فتنہ کی شکل میں دبے ہوئے ہیں اور میری بربادی پر کمر بستہ ہیں۔ اب مرزا صاحب سے کوئی پوچھے کہ جس وقت یہ امراض تقسیم ہو رہے تھے اسی وقت جناب نے کیوں نہ انکار کر دیا کہ حضرت ہم اتنے بہت سے امراض کے متحمل نہیں ہو سکتے سب کو ایک ایک مرض دیا ہے تو آپ کی مروت کی خاطر ہمارے ہاتھ پیروں کی مناسبت سے ایک نہیں دو دیجئے مگر آپ آ بیل تو مجھے مار کے مصداق اتنے بہت سے امراض لے کر آئے ہیں کہ حکیم ڈاکٹر ہاتھ لگاتے ڈرتے ہیں ظاہر ہے کہ امراض تکلیفیں نہ پہنچائیں گے تو کیا لڈو پیڑے بانٹیں گے۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

محبوب اپنے عشاق کی پٹائی میں مصروف تھا اور شہر بھر میں یہ خبر اڑی ہوئی تھی کہ جو صاحب بھی آج ان کی خدمت میں حاضر ہوں گے وہ زندہ پلٹ کر نہیں آئیں گے

اور اُن پر گدھا مار پڑنا شروع ہو جائے گی۔ مرزا صاحب چونکہ ترکی النسل اور سرخ و سفید واقع ہوئے تھے اور فن سپہ گری آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملا تھا اس لیے آپ بھی زین و ین کس کر عشاق کے زمرے میں شامل ہو گئے اور فرمانے لگے کہ اب کیا کہتے ہیں؟ جب تمام عشاق پٹ پٹا کر فارغ التحصیل ہو لئے تو مرزا صاحب کی سج دھج اور اکڑفوں دیکھ کر محترمہ کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اُن پر ہاتھ اٹھائیں چنانچہ دوسرے مصرع میں فرماتے ہیں کہ ہم سمجھے تھے کہ تماشائیوں میں شامل ہونے کے بعد ہماری بھی انہیں جیسی درگت بنے گی مگر ایسا نہیں ہوا اور وہ جوتیں کھا گئیں۔ اور یہ واقعہ ہائکہ پیش نہ آیا۔

غزل نمبر ۲۲

اسدہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں   کہ ہے سر پنجہ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

مشکل الفاظ۔ جنوں جولاں۔ جنون کی حالت میں چوکڑیاں بھرنے والا۔ بے سر و پا۔ جس کا کوئی ٹھکانا نہ ہو۔ پشت خار۔ ایک پنجہ نما آلہ جس سے پیٹھ کھجائی جاتی ہے۔ مژگان آہو اور پشت خار میں تشبیہ ہے۔ مرزا صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ جوانی میں وہ بہت تیز دوڑتے تھے ایسا کہ ریس کے گھوڑے آپ کو دیکھ کر شرم و حیا سے آنکھیں نیچی کر لیتے تھے۔ چونکہ عاشق بھی تھے اور مفلس بھی یعنی ایسے فقیروں میں تھے جن کے رہنے کا نہ کوئی ٹھیا تھا اور نہ پیر ٹکانے کو کوئی دہلیز اس لیے محبوب کی محبت میں جنگلوں اور صحراؤں میں زندگی کا گزر بسر کرتے تھے اور صحراؤں اور جنگلوں میں چوکڑیاں بھرا کرتے تھے جنگل میں مست ہرن بھی ادھر اُدھر چوکڑیاں بھرتے دکھائی پڑتے تھے مگر مرزا صاحب اس درجہ تیز بھاگنے والوں میں تھے

کہ ہرن بھی ان کی دوڑ کے آگے پانی بھرتے تھے اور ان کے پیچھے پیچھے رہتے تھے ہرن پیچھے کیا چلتے تھے گویا ان کی پیٹھ پر چھا نوان کرتے نظر آتے تھے چنانچہ فرماتے ہیں کہ ہمارے جنون و دشت کے سامنے ہرن بھی اپنی ساری چوکڑیاں بھول جاتے ہیں

غزل نمبر ۲۴

دھان ہر بت پیغار جو زنجیر رسوائی   عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا

مشکل الفاظ۔ پیغار جو ۔ طعنہ زن لڑنے کو کہتے ہیں ۔ زنجیر سلسلہ ۔ دہن ۔ یعنی منہ جو زنجیر کی کڑی کی شکل کا ہوتا ہے ۔ اور عام معشوق کے منہ کو لوگ محض ایک خیالی نقطہ یا معدوم بتاتے ہیں ۔ اس سلسلہ میں مرزا صاحب کو معشوق سے جو حسن ظن تھا اس کو بھی پیش نظر رکھئے اول یہ کہ وہ ہر معشوق کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ وہ غصہ ور بے وفا اور ظالم ہوتا ہے دوسرے یہ کہ اس کے منہ کا دہانہ اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ اگر اسے آنکھیں گڑ وکر دیکھا جائے تو نظر نہیں آسکتا اب مرزا صاحب فرماتے ہیں ۔ ہمارا معشوق بھی اس نوعیت کا ہے اور اس درجہ بد مزاج اور بے وفا ہے کہ اس کی بے وفائی اور غصے کے دوسرے معشوق تک شاکی ہیں ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ بیوفائی کی حد اور کیا ہوگی چنانچہ جب تینوں نے ان کے محبوب پر یوں طعنہ زنی کرنا شروع کی کہ اے مرزا صاحب ! تو تم پر جان چھڑکتے ہیں اور تمہاری محبت میں کھانا پینا چھوڑے ہوئے ہیں اور تم ہو کہ ان کو منہ نہیں لگاتیں اس سے اُن کی بدنامی اور رسوائی کا ایک سلسلہ قائم ہوگیا اور اتنی رسوائی ہوئی ہے کہ دنیا تو دنیا عدم تک وہ کسی

کو منہ دکھانے کے قابل نہیں ہیں۔

نہ دے نامے کو اتنا طول غالب مختصر لکھ دے ۔ کہ حسرت سنج ہوں عرض ستم ہائے جدائی کا

مشکل الفاظ: حسرت سنج۔ یہ آرزومند کو کہتے ہیں۔

مرزا صاحب جب اپنے محبوب کو خط لکھنے پر آتے تو صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالتے تھے اور دن رات میں جتنے نالے اور آہیں محبوب کی یاد میں سر کرتے ان کی وجہ تسمیہ اور حدود اربعہ بھی لکھ مارتے گویا خط کیا بھیجتے تھے ایک اچھا خاصا میمورنڈم (عرضداشت) ہوتا تھا چنانچہ کسی نے ان کو خط لکھتے دیکھ کر کہا کہ حضرت بس کیجئے ورنہ ڈاک کا بڑا خرچ بیٹھے گا۔ آخر میں اپنا مدعا بیان کر دیا کیجئے۔ اور لکھ دیجئے کہ اگر تابعدار کو حضوری بخشی گئی تو حاضر خدمت ہو کر بالمشافہ اپنے ستم ہائے جدائی کا ذکر کرے گا۔ اس قسم کی عرضداشتوں کا عموماً انداز یہ ہے کہ آخری جملے اظہار مدعا کے ہوتے ہیں چنانچہ ان کو بھی ایسا کرنا پڑا۔

غزل نمبر ۲۵

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر ۔ ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

ظاہر ہے کہ یہ واقعہ غالب کے زمانۂ شباب کا ہوگا۔ جب یہ نئے نئے عاشق ہوئے ہوں گے معشوق سے ان کی محض یاد اللہ ہوگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی دن ان کا محبوب گھوڑے بیچ کر سو رہا ہوگا کہ ان کی اس پر نظر پڑ گئی آپ نے اس کے سونے سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے۔ لپک کر اس کے پاؤں کے بوسے لینے کی کوشش کی مگر پھر خیال آیا کہ استاد اگر اس کو نیت کا حال معلوم ہو گیا تو عشق وشق دھرا رہ جائے گا۔ اگر بدگمان ہو کر اس نے کہیں اپنے والدین سے

کہہ دیا تو ظاہر ہے کہ دنیا میں مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہوگے۔

غزل نمبر ۱۶

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب گالیاں کھاکے بے مزہ نہ ہوا

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ رقیب جیسا ہیچ عیب شرعی انسان جو خود غرض، بزدل، کم حوصلہ اور کمینہ سب ہی کچھ ہے اُس کا کہنا ہے کہ محبوبہ کی گالیاں اس درجہ لذیذ اور خوش ذائقہ ہوتی ہیں کہ اُس نے بارہا گالیاں کھائیں اور چٹخارے لیے تو یقینی طور پر اُس کے لبوں کی شیرینی کی کوئی حد و انتہا نہ ہوگی لہٰذا کیوں نہ اِس مرتبہ اُس سے ہمکلام ہونے کی پکنک منائی جائے۔

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

دیکھئے ہم نہ کہتے تھے کہ مرزا صاحب کو آنے والے واقعات کا پہلے سے علم ہو جاتا تھا چنانچہ اُن کے مرنے کے کم و بیش سو برس بعد آئیزن ہاور ہندستان آئے لیکن اس کی بشارت ان کے کلام کے اس شعر میں موجود ہے "آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا"، کا مفہوم صحیح طریقہ پر اُنھیں لوگوں کی سمجھ میں آسکتا ہے جو دلّی میں رام لیلا کا میدان جہاں آئیزن ہاور کا دلی کے شہریوں نے استقبال کیا تھا شامل "۔

حقیقت یہ ہے کہ دلّی میں کوئی ایسا معقول پارک یا میدان موجود نہ تھا جو آئیزن ہاور کے استقبال کے شایانِ شان ہوتا اسی لیے اُنھوں نے زیادہ عرصہ قیام نہیں کیا اور یہ کہہ کر چلے گئے کہ صاحب آپ کے یہاں کوئی معقول جگہ ہی موجود نہیں ٹکیں تو کہاں ٹکیں ورنہ دل تو چاہتا تھا کہ کچھ روز جہاں تاج محل دیکھا ہے وہاں دو چار عمارتیں اور دیکھ لیتے چنانچہ چار روز کے بعد ہی وہ چلے

گئے اور نہ رکنا تھا نہ رکے ۔

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں   تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

مرزا صاحب آدمی تو بڑے گورے چٹے تھے اور ہاتھ پیروں کے بھی اچھے تھے مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ اُن کی محبوبہ اُن کو اس قابل ہی نہ سمجھتی تھی کہ ان کو منہ لگائے چنانچہ اس کا شکوہ جگہ جگہ اُن کے کلام میں ملتا ہے ۔ مرزا صاحب ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ سوچے کہ ہجر و فراق میں پڑے پڑے لوٹنے اور آہیں بھرنے سے بہتر یہ ہے کہ محبوبہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا جھٹکا کروالیں ۔ اب اُن کے نخرے ملاحظہ ہوں کہ انھوں نے مرزا صاحب کا جھٹکا کرنے سے بھی انکار کر دیا ۔ اس لئے دوسرے مصرع میں مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ بتائیے ہم کو بلا سبب ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مار رہے ہیں ویسا کیوں نہیں کرتے کہ ایک وار میں ہمارے آلام و مصائب کا سلسلہ منقطع کر دیں اب ہم سوچ رہے ہیں کہ جائیں تو کس کے پاس جائیں کیوں کہ ہم کو ان کی سفاکی سے اُمید تھی کہ یہ ہمارا کام تمام کر دیں گے مگر انھوں نے بھی قتل کرنے سے ... انکار کر دیا ۔

رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے   لے کے دل دل ستاں روانہ ہوا

مشکل الفاظ   دل ستاں = معشوق ۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ مرزا صاحب کا دل ایک عرصہ سے لاپتہ تھا اور دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ محبوب صاحب نے اُسے گمادیا ہے اور رہزنی کے مرتکب ہوئے ہیں چنانچہ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ صاحب یہ تو اچھی بھلی ڈاکہ زنی ہوئی کہ ایک شریف آدمی کا دل لے کر جناب روانہ ہو گئے اور ہم بار بار

کہہ رہے ہیں کہ قبلہ اسے واپس کر دیجئے مگر وہ ہیں کہ سُون گھسیٹے ہیں نہ ہوں کرتے ہیں نہ ہاں۔

غزل نمبر ۲۷

ہنوز محرمیٔ حسن کو ترستا ہوں　　کرے ہے ہر بُنِ مُو کام چشمِ بینا کا

محرمی = رُوشناسائی یا واقفیت۔ بُنِ مُو = مسام۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کا محبوب یا تو سلولائٹ کا بنا ہوا تھا یا اُن کے جسم کی چمک و دمک آئینہ کے مانند تھی۔ ایسی کہ اُس پر سے نگاہ پھسل پھسل جاتی تھی۔ خود مرزا صاحب کو ظاہر ہے کہ اُس کے اوپر بُری طرح لو الٹو تھے اور دن رات میں جب بھی وہ نظر آتا اُس پر نظریں گاڑ دیتے مگر اس کے باوجود سیری نہ ہوتی تھی وہ حقیقت حسن کی حقیقت اور ماہیت جاننا چاہتے تھے۔ یہی حال شوق دید میں اُن کے ہر بن مو کا تھا ہر وقت اس کو ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتا مگر اس کاوش کے باوجود مرزا صاحب یہ نہیں سمجھ پاتے تھے کہ حُسن کی حقیقت کیا ہے بات یہ تھی کہ جسم پر اگر نگاہ ٹکتی تو تھوڑی بہت حُسن کی حقیقت معلوم ہو جاتی مگر اس کے سارے جسم پر اس درجہ پھسلن تھی کہ نگاہ کے پاؤں نہیں جمنے پاتے تھے۔

غزل نمبر ۲۸

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا　　غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا۔

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ عشق کا معاملہ بھی عجیب ہے کہ کرے داڑھی والا اور پکڑا جائے مونچھوں والا چنانچہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ میرے محبوب کو میرے عشق پر پورا ا

اعتماد ہے اور اس نے خوب ٹھوک بجا کر مجھے دیکھ لیا ہے مگر

اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی

یہ غیر معمولی اعتماد اور اعتبار بھی میرے لیے ایک مصیبت بنا ہوا ہے اور بجائے اس سے فائدہ پہنچے کے مجھے نقصان پہنچ رہا ہے غیر یعنی رقیب کو کسی کے ذریعہ اطلاع ملی کہ محبوب کو مجھ پر غیر معمولی اعتماد ہے چنانچہ اس نے مجھے پریشان کرنے کے لیے ایک عجیب و غریب حرکت شروع کر دی اس سلسلہ میں جملۂ معترضہ کے طور پر یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ رقیب کو کبھی محبوب کی محبت کے سلسلہ میں آہ بھرنا تو بڑی چیز ہے ڈکار لینے کی بھی توفیق نہیں ہوئی تھی کیونکہ وہ مادرزاد بوالہوس واقع ہوا تھا دوسرے اُسے آہ کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی کیونکہ وہ تو ہر وقت ٹرپ کی دُگی کی طرح محترمہ کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ محبوب کی جدائی میں اگر کوئی آہ کرتا ہے تو وہ آپ کا تابعدار ہے جو مہینوں اور برسوں سے محبت کے روزے رکھ رہا ہے اور اس کی اطلاع محبوب کو بھی ہے کہ میں نے اپنی آہیں اس کے نام رجسٹر کرائی ہیں مگر اب محض مجھے پریشان کرنے کے لیے رقیب یہ حرکت کرتا ہے کہ محفل میں اچھا بھلا بیٹھا ہوا ہے کہ اچانک اسے میری اور محبوب کی محبت کا خیال آیا اور اس نے دونوں گھٹنوں میں منہ ڈال کر ایک زوردار آہ محبوب کی طرف رُخ کر کے کھینچ ماری۔ محبوب یہ سمجھتا ہے کہ آہ میں نے کی ہو گی اور اس پردہ نشیں سے سمجھا جاتا ہے اور مجھ پر بد تر بگڑتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ سوائے میرے کوئی دوسرا اتنی آہ آدائے داد آ نہیں بھر سکتا اور یہ تمام حرکتیں رقیب محض مجھ سے اُسے خفا اور بیزار کرنے کے لیے کرتا ہے۔

غزل نمبر ۲۹

نہ بندھے تشنگیٔ ذوق کے مضموں غالب　　گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

عشق کی پیاس تو ایسی پیاس ہوتی ہے کہ آپ پورے پورے سمندر بھی پی جایئے۔ مگر اس کی آگ بجھنے کا نام نہیں لیتی۔ مرزا صاحب کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ انہوں نے بغیر سوچے سمجھے عشق تو کر لیا تھا مگر اس چیز کو پیش نظر نہیں رکھا تھا کہ جو شخص آگ کھائے گا اُسے انگارے بھی برآمد کرنا ہوں گے۔ چنانچہ اُنھوں نے ذوق کی تشنگی پیدا کر کے مشق کرنا شروع کر دی تھی اور جب وہ جسم پر اس کی کمی محسوس کرتے تو اسے مصرعوں اور شعروں میں بڑے بڑے ڈھالا کرتے مگر اس کے بعد بھی جب تشنگی پورے طور پر ختم نہ ہوتی تو حد درجہ پریشان ہو جاتے اور مختلف ادویات استعمال کرتے ایک مرتبہ تشنگی ذوق کے سلسلہ میں خیال آیا کہ اچھا لاؤ یا اس سرے یا اُس سرے دریا کو ساحل باندھ کر دیکھوں شاید اس سے تکلیف دور ہو جائے مگر اس کے بعد بھی ان کے ذوق کی تشنگی جوں کی توں رہی اور کوئی افاقہ نہ ہوا۔

غزل نمبر ۳۰

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں　　اگر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

مرزا صاحب ظاہر ہے کہ جب پینے پر آتے تو جام پر جام چڑھا جاتے اسی لیے اپنے دور کے سخت بلانوش مشہور تھے۔ ایک دن آپ کو مخبروں نے اطلاع دی کہ محبوب نے کوئی بزم منعقد کی ہے جس میں ادھا دھند شراب چل رہی ہے اور بھانت بھانت کے پینے والوں کا مجمع ہے چنانچہ مرزا صاحب بھی پتہ پوچھتے پوچھتے پہنچ گئے اور ایک کونہ میں بیٹھ گئے جب شراب کا دور شروع ہوا تو تمام حاضرین

کو شراب تقسیم کی گئی۔ محبوب کی نظر آپ پر بھی پڑی اور اس نے آپ کے پیالے میں بھی تھوڑی سی شراب انڈیلنا چاہی مگر آپ سوچے کہ اس وقت پارسائی اور پرہیزگاری کا سکہ محبوب پر بٹھانے کا اچھا موقع ہے شاید اس حربے سے ہم اگر وہ ان کی طرف التفات کرنا شروع کردے چنانچہ جب وہ آپ کے شیشے میں شراب انڈیلنے لگا تو آپ نے از راہ تکلف کہا کہ حضرت! معاف کیجئے گا بندہ نے شراب سے توبہ کر لی ہے اور ایک عرصہ سے اللہ ہو۔ اللہ ہو ورد زبان ہے میں تو یوں ہی محفل میں حاضر ہوا تھا کہ چلو کچھ نہیں دو ایک گھڑی آپ کا دیدار نصیب ہو جائے گا۔ یہ سن کر محبوب نے ہاتھ روک لیا اور آگے بڑھ گیا۔ جب وہ آگے بڑھ گیا تو آپ کو خیال پیدا ہوا کہ یار یہ تو بڑی چوٹ ہو گئی ہم تو سمجھے تھے کہ جس طرح وہ دوسروں سے اصرار کر کے زبردستی پلا رہا ہے ہم سے بھی اصرار کرے گا مگر اس نے ہماری طرف کوئی توجہ ہی نہیں کی اور نہ اصرار ہی کیا اور نہ ہم نے لاکھ توبہ کی تھی پھر بھی اس کا تو بحیثیت میزبان فرض تھا کہ ہم سے اصرار کرتا اور ہم کو زبردستی پینے پر مجبور کرتا ہم کہاں کے گئے گزرے تھے جو اس اصرار کے بعد انکار کرتے اور پھر اس کی بات سے انکار کرتے جس پر جان دینے کے لیے ہر وقت کمر بستہ رہتے ہیں۔

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں ‏ جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

مشکل الفاظ۔ درماندگی = بیچارگی، پریشانی۔

آپ نے سنا ہوگا جس کے منہ میں چاول ہوتے ہیں وہ خوب چلا چلا کر باتیں کرتا ہے چنانچہ پیٹ بھرا انسان ہمیشہ ایران توران کی سوچتا ہے اور دولت مندوں اور پیٹ بھروں کی ہر نامعقول سے نامعقول بات کو بھی تدبر اور سوجھ بوجھ پر محمول کیا جاتا ہے

اور یہ واقعہ بھی ہے کہ جب انسان کو فراغت حاصل ہوتی ہے تو اس کی عقل بھی خوب کام کرتی ہے مگر ہم تب جانیں جب مفلسی اور کم مائیگی کے دور میں عقل کام کرے حقیقت یہ ہے کہ عقل و تدبر کا امتحان تو درماندگی کی حالت میں ہو سکتا ہے اس وقت اگر کوئی عقل و فراست اور تدبر کی باتیں کرے تو ہم اس کو صحیح معنوں میں مدبر مان سکتے ہیں اور نہ مفلسی میں جب کچھ پاس نہیں ہوتی اور گھر والی گھر کے خرچ کا مطالبہ کرتی ہے تو انسان کو مجبوراً لوگوں سے قرض لینا پڑتا ہے جس کا انجام آپ جانتے ہیں اپنے کفن تک سے ہاتھ دھونے کے ہوتے ہیں اور نہ جب رشتہ بے گرہ ہوتا ہے یعنی بیوی بچے کوئی نہیں ہوتے اور انسان کھلا کھلا پھرتا ہے اس وقت تو ناخن گرہ کشا ہوتا ہے یعنی کھلے سانڈ کی طرح جس کی ناند میں چاہتا ہے منہ ڈال دے۔

غزل نمبر ۳۱

بعد یک عمر ورع بار تو دیتا بارے ۔۔۔ کاش رضوان ہی در یار کا دربان ہوتا

مشکل الفاظ۔ یک عمر: زیادہ مدت۔ ورع: زہد و تقوی۔ رضوان: جنت کا دربان۔ بار دینا: داخل ہونے کی اجازت دینا۔

عام طور پر مشہور ہے کہ دنیا میں جو شخص عبادت اور ریاضت کرتا ہے اس کے بدلے میں اسے جنت بطور انعام مل دی جاتی ہے اور جنت میں اسے بلا روک ٹوک داخل کر لیا جاتا ہے۔ مرزا صاحب جو در یار کو جنت تصور کئے ہوئے تھے سوچے کہ لاؤ یہی طریقہ ہم بھی اختیار کریں اور بلا کسی محنت اور مشقت کے جنت مار دیں چنانچہ محبوب کے دروازے کی جبیں سائی کرتے رہے اور عمر کا بیشتر حصہ اس میں ضائع کر دیا میاں تنگ کر خاصے بوڑھے ہو گئے، مگر قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں

محبوب نے اپنے دروازے پر ایک بھوٹیا ملازم رکھ چھوڑا تھا جو ہر وقت بیٹھا اور چراس کے جاگتے رہو بھاگتے رہو یا علی حیدر کے نعرے لگاتا رہتا اور محبوب کی بارگاہ میں کسی کو دھسنے نہیں دیتا تھا مرزا صاحب کو یہ چیز بہت ناگوار گزری اور یہ سوچے کہ یار بڑی چوٹ ہوئی اور وقت کا وقت ضائع ہوا جتنے دنوں اُن کے دروازے پر ناک رگڑتے رہے اگر جانماز اور مصلے پر کر عبادت کی ہوتی تو اتنے عرصہ کی عبادت کے بعد جنّت کہیں نہیں گئی تھی اور جنّت کا دربان یعنی رضوان بھی جنّت کے داخلہ میں مزاحمت نہ کرتا حقیقت یہ ہے کہ اگر اُس پہرہ دار کی جگہ رضوان ہوتا تو یقیناً اُن کی محنت رائیگاں نہ ہوتی اور مرزا صاحب کو داخلہ کا پرمٹ مل جاتا۔

غزل نمبر ۳۲

ہوئی مدت کہ غالب مرگیا پر یاد آتا ہے   وہ ہر اک بات پہ کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

جب مرزا صاحب کو زندگی بھر مایوسیوں اور ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا تو ایک دن عاجز ہو کر یہ سوچے کہ اماں ہٹاؤ یہ دنیا چار دن کی ہے آج مرے اور کل دوسرا دن اگر عشق میں کامیاب بھی ہو جاتے تو اُس کامیابی میں کیا دھرا تھا اور کون سا تیر مار لیتے مقصد یہ کہ اگر محبوب سے ملاقات ہو بھی جاتی اور اس کا وصل نصیب بھی ہو جاتا تو ایک دن تو مرنا برحق تھا ہی دونوں مرتے اور پھر وہی صورت پیش آتی اور نتیجہ وہی نکلتا کیونکہ کامیابی چند روزہ ہوتی ہے اور ناکامیابی اس شعر میں صرف ایک وقتی چیز ہے۔ کہ غالب زندگی بھر یہ سوچتے سوچتے مر گئے کہ ہٹاؤ یہ سب عشق و محبت اور تحصیل وصول کس کام کی کیونکہ ایک روز مرنا برحق ہے۔

غزل نمبر ۴۳

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل   کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

ہر پاگل کو دیکھ کر لوگ خود بخود ہنس دیا کرتے ہیں کیونکہ اس سے عموناً ایسی باتیں ظہور میں آتی ہیں جو عام انسان نہیں کر سکتا مثلاً دیوار کے پاس کھڑا دیوار سے پوچھ رہا ہے کہئے قبلہ! مزاج تو بخیر ہے۔ بیوی کا بچے خیریت سے ہیں؟ اتنے دنوں تک آپ کہاں رہیں؟ ہم تو آپکی صورت کو ترس گئے وغیرہ وغیرہ یہی حال بلبل کا ہے کہ ایک ایک پھول کے پاس جاکر اس کی مزاج پرسی کرتی ہے خیریت پوچھتی ہے اور اس کا نام رکھا گیا ہے کہ بلبل کو پھول سے عشق ہے اور وہ پھول پہ جان چھڑکتی ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ کچھ عجب نہیں جو یہ پھول بلبل کی اسی حرکت پہ ہنستے ہوں ورنہ جہاں تک اس قسم کی حرکت کا تعلق ہے اس کو تو بہر حال ہر صاحب عقل حماقت اور جنون ہی پر محمول کرے گا۔ اسے بات میں بات وکالنا یا حسن تعلیل کہتے ہیں۔

سو بار بند عشق سے آزاد ہم ہوتے   پھر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

بند معنی قید۔ فراغ = آزادی

یہ شعر کسی عادی مجرم اور سزا یافتہ گرہ کٹ سے متاثر ہو کر کہا گیا ہے گرہ کٹ کو عموماً ایک دو بار جیل جانے کے بعد جیل جانے کا چسکا لگ جاتا ہے اور جیل میں چرچڑے کا ساگ اور مٹی ملے ہوئے آٹے کی روٹیاں کھانے کا ایسا شوق پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ پھر جیل کے باہر رہ کر مسرت محسوس نہیں کرتا جو جیل میں اُسے نصیب ہوتی ہے بات یہ ہے کہ وہاں کا پروگرام ہی غالباً ایسا دلچسپ ہوتا ہے کہ رگ پٹھے اس کے عادی ہو جاتے ہیں مثلاً سو کر اٹھے ہی تھے کہ جیلر کے دو ہاتھ تناول کرنا پڑے یہ غذا ابھی گدی سے حلق تک

نہیں اتری تھی کہ مُرغا بنا دیئے گئے۔ مرغا بننے سے فارغ ہوئے تھے کہ دو ڈھائی سیر اناج پیسنے کے لیے چکّی پیش کر دی گئی۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد کہا گیا کہ چل کر دو چار گھنٹے باندھ بٹو۔ غرض یہ ساری دلچسپیاں ایک عادی مجرم کے لیے ایسی ہی ہیں جو ایک جرائم پیشہ عاشق کی عادتوں سے ملتی جلتی ہیں مثلاً محبوب نے حکم دیا کہ حقّہ بھر۔ چلم تازہ کر بازار سے دو بنڈل بیڑی رقیب کے لیے خرید لا۔ وغیرہ وغیرہ چنانچہ یہ عشق و محبت کے گرفتاران کاموں کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں کہ اگر ان کو کوئی اس سے نجات دلانے کی کوشش کرے تو وہ کامیاب نہیں ہوتا اور وہ موقع ملتے ہی پھر وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اس شعر میں مرزا صاحب اسی کا رونا رو رہے ہیں کہ دل ہی جب سکون اور فراغ کا دشمن ہو تو ہم کیا کریں۔ ورنہ کئی بار عشق و محبت سے دستکش ہو کر ہو کر ہم نے دل کو سکون فراہم کرنے کی کوشش کی مگر یہ بھلا کب نچلے بیٹھنے والا تھا۔

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بد خو ہوگا　　نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

عام قاعدہ یہ ہے کہ ہر چیز کے خواص دیکھ کر اُس کی صلاحیتوں کا اندازہ کیا جاتا ہے مثلاً لکڑی کو دیکھ کر آپ کے دل میں یہی خیال ہوتا ہے کہ یہ یا تو جلانے کے کام بن سکتی ہے یا جلانے کے یا پھر جو چیزیں لکڑی سے تیار ہو سکتی ہیں وہ بنائی جا سکتی ہیں۔ لکڑی کو دیکھ کر کبھی آپ کے دل میں یہ خیال نہیں پیدا ہو سکتا کہ اس کا پلاؤ اچھا رہے گا یا اگر زردہ میں ڈال دی جائے تو مزا دے جائیگی یہی حال خس کا ہے کہ وہ آگ لگتے ہی جل جائے گی۔ پتھر یا لوہے کے متعلق آپ جلنے کا کوئی تصوّر ہی نہیں کر سکتے اس لیے کہ اُس میں جلنے کی کوئی صلاحیت ہی نہیں ہوتی اسی طرح جب مرزا صاحب نے اپنی انتہائی انکساری اور عجز کے ذریعہ اس کا پتہ لگا لیا کہ ان کا

محبوب بے حد غصہ ور ہے اور بات بات پر وہ ایک ہاتھ جڑ دیتا ہے اور اس کے بعد بھی پٹتے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتا تو مایوس ہو گئے چنانچہ اس شعر میں مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ہم نے تو اُن کی شکل دیکھتے ہی اس طرح اُن کے بدخو ہونے کا اندازہ کر لیا تھا جس طرح تنکے پر ہاتھ رکھتے ہی شعلۂ سوزاں کی تپش کا اندازہ کر لیا جاتا ہے۔

غزل نمبر

عذر درماندگی اے حسرت دل　　　نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا

مرزا صاحب نے اپنی جوانی میں جس الٹے تلّے سے جگر کا خون گریہ و نالہ کے سلسلہ میں استعمال کیا تھا اُس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ آخر عمر میں جگر میں ایک خون کا قطرہ بھی باقی نہ رہا اب جو بڑھاپے میں دل کی حسرت نے مطالبہ کیا کہ حضور ہم کو ہر چند دونوں وقت کا کھانا تو ملنا ہی چاہئے اور گریہ و نالہ کی نوا ایک آدھ بار ہم کو عنایت ہوں چونکہ گریہ و نالہ کے لیے خون کی ضرورت ہوتی ہے جس کا سارا سرمایہ بے تکان زمانہ شباب میں نداست نالوں کے بڑاو کاشت میں ختم کر چکے تھے اس لیے بڑھاپے میں حسرت دل سے معذرت خواہ ہیں کہ حضرت اس وقت تو سر دست ایک قطرۂ خون بھی باقی نہیں ورنہ حاضر کر دیتا۔ اس شعر میں اپنی مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ اماں۔ سوچا تھا دو ایک نالے حسب دستور قدیم سر کر دوں اور دل کا بار ہلکا کر لوں کہ اتنے میں خیال آیا کہ جگر کی شیشی تو خون سے بالکل خالی ہو چکی ہے اور اُس میں ایک قطرہ خون بھی باقی نہیں لہٰذا نالہ سر کیوں کر ہو گا۔

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی　　　گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

مرزا صاحب کی خوش فہمی ملاحظہ ہو کہ زندگی بھر تو شراب نوشی کی مگر اس کے بعد بھی

پورا پورا یقین ہے کہ مرنے کے بعد اگر ہم کہیں بھیجے گئے تو جنت ہی میں جائیں گے اور جنت میں جانے کی صورت میں ایک مصیبت اُن کے ساتھ اور لگی ہوئی ہے وہ یہ کہ اُن کے ساتھ ایک تُرپ کی ڈُگّی اُن کی محبوبہ ہے جن کی حویلی، بنگلہ یا مکان بہرحال وہ جہاں بھی رہتی ہو اُن مرزا صاحب کو خلد سے زیادہ حسین اور دلکش معلوم ہوتا ہے چنانچہ جب تک زندہ رہے منت منت پر دربان سے خوشامد درآمد کر کے داخلہ کا پرمٹ حاصل کرتے رہے اور اب فرماتے ہیں کہ واللہ اگر خلد میں کسی وقت تیرے گھر کا تصور آیا تو میں اگاڑی پچھاڑی تڑاؤں گا اور جنت و جنت کی خاک پروا نہ کروں گا اور وہاں سے سیدھا ناک کی سیدھ پر تیرے مکان کی طرف چل دوں گا مگر پھر ایک کھٹکا لگا ہوا ہے کہ جنت کے دروازے پر رضواں سے لپاڈُگّی بھی برحق ہے اس وجہ سے کہ اول تو رضوان جنت کے باہر کسی کو نکلنے نہ دے گا اس پر جھگڑے کی صورت پیدا ہوگی دوسرے اگر اس پر جھگڑا نہ ہوا تو اس بات پر تکرار کی نوبت آجائے گی کہ وہ حضرت جنت کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائیں گے اور ہم تیرے گھر کے سامنے جنت کی تمام رعنائیوں کو ہیچ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔ غرض یہ کہ ان کو مرنے کے بعد بھی کوئی آرام و سکون کی صورت نظر نہیں آتی۔

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ   سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

اس شعر میں مرزا صاحب اپنے بچپن کے واقعات کا ذکر فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب میں چھوٹا تھا اور مجنوں علیہ الرحمۃ نجد سے اپنے چچا کے ہمراہ تازہ بتازہ لیلیٰ کے عشق میں مبتلا ہو کر بغرض علاج آگرہ آئے ہوئے تھے تو ایک دن میں اپنے محلہ کے لڑکوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیل رہا تھا کہ اُدھر سے وہ مجنوں انا لیلیٰ

کے نعرے بلند کرتے ایک لنگوٹی باندھے گذر رہے اُنھیں دیکھ کر میں نے زمین سے ایک عدد پتھر اٹھا کر اُن کے رسید کرنا چاہا مگر اس کے بعد ہی فوراً خیال آیا کہ استاد! اگر اُس نے اپنی دیوانگی میں جوابی حملہ کر دیا تو کیا ہوگا اس شعر کے دوسرے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مرزا صاحب کو شروع ہی سے مجنوں پر ایک طرح کی افضلیت حاصل تھی مقصد یہ کہ مجنوں تو اچھے خاصے سن بلوغ کو پہنچ کر لیلے کے عشق میں مبتلا ہوئے تھے مگر ہم تو مادر زاد عشق تھا لے کر دنیا میں پیدا ہوئے ہیں۔

غزل نمبر

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ   اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ یوں تو والدین اور عام محلہ والوں کا یہ خیال ہے کہ ہم بُری صحبت میں رہ کر تباہ ہوئے اور زندگی بھر ہم نے گھر کی ذمہ داری محسوس نہیں کی مگر واقعہ یہ ہے کہ اس میں کل پچاس فیصدی ہماری غلطی تھی البتہ پچاس فیصدی کی ذمہ داری کاتبِ تقدیر پر عاید ہوتی ہے جس نے بجائے نہاں کے مٹرے ہوئے نرکل کے قلم سے ہماری تقدیر لکھ دی کہ ہم آپ پہ عاشق ہو کر والدین اور محلہ والوں کی نظروں میں غیر ذمہ دار قرار پائے۔

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا   بات کرتے کہ لبِ تشنۂ تقریر بھی تھا

بجلی کوندنا یعنی معشوق کا تھوڑی دیر کے لیے سامنے آنا۔ لبِ تشنہ یعنی آرزومند لب کا لفظ تقدیر کی رعایت سے لایا گیا ہے۔ زائد ہے۔

مرزا صاحب محبوب کے تصور میں حسبِ دستور قدیم چپکی مارے بیٹھے تھے اور ارنی ارنی کی طرح ہیں مار رہے تھے کہ اتنے میں دان کا محبوب آغا خاں کے گھوڑے سے پٹیا

صبا رفتاری سے ان کی آنکھوں کے سامنے سے گذر گیا۔ اب مرزا صاحب کو شکوہ ہے کہ کم از کم (محبوب) اس کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ میرے دل کی آرزو پوری کرنے کی غرض سے تھوڑی دیر کے لیے اگر اپنا گھوڑا روک لیتا تو کیا حرج تھا کہ کچھ ہم محبوب کو لٹاتے کچھ وہ ہمیں لٹاتا اور آسانی سے معاملات طے ہو جاتے مگر وہ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جیسے محبوب کی دید کے پیاسے تھے ویسے پیاسے کے پیاسے رہ گئے۔

یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی　　گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا

مشکل الفاظ۔ تعزیر: سزا۔

اس شعر میں مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ابھی وہ تو حضرت یوسف کو بھی اپنے حسن کے مقابلہ میں ہیچ سمجھتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ اتنے حسین ہیں کہ حضرت یوسف کا حسن بھی ان کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ ابتدائے آفرینش سے اب تک حضرت یوسف کا حسن ایک قسم کا پیمانہ بنا ہوا ہے اور اسی کسوٹی پر لوگ حسن کو پرکھتے ہیں جو بہت زیادہ حسین ہوتا ہے اُسے حضرت یوسف کا ہم پلہ کہہ دیتے ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ایک دن مجھ سے اور اُن سے (محبوب) حسن و جمال کے سلسلہ میں باتیں ہو رہی تھیں لہٰذا اُن کے حسن کی قصیدہ خوانی کرتے کرتے اور اُن کی خوشامد میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ملاتے میرے منہ سے غیر شعوری طور پر نکل گیا کہ قسم آپ کے سر عزیز کی آپ تو حضرت یوسف کی طرح حسین ہیں مگر خیریت یہ ہوئی کہ باتوں کی جھک میں انھوں نے حضرت یوسف کے لفظ کی گرفت نہ کی ورنہ شاید وہ

مجھ پر ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ ہی ٹھوک دیتے پھر جو مجھ پر گذرتی وہ گذرتی۔ دوسرے مصرع میں کہتے ہیں اور اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ بھئی سچ پوچھو تو میں لائق تعزیر ضرور تھا جو حماقت سے یہ گھٹیا بات میرے منہ سے نکل گئی۔

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا؟

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ صاحب ہمارا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ ہم چوبیس گھنٹے میں پچیس گھنٹے کفنائے دفنائے شہادت کا مرتبہ حاصل کرنے کے لیے بے چین رہتے ہیں ایک دن ایسا ہوا کہ وہ محبوب تیر کمان اور ترکش لیے ہمارے قریب سے گزر رہا تھا کہ ہم بلا دودھ دودھ بخشوائے لبیک کر اس کی خدمت میں حاضر ہو لیے اور کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے اس کا رستہ روک کر کھڑے ہو گئے مگر اس کی خوش نصیبی یا بد نصیبی ملاحظہ ہو کہ وہ پھر بھی ہمارے قریب نہیں آیا۔ اس پر ھ کر میں نے ایک فرشی سلام عرض کرتے ہوئے کہا کہ حضرت زحمت تو ضرور ہو گی عرض یہ کرنا ہے کہ اک ذرا تھوڑا سا مجھے قتل کر دیجیے۔ حسن اتفاق سے اُس وقت انکے گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے۔ بڑی محبت سے بولے بھئی اس وقت ہمارے پاس خنجر وخجر موجود نہیں ہے ہم کو گھر جانے اور چھری اور کلہاڑا لانے میں زحمت ہو گی لہذا یہ کام کسی دوسرے وقت کے لیے ملتوی رکھئے۔ اس پر میں نے کہا اچھا تو ایک تیر ہی مار دیجیے۔ یہ سُن کر وہ تیار تو ہو گئے مگر جب ترکش دیکھا تو اتفاق سے اُس میں کوئی تیر بھی فالتو نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے معذرت کی۔ ان کی اس معذرت پر مرزا کو تاؤ آگیا اور کہنے لگے آپ تیرانداز تو بڑے بنتے ہیں مگر حالت یہ ہے کہ خالی ترکش باندھے پھرتے ہیں اچھا کوئی بات نہیں مگر اتنا تو آپ بہر حال کر ہی سکتے ہیں کہ ایک نگاہ غلط انداز ہی جھاڑ

دیجئے۔ اسی سے ہمارا مطلب پورا ہو جائے گا اور روز روز کی جھک جھک ختم ہو جائے گی۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق　　آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

قتل کے مجرمین جب عدالت میں پیش ہوتے ہیں اور ۳۰۲ کے مقدمہ میں ان کو پولیس والے پکڑ کر عدالت میں لاتے ہیں تو سب سے پہلے کسی عینی گواہ کی ضرورت ہوتی ہے جس کا بیان سننے کے بعد مجسٹریٹ ملزم کو پھانسی کا حکم دیتا ہے اس شعر میں مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میدان حشر میں ہم کو داورِ محشر کے سامنے جب بحیثیت مجرم کے پیش کیا جائے گا اور کراماً کاتبین ہمارا اعمالنامہ پیش کریں گے کہ حضور! ان کو سقر و ہاویہ میں بھیج دیا جائے تو یہ خاکسار بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے ہوئے ہے فوراً عدالت سے عرض کرے گا کہ حضرت! نہ جانے کن لوگوں کے گناہ کبیرہ ان فرشتوں نے میرے اعمالنامہ میں رکھے ہیں بات یہ ہے کہ میرے ان کے تعلقات ہمیشہ سے کشیدہ چلے آرہے ہیں اس لیے انھوں نے مجھ پر دھونس ڈالنا شروع کی کہ تو سہی جو تجھے داورِ محشر سے کہہ کر جہنم واصل نہ کریں چنانچہ اس لاگ ڈانٹ پر مجھے پکڑ کر آپ کی خدمت میں جھوٹا اعمالنامہ داخل کر رہے ہیں اگر یہ سچے ہیں تو ان سے کہا جائے کہ کوئی عینی گواہ پیش کریں ورنہ اگر تابعدار کو حکم ہو تو وہ عینی گواہ حاضر کرے۔

غزل نمبر ۳۷

لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا　　زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا

اس شعر میں مرزا صاحب اپنی بہادری اور جیالے پن کا ذکر فرماتے ہیں

اور کہتے ہیں کہ کچھ لوگ ایسے تھے جو آپ پر یعنی محبوب پر عاشق ہو گئے اور معشوق کی دید کی تشنگی کی تاب نہ لا کر انتقال فرما گئے اور دوسروں کے لیے ایک جگہ چھوڑ گئے مگر مجھ سے بغیر سحری کے تیس ۳۰ روزے رکھوا کر دیکھ لیجیے کہ بندہ چوں تک بھی کرتا ہے۔ چنانچہ اس درجہ کہنہ مشق عاشق ہوں کہ اگرچہ دیدارِ معشوق کو ایک زمانہ گزر گیا ہے مگر ابھی تک دیدار کی تشنگی کے عالم میں تڑپتا ہوا ہوں یقین مانیے کہ میری حالت ان پیاسے مرنے والوں کے خشک ہونٹوں کے مانند ہے جو عشق میں دانا پانی چھوڑ کر جان دے چکے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ میں نہایت خاموشی کے ساتھ بغیر آہ بھرے زندہ ہوں اور دوسرے مر گئے۔ ان میں اور مجھ میں بس یہی فرق ہے کہ وہ حد درجہ بزدل تھے اور میں ذرا جرأت واقع ہوا ہوں اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو بندہ کی حیثیت عاشقوں کے سالار کی سی ہے جس کے آستانے پہ عشاق اپنا سر جھکاتے ہیں اور جسے انھوں نے اچھا خاصا ایک قوالی زندہ مزار بنا رکھا ہے۔

غزل نمبر ۳۰

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

مرزا صاحب کا دوست یعنی معشوق بھی چنگیز خاں اور ہلاکو خاں سے کم ظالم نہ تھا کہتے ہیں کہ وہ اپنے تمام عاشقوں کی بلا تخصیص مذہب و ملت پٹائی کرتا تھا۔ بیوفائی اس کی سرشت میں تھی اور تشدد کے جملہ حقوق اس نے اپنے نام محفوظ کر لیے تھے۔ ان حالات میں اس سے کسی قسم کی ہمدردی کی توقع رکھنا یا دوستی کی امید کرنا ایک فضول سی بات ہے وہ ہر ایک پر

ہاتھ صاف کرتا رہتا ہے مگر مرزا صاحب کے معاملہ میں وہ اس ٹیپائی میں بھی تھوڑا بہت فرق رکھتا تھا مقصد یہ کہ اگر وہ دوسروں پر چھٹانک ڈیڑھ چھٹانک مظالم کرتا تو ان پر سیر سوا سیر سے کم ظلم نہ ڈھاتا ان حالات میں مرزا صاحب کہتے ہیں کہ اصل مظالم کا نشانہ تو میں تھا بقیہ حضرات تو محض ہاتھ رواں کرنے کی غرض سے پیٹے جاتے تھے گویا مظالم کاری ہر سل دوسروں پہ ہوتا ہے اور اصل ظلم مرزا صاحب پہ لگائی جاتی ہے۔

چھوڑا مہ نخشب کی طرح دست قضا نے خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا

اس شعر میں تلمیح ہے جس میں حکیم ابن عطا جو مقنع کے نام سے مشہور ہے اور اپنے زمانہ کا بڑا سائنس داں تھا ترکستان کے ایک مشہور شہر نخشب میں رہتا تھا اُس نے ایک مصنوعی چاند بنا رکھا تھا جو مسلسل دو ماہ تک روشن رہتا اور پھر کنوئیں میں ڈوب رہتا تھا اُس کی روشنی بارہ میل کے علاقہ میں پھیلی رہتی تھی کچھ عرصہ کے بعد یہ چاند خود بخود گدھے کے سر کا سینگ ہو گیا۔ اس شعر میں دست قضا سے مطلب قدرت کا ہاتھ ہے۔

اب مرزا صاحب کا انکشاف ملاحظہ ہو فرماتے ہیں کہ یہ جو سورج سویرے سے شام تک ہماری آپ کی دنیا میں لشکارتا ہے اس کی روشنی جناب کے محبوب کے چہرہ سے کشید کی گئی ہے اور وہ بھی پوری کشید نہیں ہو سکی بلکہ ابھی آدھی ہی کشید ہوئی تھی کہ قضا و قدر کے انسپکٹر (دست قضا) نے یہ کہہ کر کام رکوا دیا کہ اس کشید میں میل ہے اور حکیم ابن عطا پر مقدمہ قائم کرا دیا کہ چونکہ ان کے بنائے ہوئے بلب میں ناقص قسم کا شیشہ

استعمال ہوا ہے لہٰذا بلب کے پھٹ جانے کا امکان ہے۔ جس سے ہلاکت واقع ہوسکتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ وہ تو کہیئے کہ دست قضا کی سمجھ میں آگیا ورنہ بڑی مصیبت پیش آتی اور یہ خورشید جو ہنوز اُس کی ضیا پاشی کے برابر ضیا کا متحمل نہ ہو پایا تھا اُس کا کام چھٹروا دیا گیا۔ اب خدا جانے مرزا صاحب کا محبوب کون سے آفتاب باللہ کی قسم کا تھا کہ اگر اس کی پوری روشنی خورشید لے لیتا تو دنیا پر ایک مصیبت نازل ہو جاتی۔

غزل نمبر ۳۹

مشہد عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا کس قدر یارب ہلاک حسرت پابوس ہے

مشکل معنی۔ مشہد ۔ جائے شہادت ۔ قتل گاہ۔

یہ واقعہ ہے کہ زمین میں جیسی کھاد ڈالتے ہیں ویسی پیداوار ہوتی ہے اس شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ محبوب نے مرزا صاحب کو اُس زمانہ میں قتل کر دیا تھا جس زمانہ میں ماشاء اللہ ان کے ہاتھ پاؤں اچھے تھے جسم میں بے پناہ خون تھا۔ چنانچہ جس مقام پر مرزا صاحب قتل ہوئے اُس سے کوسوں دور تک آپ کے خون سے زمین لالہ زار بنی رہی اور اُس خون کی کھاد پا کر ایک حنا (مہندی) کا درخت اُگ آیا بات یہ ہے کہ مرزا صاحب کی محبوبہ چونکہ مرزا صاحب کو قتل کرتے وقت اتفاق سے ہاتھوں میں مہندی لگائے ہوئے تھیں اس لیے غالباً اُن کی مہندی کا رنگ مرزا صاحب کے خون میں جو زمین پر بہا شامل ہو گیا لہٰذا بجائے کسی دوسرے درخت کے قتل گاہ کے گرد و پیش مہندی کے پودے نظر آنے لگے۔ لہٰذا مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ حضور والا آپ کو اس کا اندازہ

نہیں کہ یہ جو مہندی کے درخت یہاں سے وہاں تک نظر آرہے ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ دراصل شہر عشق یعنی مرزا صاحب کی آرزوئے پابوسی ہے ورنہ مذاق نہیں جو اتنا لمبا چوڑا حنا کا باغ آپ ہی آپ اُگ آئے۔ غرض کہ مرنے کے بعد بھی مرزا صاحب نے بھیس بدل کر معشوق کا پنڈ نہیں چھوڑا اگر اُس کے قدموں سے چھٹے تو بعد میں مہندی کے درخت کی شکل میں ظاہر ہو لیے تاکہ اگر کبھی اُن کا دل پاؤں میں مہندی لگانے کو چاہے اور وہ اُس مہندی کے باغ سے جو مرزا صاحب اُگائے بیٹھے ہیں مہندی تُڑوا کر پاؤں میں لگائے تو اس جانے مرزا صاحب قدم بوسی کا شرف حاصل کریں۔

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ مارتے اُس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

بہر حال یہ تو آپ سب حضرات کو پہلے ہی سے معلوم ہے کہ معشوق ہر عاشق سے بھنّایا رہتا ہے مرزا صاحب کا معشوق جو عام معشوقوں سے کچھ زیادہ غصہ ور تھا وہ مرزا صاحب کا دشمن تو تھا ہی مرزا صاحب کے نوکروں چاکروں کو بھی حد درجہ نفرت کی نظر سے دیکھتا تھا مرزا صاحب کا معاملہ کچھ ایسا تھا کہ بقول اُن کے "گالیاں کھاکے بے مزہ نہ ہوا" باوجود اتنی ڈانٹ ڈپٹ کے یہ اُسے نامہ و پیام بھیجتے رہتے تھے ایک دن انھوں نے اپنے کسی نوکر کو قاصد بنا کر محبوب کی خدمت میں بھیجا ہوگا اُس (محبوب) نے قاصد کو دیکھتے ہی نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ اُس کی گردن مار ہی تو دی اور وہ بیچارہ جو نہ خان میں تھا اور نہ خان کے اونٹوں میں بلا سبب جام شہادت نوش کر گیا جب مرزا صاحب کو اطلاع ہوئی کہ قاصد صاحب جام شہادت نوش فرما کر جاں بحق ہوئے ہیں تو آپ قاصد کی شہادت پر اشک فرمانا شروع کر دیتے ہیں اور ہاتھ مل کر کہتے ہیں کہ ہائے قاصد کی جگہ ہم خود

کیوں نہ ہوئے جو ان کے ہاتھ سے قتل ہو کر شہادت کا مرتبہ حاصل کر لیتے چنانچہ
آپ ان کو لکھ رہے ہیں کہ حضرت یہ آپ نے کس غیر مستحق کو قتل کر دیا۔ آپ کے
ہاتھ سے قتل ہونے کا حق سب سے زیادہ اس تابعدار کو پہنچتا تھا یہ سعادت قاصد کو
کیوں نصیب ہوئی

غزل نمبر ۱۴

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں — شایانِ دستِ بازوئے قاتل نہیں رہا

شایاں = لائق قابل۔

جو لوگ بکرے بازی کے قائل ہیں اور قربانی کے لیے بکرا خریدنے نکلتے
ہیں اُن کا عام دستور یہ ہے کہ وہ خریدنے سے پہلے کبھی بکرے کا منھ کھول کر اُس
کے دانت گنتے ہیں اور کبھی کان دیکھتے ہیں کہ کہیں سے کٹا پھٹا تو نہیں ہے۔ اگر
بکرے کا ایک آدھ دانت کم ہوا تو شرعی نقطۂ نظر سے اس کو قربانی کے لائق نہیں سمجھتے
کچھ لوگ اس کی رانیں اور سینہ ٹٹول ٹٹول کر دیکھتے ہیں اور بیچنے والے سے دریافت
کرتے ہیں کہ بکرے کو کوئی بیماری تو نہیں ہے اگر کوئی عاشق جھاڑ قسم کا بکرا ابھی جو
اپنی محبوبہ کی یاد میں سوکھتے سوکھتے کچالو کا تنکا بن کر رہ گیا ہے تو اس کی طرف نگاہ اٹھا کر
نہیں دیکھتے اور اس کی قیمت تک نہیں دریافت کرتے مرزا صاحب جن عاشق
کا اس شعر میں ذکر کر رہے ہیں اس کا حال بھی کچھ اسی بکرے جیسا ہے جس کی جوانی
میں تو بڑی آؤ بھگت ہوتی مگر جب وہ چھینکے پر ٹانگنے کے قابل رہ گیا تو اُسے قصائی
کے ہاتھ بازار میں بیچنے آئے چنانچہ اُس کے کسی نے دام نہیں لگائے اب یہ عاشق
جھاڑ صاحب اپنے دل سے فرماتے ہیں کہ "بھئی معشوق کی رائے میں اب میں قربانی

کے قابل بھی نہیں رہا اور اب وہ مجھے اِس درجہ نحیف اور کمزور دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ میں اس قابل بھی نہیں ہوں کہ اُن کے ہاتھ سے قتل ہونے کی سعادت حاصل کر دں۔ لہٰذا اب جان دینے کی کوئی اور صورت اختیار کرنا چاہیئے یا تو اب تیل وِیل پی کر جان دے دی جائے یا کوئی ایسی ویسی چیز کھالی جائے کہ جس کے کھاتے ہی اِس کشمکشِ حیات سے نجات حاصل ہو جائے کیوں کہ اب تو وہ ہاتھ سے قتل کرنا بھی توہین تصور کرتے ہیں۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار   لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

یہ شعر غالباً مرزا صاحب نے یا تو اپنی بے روزگاری کے زمانہ میں کہا تھا یا شادی بیاہ اور بال بچے ہو جانے کے بعد کہا تھا جب ان کی گھر والی اُن پر صد ہا مظالم ڈھا رہی تھی ایک طرف مسماۃ کی طرح طرح کی فرمائشیں ہوں گی اور دوسری طرف بچوں کی تعلیم و تربیت اور گھر کے روزمرہ کے اخراجات کا سوال ہو گا جو چوبیسو گھنٹے ان کے لیے ایک مصیبت کا سبب بنا ہوا ہو گا لیکن مرزا صاحب چونکہ محبوب پر بری طرح مرتے ہیں اور اُس کے تیرِ نظر کا شکار ہیں اس لئے باوجود ان تمام پریشانیوں کے محبوب کے خیال سے غافل نہیں رہتے اور ہر وقت ان کی یاد کا پہاڑا دل میں پڑھا کرتے ہیں۔

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ   جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

صاحب! انسان جوانی میں خواہ کتنا ہی گاماں پہلوان قسم کا انسان کیوں نہ ہو، لیکن یہ قبلہ عشق صاحب ایک ایسی دق کی بیماری واقع ہوئے ہیں کہ اِن کی ایذا رسانی اور تشدد سے انسان بالکل چُس چُسا کر اچھے بھلے چُسے ہوئے آم کی

شکل اختیار کر لیتا ہے چنانچہ عشق کرنے کے بعد اس کی تکلیفیں اٹھاتے اٹھاتے اُن کا بھی یہی حال ہو گیا ہے کہ چار قدم چلنا دشوار ہے۔ سانس پھولنے لگتی ہے اور نفس دم نہیں لیتا اس شعر میں مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ واللہ آپ کی ایذا رسانیوں اور بے پناہ مظالم سے میں بالکل نہیں ڈرتا۔ مجبوری یہ آن پڑی ہے کہ اب نہ تو جسم میں خون باقی ہے اور نہ وہ پہلے سے ہاتھ پاؤں ہیں۔ جن کے بل بوتے پر آپ کے ہر قسم کے تشدد برداشت کر لیا کرتا تھا بلکہ آپ کو یاد ہو گا کہ آپ نے جوانی میں کیسے کیسے تشدد ڈھائے مگر یہ ناچیز اُنھیں برداشت کرتا رہا مگر اب ضعف اور ناتوانی نے اس قابل نہیں رکھا ہے کہ میں آپ کے ادنیٰ مظالم کا متحمل ہو سکوں۔

غزل نمبر ۴۲

ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا

نیرنگ ۔ جادو۔

میخانہ ۔ استعارہ ہے عام مکان سے

چشمک ۔ اشارہ۔

ساغر ۔ پیالہ جو گردش میں رہتا ہے۔ یہاں مُراد گردش سے ہے۔

شعر کے معنے سمجھنے سے پہلے یہ چیز تو بہر حال ہم آپ سب ہی جانتے ہیں کہ جناب مجنوں کچھ عجیب و غریب قسم کے انسان تھے جو لیلیٰ کے چشم و ابرو کے اشارہ پر ناچتے رہتے تھے۔ آدمی کیا تھے ایک اچھے بھلے ردسی راکٹ قسم کی چیز تھے کہ جس طرف کا بٹن دبایئے اُدھر گھوم جائیں گے ورنہ یوں جہاں پر ہیں وہیں پر ڈٹے رہیں گے مقصد یہ کہ ان کی صحرا نوردی جسے آپ گردش کہہ سکتے ہیں ان کا کوئی خود اختیاری فعل

نہ تھا بلکہ لیلیٰ کے نہایت فدوی قسم کے عاشقوں میں سے تھے۔ وہ حکم دیتی کہ بازار سے دو پیسے کی ہری مرچیں لے آؤ تو یہ جی سرکار کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوتے اور لپک کر مرچیں لا دیتے۔ وہ کہتی کہ فرصت کے اوقات میں چھلنی میں پانی بھر دیجا کرے سویرے سے شام تک وہی کام کیا کرتے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ یہی حال کائنات عالم کا ہے کہ ہر چیز قدرت کے اشارہ پہ کام کرتی ہے اور کائنات عالم کا ذرہ ذرہ ایک ساغر یعنی انسان کے مانند قضا و قدر کے اشارہ پہ کام کرتا ہے۔ غرض کہ ذرہ سے آفتاب تک ہر چیز عشق حقیقی میں سرشار ہے اور ہر چیز کی فنا و بقا بڑے میاں (اللہ میاں) کے ہاتھ میں ہے۔ اس شعر کا اصل مطلب یہ ہے کہ کائنات عالم کا ذرہ ذرہ اُسی طرح اللہ تعالیٰ کے حکم پر حرکت میں آتا ہے جس طرح جناب مجنوں علیہ الرحمٰن لیلیٰ کے اشارہ پہ اِدھر سے اُدھر تشریف گردش بنے رہتے تھے۔

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

میں اور اک آفت کا ٹکڑا۔ یعنی دونوں میں جنگ جاری ہے۔

ہر انسان بہر حال آرام و سکون کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ دل پھینک حضرات جو جوانی میں ہر اچھی صورت کو دیکھ کر اُچک پھاندنا شروع کر دیتے ہیں اُن کی شادی بھی اگر ان کی محبوبہ کے ساتھ کر دی جائے جس کے پیچھے وہ فضول کے لئے زبین کا گز بنے رہتے ہیں۔ وہ ایک سال کے بعد ان کے سارے کس بل نکل جاتے ہیں اور وہ آخر میں سوالیہ جملہ کا نشان بن کر رہ جاتے ہیں یہ شعر غالبا مرزا صاحب نے بوڑھاپے میں کہا ہے جب ان کے کس بل نکل چکے ہیں اور حاصل

محبت صرف دل ہی دل رہ گیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ قبلہ یقین مانیئے کہ میں فطرتاً نہایت عافیت پسند قسم کا انسان ہوں اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں مگر کیا عرض کیا جائے کہ قدرت نے میرے ساتھ وہ ستم ظریفی کی ہے کہ دل کی جگہ کچالو کے تنکا جیسے ہاتھ پیروں پر دل کسی وحشی کا لگا دیا ہے مجھے ایک منٹ بیٹھنے نہیں دیتا اور اچک پھاند مچائے رہتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مجھ سے اور دل سے رات دن مہابھارت کا سلسلہ جاری ہے اور مجھ میں اور دل آوارہ میں اچھی بھلی لتیاڈگی ہوتی رہتی ہے۔

غزل نمبر ۴۳

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا   بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

جس طرح بقرعید کا بکرا خریدنے سے پہلے ہر فرد اُس کے دانت، آنکھ، ناک، کان غرض جسم کے تمام اعضا ٹٹول کر دیکھ لیتا ہے کہ کہیں سے کٹا پٹا یا ناقص تو نہیں ہے اسی طرح ہر انسان عاشق ہونے سے پہلے معشوق کے حدود اربع کا معائنہ کرلیتا ہے کہ آنکھیں بڑی ہیں یا چھوٹی ناک چپٹی ہے یا ستواں۔ منہ کا دہانہ بڑا ہے یا چھوٹا رنگ کھلتا ہوا ہے یا سیاہ چنانچہ پورا پورا جائزہ لینے کے بعد مرزا صاحب بھی ایک محبوب کا ہدف بن لیے۔ ظاہر ہے کہ مرزا صاحب جیسے اور ہزاروں لوگ تھے جو ایسے محبوب پر مرنے والی طبیعت لے کر آئے تھے انھوں نے جو مرزا صاحب کی محبوبہ کو دیکھا تو وہ بھی عاشق ہو لیے۔ مرزا صاحب سے غلطی یہ ہوئی کہ شروع شروع میں تو اُنھوں نے محبوب کو دل کے پردہ میں چھپائے رکھا اور کسی کو ہوا تک نہ ہونے دی اُس کے بعد ان کا دل چاہا کہ لوگ ان کے جمالیاتی ذوق کی تعریف

کریں چنانچہ آپ نے اپنی جادو بیانی سے اُن کے حسن کا پروپگنڈہ کرنا شروع کر دیا اور بزم میں آکر ہر جدھو کو کے سامنے ان کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملانا شروع کر دیتے اور اُٹھتے گن کے سامنے لے آتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک تو کریلا اور پھر نیم چڑھا یعنی ایک تو وہ یوں ہی قتال جہاں تھیں پھر مرزا صاحب نے ان کی تعریف میں جو فوت بیان صرف کی تھی وہ مرزا صاحب کے لیے سم قاتل بن گئی اور ان کے دوست احباب جو جناب کے رازداں بنے ہوئے تھے بلکہ نکاح کے موقع پر جنھوں نے عجب نہیں جو گواہوں اور وکیلوں کے فرائض انجام دیے ہوں وہی ان کی محبوبہ پر عاشق ہو گئے اب جب یہ خطرناک صورت پیدا ہوئی تو مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ بڑی چوک ہوئی کاش میں نے ان کی بے پناہ تعریف نہ کی ہوتی اور ان کے حسن و جمال کی مدح میں زمین و آسمان کے قلابے نہ ملائے ہوتے۔ اگر یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا تو تمام ہمنشین اور دوست احباب رقابت پر نہ اُتر آتے۔

مے وہ کیوں بہت پیتے بزم غیر میں یارب آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا

ایک دن بزم محبوب میں شراب کا دور چل رہا تھا کسی صاحب نے مرزا صاحب کو اطلاع کر دی کہ قبلہ آپ یہاں بیٹھے ہیں اور بزم غیر میں بڑے زور بندھے ہوئے ہیں۔ رقم رقم کے عاشق جمع ہیں اور شراب کے دور چل رہے ہیں۔ آپ کے محبوب صاحب بھی ڈٹ ڈٹ کر پی رہے ہیں اور دوسروں کو بھی پلا رہے ہیں یہ سن کر مرزا صاحب بھی داخل حسنات ہو لیے اور بزم رقیب میں پہنچکر ایک گوشہ میں سوالیہ جملہ کا نشان بنکر بیٹھ گئے۔ مرزا صاحب یہ سوچ کر آئے تھے کہ چلو وہاں چل کر اظہار تمنا کا موقع مل جائیگا اور تھوڑی بہت اُن کے لب شیریں کی حلاوت وصل ہو جائے گی ان اُمیدوں

اور آرزوؤں کے ساتھ جب مرزا صاحب بزم میں پہنچے تو ان کی بدنصیبی ملاحظہ
ہو کہ مرزا صاحب کی صورت دیکھ کر محبوب کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ آؤ دیکھیں
تو کہ یہ جو لوگ بے پناہ پی جاتے ہیں اُن پر کیا گذرتی ہے اور وہ کیوں غش ہو ہو کر
موریوں میں اِدھر اُدھر گرنا شروع ہو جاتے ہیں چنانچہ وہ اس کا تجربہ اپنی ذات پر
کرنے کے لیے تیار ہو گئے اور انھوں نے محض تحقیق کی غرض سے تابڑ توڑ دو چار
خُم چڑھا لیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فوراً ہی نشے میں لگے ایران توران کی ہانکنے۔ ایسی
حالت میں ظاہر ہے کہ مرزا صاحب جو آرزوؤں اور تمنا کے پوٹ کے پوٹ لے کر
گئے تھے اِن سے کون پوچھتا کہ حضور آپ کیا چاہتے ہیں۔ مرزا صاحب کی ساری اُمیدیں
اور آرزوئیں خاک میں مل کر رہ گئیں اور مرزا صاحب سر پکڑ کر رہ گئے۔ اس
شعر میں اسی کا شکوہ کیا گیا ہے۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے ؏ عرش سے اُدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

منظر۔ جھروکا

مرزا صاحب ہمیشہ عام شعراء سے ہٹ کر ایک نئی بات سوچتے تھے اور
عشق کے پہاڑوں پر جب چڑھنا شروع کرتے تو ہمیشہ ایک محقق کی حیثیت سے یہ
چاہتے کہ عشق کی جو آخری چوٹی ہے اُسے دریافت کرلیں اور اس کے بعد اُس سے
بھی کوئی بلند مقام پر پہنچ کر اپنے رہنے کی صورت پیدا کرلیں اس کے معنے یہ ہوئے
کہ موجودہ دور کے پہاڑ پر چڑھنے والوں کے حوصلوں سے کہیں زیادہ بلند حوصلے جناب
مرزا صاحب کے تھے ایک طرف اگر ٹینزنگ اور ہلاری نے دنیا کی بلند ترین
(پہاڑی) چوٹی یعنی کوہ ایورسٹ دریافت کرکے وہاں اپنا جھنڈا نصب

کراتے ہیں تو دوسری طرف مرزا صاحب نے بحیثیت محقق عشق کے کوہ ایورسٹ کی چوٹی پر بیٹھے بیٹھے اپنے مراقبے میں دریافت کرلی۔ مگر وہاں پہنچکر بھی آپ کا شوق ارتقا ختم نہیں ہوا بلکہ آپ کو فکر ہوئی کہ اگر اس سے زیادہ کوئی اونچا مقام ہوتا تو وہاں چل کر مستقل سکونت اختیار کرلیتے۔ مطلب یہ ہے کہ فنا فی اللہ کے اعلیٰ مقام پر پہنچنے کے بعد بھی آپ کے حوصلے پست نہیں ہوئے اور اس سے زیادہ بلند مقام پر پہنچنے کا شوق اُن کے دل میں باقی رہا۔

دے وہ جسقدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے   بارِ آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

مثل مشہور ہے کہ دودھری گائے کی دو لاتیں بھلی۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ایک دن جو محبوب کے کوچہ میں سیر اگذر ہوا اور میں نے ان کے دروازہ کے پہرہ دار کو بغور دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ جان پہچان کا آدمی ہے یہ دیکھکر مرزا صاحب کو بہت خوشی ہوئی اور دل میں کہنے لگے کہ لو صاحب کام بن گیا اور خوب ہوا کہ معشوق کے دروازے پر جو ہمارا پہرہ دار ہے وہ ہمارا جاننے والا ہے اب ہمارے لیے اس بات کا پورا پورا موقع ہے کہ اُن کے گھر میں جہاں چاہیں بلا روک ٹوک پہنچ جائیں اور محبوب سے مل کر اُس کے حسن و جمال کے مزے لوٹیں مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ مسئلہ کی تاریک پہلو پر بھی نظر گئی اور سوچے کہ یہ تو سب ٹھیک ہے مگر باوجود شناسا ہونے کے اگر پہاڑی بے اعتنائی برتی اور ذلت آمیز فقرے استعمال کیے تو اُنھیں ساتھ صبر کے برداشت کرنا ہوگا چنانچہ فرماتے ہیں کہ اگر ایسا ہوا تو پہلے تو ہنس ہنس کر ہم ٹالتے رہیں گے مثلاً اگر اُس نے کہا

کہ اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ ورنہ خون پانی ایک کردوں گا تو میں ہنس کر کہونگا کہ واللہ آپ بڑے مذاقیہ معلوم ہوتے ہیں کیسا سنجیدہ اور شستہ مذاق فرما رہے ہیں اگر اُس نے گردن میں ہاتھ دیا تو کہیں گے واللہ تم ہمیں نکال نہیں رہے ہو بچپن کی ہاتھا پائی اور دوستی کی یاد تازہ کر رہے ہو۔ غرض اس بہانے ہمارا مطلب پورا ہو جائے گا۔

تا کرے نہ غمّاز کا کر لیا ہے دشمن کو دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زباں اپنا

مرزا صاحب ہمیشہ سے آدمی ذہین اور چالاک واقع ہوئے تھے چنانچہ ایک جگہ کھڑے محبوب کے تغافل اور بے التفاتی کی شکایت کر رہے تھے کہ اتفاق سے ان کا رقیب بھی کھڑے ہو کر ان کی باتیں سننے لگا۔ اتنے میں مرزا صاحب کی نظر تماشائیوں میں جو رقیب پر پڑی تو ان کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ سوچے کہ یار یہ تو بہت برا ہوا اب رقیب محبوب کے پاس جا کر چغلی کھائے گا اور کہے گا کہ حضرت! ایک طرف تو آپ کے عاشق زار صاحب جگہ جگہ مجمع اکٹھا کر کے آپ کی شکائتیں کرتے پھرتے ہیں اور آپ کو بدنام و رسوا کرتے ہیں اور دوسری طرف آپ کی محبت کا دم بھرتے ہیں آخر آپ اُنھیں روکتیں کیوں نہیں۔ یہ خیال آتے ہی مرزا صاحب نے رقیب کو شکوہ شکایت میں شریک کر لیا تاکہ اس کے یہ ان کی شکایت کی اُسے ہمت نہ پڑے۔ خیال ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے اُسے اس طرح پٹایا ہوگا اور اُس سے کہا ہوگا کہ حضرت آپ بھی تو میری طرح اُن پر جان چھڑکتے ہیں بھلا بتائیے وفاداری میں کونسا دقیقہ آپ نے نہیں اُٹھا رکھا پھر اُس روز آپ پر جو تشدد اور مظالم انھوں نے توڑے واللہ اُسے دیکھ کر تو مجھے رونا آگیا۔ کیوں صاحب میں غلط کہتا ہوں؟ غرض اس قسم کی باتیں کر کے

اُنھوں نے رقیب کو شکوہ شکایت میں اپنا شریک بنا لیا ہوگا۔ تا کہ رقیب کی ہمت نہ پڑے کہ وہ ان کے محبوب سے شکایت کرے۔

غزل نمبر ۴۴

سُرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

یہاں۔ خریدار سے مراد غالب کی تصانیف پڑھنے والا ہے۔

یعنی کیا ایک قسم کا سُرمہ ہے جو بصارت کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ اس سے دماغ کو بھی تقویت پہنچتی ہے اور عجب نہیں جو اسے زخم میں لگایا جائے تو زخم بھی اچھا ہو جائے یہ واقعہ ہے کہ مرزا کا دیوان کیا ایک اچھی بھلی سُرمہ دانی ہے جس کی ایک معمولی سی سلائی آنکھوں میں پھیرنے سے آنکھوں کی بینائی بڑھ جاتی ہے اور ساتوں طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ مرزا صاحب کا یہ سُرمہ یعنی ان کی تصانیف جن لوگوں نے پڑھ لیں ان کے علم و ادب کی آنکھوں میں خاصی بینائی پیدا ہو گئی اور خریدار مرزا صاحب کے احسان کا پلندہ سر پر لادے لادے نظر آنے لگا۔ مرزا صاحب اگرچہ مالی اعتبار سے آخر عمر میں بے حد پریشان تھے مگر دل گردہ ملاحظہ ہو کہ اپنے اس سُرمہ کی قیمت نہیں لیتے تھے اور آنکھوں میں مفت سلائی لگا کر خریدار پر احسانِ عظیم فرماتے تھے جیسا کہ اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میرے کلام کے پڑھنے سے نہ صرف یہ کہ نورِ بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ دماغ میں جتنے مہمل اور لغو خیالات ہوتے ہیں وہ بھی دور ہو جاتے ہیں۔ پھر لطف یہ کہ بقدل شخصے مزہ نہ ہو تو دام واپس غرض کہ مرزا صاحب کا یہ سُرمہ مقویٔ بصارت، مقوی دماغ، مقوی دل اور نہ جانے کون کون سی "زائل شدہ" طاقتوں کو واپس لانے والا تھا۔

غزل نمبر ۴۵

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے   شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

مرزا صاحب کا معاملہ کچھ ایسا تھا کہ بیچارے زندگی بھر شراب پیتے رہے اور جہاں تک نماز روزہ کا تعلق ہے اُن سے مرزا صاحب ہمیشہ کوسوں دور رہے مگر مرزا صاحب کو اس کا پورا پورا احساس تھا کہ استاد جو کام دکھا رہے ہو وہ کچھ اچھا نہیں ہے لہٰذا عاقبت کی خیر مناؤ۔ جب دل میں یہ خیال ہوتا تو خاموش ہو کر دل ہی دل میں شرمندہ ہو لیتے گویا فرماتے تھے اور روتے تھے کہ دیکھئے اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہونے کے بعد جیسا کچھ نہ گفتہ بہ حال نہ ہو تھوڑا ہے مگر یہ بھی سوچتے تھے کہ اسکی رحمت سے بعید نہیں جو اپنے نیک بندوں کی نیکیوں کے صدقے میں ان کو بھی بخش دے چنانچہ فرماتے ہیں کہ میں قصوروار ضرور ہوں اور میں نے غلطیاں بھی کی ہیں لہٰذا میرے لیے دو ہی صورتیں ہیں یا تو غلطیوں کے سلسلہ میں کوئی عذر پیش کروں یا شرمندگی اور سکوت اختیار کر لوں اور جب داور محشر کے سامنے جاؤں تو بجائے سوالات کا جواب دینے کے خوف و ہراس سے کانپتا رہوں اور عرق انفعال سے اپنے سارے جسم کو شرابور کر لوں کیا عجب ہے کہ تعالیٰ مجرم سمجھ کر بخشش پا جاؤں۔

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے   پُرگل خیال زخم سے دامن نگاہ کا

آپ نے ایسے بکرے کم دیکھے ہوں گے جو اُچکتے پھاندتے قصائی کی خدمت میں اپنے آپ کو پیش کر دیں کہ لو مجھے ذبح کر دو اسی طرح آپ کو ایسے لوگ بھی کم ملیں گے۔ جو یہ کہہ کر اپنے آقا کی خدمت میں حاضر ہو جائیں کہ مار مجھے خدا مارے مرزا صاحب معشوق کے جور و تشدد کا پورا تصور لے کر اس کے سامنے جا رہے ہیں۔

اور دل میں پہلے سے خیال ہے کہ سب سے پہلے وہ مرغا بنائے گا اُس کے بعد اُٹھا بیٹھی کرائے گا اُس کے بعد جسم کے رونگٹے نچوائے گا اور آخر میں بے پناہ مار مارے گا جس سے سارا جسم لہولہان ہو جائیگا اور جسم پر سُرخ سُرخ گلاب کے پھولوں کی طرح چھینٹے پڑ جائیں گے چنانچہ فرماتے ہیں کہ ذرا ما بدولت کی بہادری ملاحظہ ہو کہ کتنا ہنستا کھیلتا مقتل میں حاضر ہونے کا فخر حاصل کر رہا ہوں گویا تکان دور کرنے کی خاطر سیر و تفریح کی غرض سے جا رہا ہوں اور اپنے اذیت پہنچانے والے زخموں کو اپنی نگاہ کے دامن میں گل سمجھ کر لیے جا رہا ہوں۔

غزل نمبر ۴۲

جور سے باز آئیں پر باز آئیں کیا کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

مرزا صاحب کا معشوق بھی کیا کیا دھوبی پاٹے کا داؤں جانتا تھا جس کے سبب کسی نہ کسی عنوان سے مرزا صاحب کو اُس کے سامنے چت ہی ہونا پڑتا تھا چنانچہ اس نے پہلے مرزا صاحب پر جور و تشدد اور مظالم کی کوئی حد نہ اٹھا رکھی اس کے بعد اُس نے ایک دم ہاتھ روک لیا۔ اُس کی اس حرکت سے مرزا صاحب اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ شاید اس نے رحم کھا کر اُن کی جان بخشی کی ہے مگر یہ صورت نہیں تھی بلکہ ہاتھ روک کر اُس نے ایک نیا پینترا بدلا تھا مقصد یہ کہ پہلے تو وہ مرزا صاحب کو لڑ دے کر مارتا تھا اور ان سے کبھی کبھی مل لیتا تھا مگر اس کے بعد اُس نے گھر میں لنڈی لگالی اور گھر سے باہر نکلنا بند کر دیا گویا مرزا صاحب سے مستقل پردہ کر لیا جب اُسے ایک زمانہ پردہ نشینی کرتے گزر گیا۔ تو مرزا صاحب کو فکر ہوئی کہ لاکھ ظلم و تشدد کرتا تھا پھر بھی اُس کا دیدار تو ہو جاتا تھا مگر اب تو اُس نے ملنا جلنا

ترک کر گئے، ایک نئی مصیبت ان پر توڑ رکھی ہے اور اب وہ بیٹھا نہ مرد ے کو مار رہا ہے یہ واقعہ ہے کہ جو لوگ ایذا پسند ہوتے ہیں وہ جور و تشدد سے باز نہیں آتے مرزا صاحب نے جب اُس سے درخواست کی اور کہا کہ ظاہر ہوا ہے نور اللہ کے تو اس نے کہلا بھیجا۔ ہم نے جو آپ پر بیجا تشدد کیے ہیں اُن سے ایسے اس درجہ خجل اور شرمندہ ہوں کہ منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوں لہذا ہمیں معاف کیجئے اور کوئی دوسرا گھر دیکھئے۔

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

مرزا صاحب پر اُن کے معشوق نے کچھ ایسے مظالم کیے تھے کہ مرزا صاحب کی مٹی پٹی گم تھی اور وہ غموں سے نجات پانے کے لیے بارگاہ ایزدی میں رو رو کر اور گڑ گڑا گڑگڑا کر دعا مانگتے رہتے تھے کہ اے پاک بے نیاز بدھو تھوکو سبھوں کو موت ہے ایک ہم ہی کو موت کیوں نہیں آجاتی چنانچہ ایک دن ان کی دعا قبول ہو گئی اور وہ دن آیا جب اُنھیں تمام کلفتوں سے نجات حاصل ہو گئی مرزا صاحب کا خیال یہ تھا اگر مرنے کے بعد مصائب کا سلسلہ ختم ہو جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کیونکہ انھوں نے دنیا میں جو کچھ کیا تھا وہ اعمالنامہ بھی اُن کے ساتھ تھا لہذا اب مرنے کے بعد مرزا صاحب کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ دیکھئے زندگی بھر تو محبوب کے جور و ستم اٹھانے میں لگے رہے جس کے سبب نیک اعمال کا دفتر بالکل صاف ہے اور اب یہاں دوزخ کی بلائیں ہاتھ باندھے کھڑی ہیں۔ ملا اب کس منہ سے اللہ میاں کو اپنا اعمالنامہ دکھائیں کیونکہ وہ تو بالکل

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا اور پڑی یہ بھی سر پہ مرے اللہ نئی

غزل نمبر ۲۸

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل   جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ پارسائی کا

اگر آپ کبھی جمنا ندی کی باڑھ دیکھنے گئے ہوں گے تو آپ نے دیکھا ہو گا کہ جب جمنا میں سیلاب آتا ہے تو ساحل پر بسنے والوں کی جان و مال پر بن آتی ہے۔ مرزا صاحب کے زمانہ میں مٹیا بُرج سے لے کر دور دور تک لاکھوں کی تعداد میں لوگ پریشان نظر آتے تھے اس لیے کہ وہ بیچارے جمنا کے ساحل کے قریب رہتے تھے اور طغیانی کے مصائب سے انہیں دوچار ہونا پڑتا تھا چنانچہ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ یہی حال میرے معشوق کا ہے جو ایک اچھی بھلی دریائے جمنا کی طغیانی کی شکل میں اُن پر مسلط ہوا ہے اور ان کی عقل و خرد اور سوجھ بوجھ کے ساحل کو ہر وقت خطرہ میں ڈالے ہوئے ہے مرزا صاحب کا کہنا ہے کہ لاکھوں آدمی دنیا میں ایسے ہیں جو اپنی پارسائی کا دعویٰ کرتے اور اللہ ہو اللہ ہو میں زندگی گزارنے میں لگے رہتے ہیں مگر یہ سارے دعوے اس وقت باطل ہو جاتے ہیں جب کوئی حسین لڑکی کسی مولوی کے مصلے کے پاس سے گذر جاتی ہے۔ اُس وقت مولوی صاحب کو استغفر اللہ نعوذ باللہ کہتے ہوئے اُسے دیکھنا ہی پڑتا ہے

غزل ۲۹

ہوئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ   یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا؟

مرزا صاحب کا محبوب محلہ مچھلی والان وغیرہ میں کہیں مقیم تھا مرزا صاحب محلہ کالے صاحب میں رہتے تھے لہٰذا ایک نامہ بر کے ذریعہ اُس سے خط و کتابت فرماتے رہتے تھے، مرزا صاحب کے ساتھ ایک بڑی مصیبت یہ تھی کہ وہ نہایت اختلاجی قسم کے واقع ہوئے تھے چنانچہ آپ نے محبوب کے نام خط لکھا اور قاصد کو گلی نام اور گھر کا نمبر بتا کر رخصت کیا۔ مگر آدمی چونکہ اختلاجی واقع ہوئے تھے لہٰذا قاصد کو روانہ کرنے کے بعد سوچے کہ کہیں نامہ بر

سے سوال و جواب کا سلسلہ نہ شروع ہو جائے اور نامہ بر اس کے سوالوں کا جواب نہ دے سکے یہ سوچ کر کونے سے لکڑی اٹھائی اور نامہ بر کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ رستہ چلتے جاتے تھے اور دل ہی دل میں نامہ بر سے گفتگو بھی فرماتے جاتے تھے اور اُسے ہدایتیں بھی کرتے جاتے تھے کہ بھیا! اگر محبوب خط پانے کے بعد زبانی یہ سوال کرے تو اس کا یہ جواب دینا۔ اگر یوں کہے تو اس طرح کہنا اور اگر دیکھنا کہ خط پا کر خوش ہے اور بغلیں بجا رہا ہے تو اپنی جوانی کے صدقے میں ہماری سفارش کر دینا کہ حضور رات رات بھر تڑپتے ہیں سسکیاں آہیں اور پھیکے نالے براڈکاسٹ کرتے رہتے ہیں اور وفاداری کا تو یہ عالم ہے کہ ہمہ وقت آپ کے انتظار میں سوالیہ جملہ کا نشان بنے رہتے ہیں غرض عالم خیال میں یہ باتیں کرتے کرتے ... مرزا صاحب کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ محبوب کے دروازے پر پہنچ گئے ہیں چنانچہ آپ کے ہوش و حواس باختہ ہو جاتے ہیں اور سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے اور حیرت سے پوچھنے لگتے ہیں کہ یا اللہ اب ہم خط کو اُن تک کیسے پہنچائیں غرض یہ شعر کیا ہے وہ چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں مرزا صاحب کی داستان عشق ہے جسے اُنھوں نے دو مصرعوں کے چاولوں پر لکھ رکھا ہے۔

موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے ‌ ‌ ‌ ‌ آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

موجِ خون سے مراد = آنات تکالیف۔ سر سے گذرنا = حد سے گزرنا۔

وہ جو کہتے تھیں ہیں کہ مار کھائیں اور تماشہ گھُس کر دیکھیں ویسا ہی حال کچھ عاشق کا ہوتا ہے کہ ایک نہیں معشوق لاکھ تشدد کرے مگر عاشق صاحب ڈٹے رہتے ہیں اور دل میں فرماتے رہتے ہیں کہ یار تجھے خدا مارے مرزا صاحب نے

جب عشق کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو آدمی چونکہ دور اندیش تھے لہٰذا اس کے عواقب پر پہلے ہی سے ان کی نگاہیں تھیں ایک دن مرزا صاحب محبوب کے در پر یہ سوچ کر جا ڈٹے کہ اب ایک نہیں چاہے مصیبتوں کے پہاڑ کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں مگر وہ ہٹنے کے نہیں یہ واقعہ ہے کہ جو جو مظالم معشوق نے اُن پر ڈھا رکھے تھے اگر اسی نوعیت کے مظالم کسی بوالہوس یا اناڑی قسم کے عاشق پر توڑے جاتے تو وہ کب کا بھاگ چکا ہوتا اور دوبارہ محبوب کے کوچہ کا رُخ نہ کرتا۔ مگر یہ چونکہ نہایت عجیب الطرفین قسم کے عاشقوں میں تھے اور اپنے آپ کو عشق کرنے سے پہلے خوب ٹھوک بجا کر دیکھ چکے تھے اس لیے دوسرے مصرعہ میں فرماتے ہیں کہ ایک نہیں لاکھ آفتیں ہم پر گذریں اور جور و تشدد حد سے گزر جائے مگر ہم آستان یار سے اُٹھ کر بھاگنے والے نہیں۔

غزل نمبر ۴۷

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

ایک دیہاتی عورت ایک دن اپنی ایک ہمسائی کے پاس گئی اور کہنے لگی کہ اب ہمارے میاں ہم سے بالکل محبت نہیں کرتے۔ ہمسائی نے پوچھا کیسے؟ بولی کہ آج پورا ایک مہینہ ہونے آتا ہے جب ہم کو اس نے ایک چھڑی تک نہیں چھوائی۔ گویا شوہر کی مار پیٹ کو اس نے اپنی محبت کا پیمانہ قرار دے رکھا تھا جو لوگ ایذا پسند ہوتے ہیں ان کا خاصہ ہے کہ اُن کی محبت صرف اس وقت حرکت میں آتی ہے جب وہ خوب اچھی طرح پٹ لیتے ہیں یا کسی کو جس سے وہ محبت کرتے ہیں پیٹ لیتے ہیں۔

مرزا صاحب بھی کچھ ایسی ہی آزاد پسند یعنی سیڈسٹ ذہنیت لیکر آئے تھے

چنانچہ جب اُن کے محبوب نے ان پر جور و تشدد کا سلسلہ بند کر دیا تو نہ جانے اُن کے رگ دشمنوں نے اُن سے کیا شکایت کی کہ اُنھیں اپنے محبوب سے یہ ایک عام شکایت ہوگئی کہ عنایت تو گئی اب وہ ہفتے عشرہ جو تھوڑا بہت تشدد کرلیا کرتے تھے اُس سے بھی انھوں نے دست کشی اختیار کرلی ہے اب بتلایئے کہ یہ بے مروتی اور بے تعلقی نہیں تو اور کیا ہے بھلا کوئی پٹنے والے کی طرف سے اتنی غفلت بھی برتتا ہے کہ ہفتوں ہو جائیں ایک چھڑی بھی جسم پر نہ چھوائے اور جسم فاقہ کیے پڑا رہے۔

غزل نمبر ۴۹

رابطہ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار　　سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا

رابطہ = تعلق۔ شیرازۂ وحشت = ایسی ڈوری جس میں وحشت زدہ اجزا منسلک ہوں۔ سبزہ بیگانہ = خود رو گھاس۔

یہ تو بہرحال آپ کو معلوم ہی ہے کہ بہار کا خمیرہ مروارید صبا اور سبزہ سے مل کر تیار ہوتا ہے اور یہی اُس کے اجزائے ترکیبی ہیں اور اُسی سے بہار مزہ پر آتی ہے۔ ان سب میں ایک چیز اور مشترک ہوتی ہے اور وہ ہے وحشت۔ اسی طرح وحشت کا مادہ اللحم بیگانگی، آوارگی اور نا آشنائی سے مل کر تیار ہوتا ہے۔ گویا بہار کا خمیرہ ایک ہی شیرازۂ وحشت ہے۔ جو بہار کو وحشت سے ملاتا ہے۔ وحشت میں ظاہر ہے کہ انسان وہ اُچک پھاند اور بھاگ دوڑ مچاتا ہے کہ خدا کی پناہ کبھی پورب پچھم بھاگ رہا ہے تو کبھی اتر دکن اور کبھی اگر جھک سوار ہوئی تو لگا ایک ہی جگہ پر اُٹھا بیٹھی کرنے بہرحال

وحشت زدہ اجزا کو نہ کوئی قرار ہے اور نہ ثبات بس تحقیق کر ثابت ہوا کہ چوں کہ اجزائے بہار کو ثبات حاصل نہیں لہذا ان سب کے مجموعے یعنی بہار کو بھی ثبات نہیں یہ شعر کیا ہے دراصل علم ریاضی کا ایک کلیہ ہے جسے مرزا صاحب نے شعر کی صورت میں حل کیا ہے یا کسی دواخانہ کا ایک نسخہ ہے جس کے اجزائے ترکیبی مرزا صاحب نے اِس شعر میں بیان کیے ہیں۔

غزل نمبر ۵

مسی آلودہ ہے مہر نوازش نامہ ظاہر ہے کہ داغ آرزوئے بوسہ دیتا ہے پیام اسکا

وہ جو کہتے ہیں کہ خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر۔ وہی مصرع اس پورے شعر پر صادق آتا ہے۔ مرزا صاحب نے اپنے محبوب کو کوئی خط بھیجا تھا جس کے جواب میں محبوب نے دو پیسے کا لفافہ بازار سے منگوایا (اس زمانہ میں لفافہ کی قیمت دو پیسے تھی) اُسے بند کیا اور اس پر اپنی مہر لگادی اور ڈاک میں ڈلوادیا جب خط ڈاکیہ نے پکار کر مرزا صاحب کو دیا اور کہا کہ مرزا صاحب اپنا خط لے جایئے تو لفافہ پاتے ہی بغیر کھولے مرزا صاحب اُس خط کا مضمون سمجھ گئے کہ اس کے اندر کیا لکھا ہوگا؟ اب مرزا صاحب کی سوجھ بوجھ ملاحظہ ہو۔ کہ آپ نے لنگر کی کسر کے اس سوال کو کس طرح حل کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ لفافہ پر جو دو گول گول ڈاک خانہ کی مہریں پڑی ہیں وہ ڈاک خانہ والوں کی لگائی ہوئی مہریں نہیں ہیں بلکہ خود محبوب کے لبوں کی لگائی ہوئی مہریں ہیں اور ان کا مقصد دو داغ ہیں جو مہر کے نشان کی طرح گول گول ہوتے ہیں اور چونکہ وہ مہریں سیاہ ہیں اور مسی کا رنگ بھی سیاہ ہوتا ہے اس لیے مرزا صاحب نے ان کی

سیاہی سے یہ نتیجہ نکالا کہ ہو نہ ہو جس وقت یہ جواب لکھا گیا تھا اُس وقت اُن کے لبوں پر مستی کی دھڑی جمی ہوئی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے لبوں سے مُہر کا کام لے کر داغ کے وہ نشان بنا دیے ہیں تاکہ لفافہ دیکھتے ہی مرزا صاحب کے اوسان خطا ہو جائیں اور وہ سمجھ لیں کہ جو بوسے اُنھوں نے طلب کیے ہیں وہ تو بہرحال ملنے سے رہے البتہ بوسوں کی آرزو کا داغ اُنھیں ضرور دیا جائیگا جس کا مرزا صاحب کو انتظار کرنا چاہیے۔ مختصر یہ کہ مرزا صاحب کو زندگی بھر اُن کا محبوب سخت غلط فہمیوں میں مبتلا کیے رہا اور یہ بھی ایسے بہادر تھے کہ اپنی جگہ پر ڈٹے رہے اور اپنے جادہ سے پیچھے نہ ہٹے۔

غزل نمبر ۱۵

شکوۂ یارانِ غبارِ دل میں پنہاں کر دیا غالبؔ ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

اس شعر میں گنج سے مراد مخالفین کے سب دشنام ہیں۔ یاراں سے مراد رقیب۔ گنج خزانہ کو کہتے ہیں اور ایسے چاقو کو بھی کہتے ہیں جس میں کئی پھل ہوں۔

مرزا صاحب ایک سیدھے سادھے بامروت قسم کے انسان تھے اُن کا رقیب ان پر طرح طرح کے جور و تشدد کیا کرتا تھا مگر مرزا صاحب نے رفع شر کی غرض سے کبھی اُس سے لتاڑ دگی نہیں کی۔ دوسرے رقیب کو چونکہ محبوب سے قرابت قریبہ حاصل تھی لہٰذا انھیں یہ بھی خوف تھا کہ اگر انھوں نے اُس سے ہاتھا پائی کی تو وہ محبوب کو اطلاع کر دیگا جس سے سارا بنا بنایا کھیل بگڑ کر رہ جائے گا اس لیے مرزا صاحب

نے نہایت ہی امن پسندانہ رویہ اختیار کیا اور بجائے اس پر جوابی حملے کے انھوں نے اپنی تمام شکایتیں جو انھیں رقیب سے تھیں اپنے سینے میں دفن رکھیں نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا دل ایک اچھا بھلا شکوہ شکایتوں کا خزانہ بنکر رہ گیا درحقیقت مرزا صاحب کی شرافت اسی کی متقاضی بھی تھی ورنہ مخالفین کے سب دشنام اور ٹیڑھی بکڑی باتوں کا جواب مار پیٹ اور لاٹھی لوگوں سے بھی دیا جا سکتا تھا۔

غزل نمبر ۵۲

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے　　رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

خدا جانے مرزا صاحب نے کس پہلو ان صفت محبوب سے دل لگا رکھا تھا کہ جسے دیکھ کر ان کی روح لرز جاتی تھی اور دوسروں کا بھی اسے دیکھ کر پتا پانی ہوتا تھا چنانچہ فرماتے ہیں کہ جس وقت وہ باغ میں سیر کرنے کی غرض سے آتی ہیں تو اس وقت کوؤں کی قاؤں قاؤں۔ پپیہے کی پی کہاں اور بلبل کی چہلیں ختم ہو جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ دوسرے حسین جو بغرض تفریح اس باغ میں ہوتے ہیں ان کی بھی سٹی بٹی اس طرح گم ہو جاتی ہے کہ باغ بھر میں سناٹا ہو جاتا ہے اور پورا باغ دلی کا محلہ قبرستان معلوم ہونے لگتا ہے۔ واقعہ ہے کہ ہر بار قوخان سے انسان گھبراتا ہے اور لوگ اس سے خائف رہتے ہیں۔

(ردیف ب)

ردیف بائے موحدہ

غزل نمبرا

جو ہوا غرقۂ مئے بخت رسا رکھتا ہے مسر سے گذرے پہ بھی ہے بال ہما موج شراب

غرقہ۔ غرق۔ بخت رسا۔ خوش بختی۔ سر سے گذرنا۔ حد سے گذرنا۔

ہما۔ ایک پرندہ جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہڈی کو کھا کر زندہ رہتا ہے جس آدمی کے سر پر اُس کا سایہ پڑ جاتا ہے وہ بادشاہ ہو جاتا ہے۔

مرزا صاحب اگرچہ تنگدستی کی زندگی گذارتے تھے مگر جس وقت شراب پی کر مراقبہ میں بیٹھتے تھے تو ایسی مسرت محسوس کرتے تھے کہ کیا بڑے سے بڑا بادشاہ محسوس کرتا ہوگا۔ شراب پینے کے بعد نشہ کے عالم میں ظاہر ہے کہ انسان قصر بکنگھم اور تاج محل کی ملکیت کا بھی دعویٰ کر سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ یہ سب اُسی کے بنوائے ہوئے ہیں اُسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بادشاہ بنا دیا گیا ہے۔ نہ دنیا کے آلام و مصائب سے اُسے واسطہ رہتا ہے اور نہ اُسے کوئی دوسری پریشانی کا خیال رہتا ہے وہ ایک عجیب طرح کی فارغ البالی محسوس کرنے لگتا ہے جو بادشاہوں تک کو نصیب نہیں ہوتی چنانچہ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ کبھی اگر آپ دنیا کے تمام تفکرات سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ شراب کا ایک گھونٹ پی لیجئے اور اُس کے نشے میں غین ہو جائیے یقین مانئے کہ اس کے بعد ساری مصیبتیں کافور ہو جائیں گی۔ مے نوشی جب حد سے گذر جاتی ہے تو ایک

اچھا بھلا انسان کسی موری میں پڑا نظر آتا ہے۔ اُسے کوئی ذمہ داری محسوس نہیں ہوتی گویا موجِ شراب ہما کے سایہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس شعر کا بظاہر مطلب تو یہی ہے اب اگر کسی مولوی سے آپ اس شعر کا مطلب دریافت کریں تو وہ تصوف کی ساری اصطلاحات اس شعر پر صرف کر دے گا اور گھما پھرا کر اس کا مطلب عشقِ الٰہی کی طرف موڑ دے گا۔ نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی

ردیف (ت)

غزل نمبر ۱

لکھتا ہوں اسد سوزشِ دل سے سخنِ گرم — تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

سخنِ گرم۔ مزیدار اور پُر تاثیر سرشار جو سوزِ دل کا نتیجہ ہیں۔ حرف پہ انگلی رکھنا۔ عیب نکالنا۔

مرزا صاحب کے اشعار کا ایک ایک مصرع الکٹرک راڈ یعنی بجلی کی سلاخ کے مانند تھا ایسا کہ اگر کوئی اناڑی بھولے سے اُس پر انگلی رکھ دے تو اُسے چھٹی کا دودھ یاد آجائے چنانچہ فرماتے ہیں کہ بھائی میرے دل میں جب عشق کی مڑوڑیں ہوتی ہیں اور اُس سے اشعار نکلنا شروع ہوتے ہیں تو وہ گرم گرم تنور کی نکلی ہوئی روٹی کے مانند ہوتے ہیں، تاکہ جو صاحبان ان پر حرف گیری یا اعتراض کرنے کی ہمت کریں وہ منہ کی کھائیں۔ مقصد یہ کہ میرے اشعار اعتراض سے بالا ہوتے ہیں۔

غزل نمبر ۲

جگر کو مرے عشقِ خوں نابہ مشرب — لکھے ہے خداوندِ نعمت سلامت

خداوند نعمت : مالک یا آقا۔

آپ نے غور کیا ہوگا کہ جو لوگ عشق کرتے ہیں اُن کے دل گردے ہمارے آپ کے جیسے نہیں ہوا کرتے کیونکہ عشق کا معاملہ ایسا ہے کہ اس میں کھیرا نون نو وقت اور دانا گھاس ایک وقت بھی نہیں ملتا۔ اس کے لیے اچھے قوی اور مضبوط ہاتھ پاؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جسم میں اگر خاصہ خون ہو تو ہاتھ پیروں میں دہ خرگوش کے خون کی طرح گردش کرتا ہے اور چونکہ عشق کی گاڑی صرف خون ہی سے چلتی ہے اور عشق کی موٹر کار کو موبل آئل پہنچانے والے جناب جگر صاحب قبلہ ہوتے ہیں (جگر مراد آبادی مرحوم نہیں) لہٰذا عشق اگر کسی سے دھونس کھاتا ہے تو وہ یا تو معشوق کی ذات ہے یا پھر لے دے کر جگر ہے جو اپنا خون پلا پلا کر عشق کو زندہ رکھتا ہے اسی لئے مرزا صاحب کا عشق بھی جب کبھی خون کے مطالبہ کے سلسلہ میں کوئی عرض داشت جگر کو بھیجتا تھا تو کبھو رفیق غمخوار یا خداوند نعمت کے خطاب سے مخاطب کرتا تھا۔

غزل نمبر ۱۳۳

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ یار لائے مرے بالیں پہ اُسے پر کس وقت

آنکھیں مند گئیں = آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔

مرزا صاحب کے انتقال کا وقت قریب ہے۔ میر مہدی مجروح نے ان کی محبوبہ کو اطلاع کر دی ہے کہ حضرت! آنے والی ہوں تو آجائیے ورنہ مرزا صاحب چلے۔ کیونکہ نزعی

کیفیت طاری ہو چکی ہے اور وہ آنکھیں بند کیے ہیں اور زیادہ سے زیادہ
دو چار گھڑی کے اور مہمان ہیں لہذا تشریف لاکر آخری دیدار کر لیجیے۔ یہ سنکر
محبوب نے سوچا چلو اب روز روز کے جھگڑے سے نجات ملی۔ یہ سوچکر اس نے
کپڑے بدلنا شروع کیئے میر مجروح نے مرزا صاحب کو اطلاع دی کہ ابھی تھوڑی
دیر ڈٹے رہیئے وہ آ ہی رہی ہیں یہ خبر سننا تھا کہ مرزا صاحب نے مارے خوشی
کے آنکھیں کھول دیں اتنے میں وہ بھی سجی بنی مرزا صاحب کے دولتکدہ پر بغرض دریافت
خیریت کو پہنچ گئیں اور مرزا صاحب کے سرہانے کھڑے ہو کر سورۂ یٰسین پڑھنے لگیں
مرزا صاحب گویا اسی کا انتظار کر رہے تھے چنانچہ انتقال کر گئے۔ اب مرزا صاحب
مرنے کے بعد کہتے ہیں کہ واللہ دوست احباب ان کو پکڑ کر لائے تو مگر ایسے وقت میں
لائے جب ہم ان کو جی بھر کر دیکھ بھی نہ سکے اور مرتے مرتے ایک نیا داغ دنیا سے
لے کر سدھارے۔

غزل نمبر ۴

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست   دودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست

یہ شعر مرزا صاحب نے فارسی شاعری کی تقلید میں کہا ہے جہاں معصوم اور بھولے
بھالے حسین لڑکوں کے کندھوں پر رکھکر بندوق چھڑائی جاتی ہے اور محبوب کو اس طرح
مخاطب کرتے ہیں کہ جیسے وہ صنفِ ثقیل سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ محض ایک پردہ ہوتا
ہے بات یہ ہے کہ مرزا صاحب کے زمانہ میں ہندوستان میں آدابِ مجلسی اسکی

اجازت نہیں دیتے تھے کہ کسی کی بہو بیٹی پر عاشق ہونے کے بعد کھل کر اُس سے اظہارِ عشق کیا جائے۔ اسی لیے اس میں مرزا صاحب نے مردانی ترکیبیں استعمال کی ہیں چنانچہ لڑکے کو معشوق کی ایک علامت قرار دے کر لڑکے ہی سے متعلق تمام اصطلاحات، تشبیہات، تمثیلات کنایہ اور تلمیحات استعمال کرتے ہوئے مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اُن کا معشوق فارسی شاعری والا ایک کمسن معشوق تھا، اُس کے بچپن میں جب مرزا صاحب نے اُس سے عشق شروع کیا تھا اس کے رخسار مثل شمع روشن تھے اُس کے چہرے سے معصومیت ٹپکتی تھی۔ اور ہمیشہ ور عشاق اُس کے حسن سے متاثر ہو کر اُس کے گرد جمگھٹے لگائے رہتے تھے جب تک اس کے داڑھی مونچھیں نہیں نکلی تھیں اس وقت تک اُس کے چہرہ پر معصومیت کی کشش تھی مگر جب اس کے بچکپنا کر داڑھی نکل آئی اور پورا کلہ سبزہ زار بن گیا تو رخساروں کی روشنی ماند پڑ گئی۔ ظاہر ہے کالے کے سامنے چراغ کب تک جلتا اب رخساروں کی شمع بجھی اور چہرہ کی ساری رعنائی شگفتہ ہو کر رہ گئی اور جب اُس سے دھواں نکلنا شروع ہوا تو مرزا صاحب کو مجبوراً دھوئیں کو خط رخسار سے تشبیہہ دینا پڑی اور عام ایرانی شعرا کی طرح صرف اتنا کہہ کر رہ گئے کہ صاحب؟ کیا عرض کیا جائے کہ اُن کے رخساروں کی شمع سے جو دھواں نکلا اُس نے اس کے حسن کے ساتھ یہ ستم ظریفی کی کہ اُس کا سارا کلّہ کالا کر کے رکھ دیا۔ اور دھوئیں نے داڑھی کی شکل اختیار کر لی۔ خدا اس دھوئیں کو غارت کرے جس نے اچھے بھلے کلّہ کو تباہ کر کے رکھ دیا اور اُس کے دونوں رخساروں کو ناکارہ بنا دیا۔

عشق میں بیداد رشک غیر نے مارا مجھے   کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمار دوست

یہ واقعہ ہے کہ مرنے کو سب ہی مارتے ہیں اور کمزور کا دنیا میں زندہ رہنا دشوار ہے
مرزا صاحب اپنے دوست پر بھرپور عاشق تھے اور ان کا عشق نہایت ہی مستی جوش کیا
ہوا تھا کہ کہیں سے اس کے چھوٹنے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا صاحب
بیمار پڑ گئے۔ عشق کی بیماری کیا ہڈی کی دق ہوتی ہے لہٰذا مرزا صاحب کی زندگی
نالوں اور آہوں کی غذا پر بسر ہونے لگی۔ ڈاکٹروں اور حکیموں نے جواب دے دیا۔
اسی درمیان میں اُن کا رقیب اُنھیں دیکھنے آیا اور جھوٹی ہمدردی کا اظہار کرنے
لگا۔ یہ بیمار تو تھے ہی اب جو رقیب کو ممنون نے اظہار ہمدردی کرتے دیکھا تو رشک
حسد کی آگ سی ان کے دل میں بھڑک اٹھی اور اس صدمہ کو ان کا قلب برداشت
نہ کر سکا اور شیوز ہو گیا حقیقت یہ ہے کہ اگر رقیب ان سے اظہار محبت نہ کرتا
تو شاید مرزا صاحب ہفتہ عشرہ محبوب کی محبت کے سہارے اور جی جاتے مگر جب
رقیب نے اُن کے سامنے اِن کے محبوب سے اپنی گفتگو اور محبت بھری باتوں کا ذکر کیا
تو مرزا صاحب کے پاس سوائے موت کے آغوش میں پناہ لینے کے کوئی دوسرا چارہ
نہ رہا۔ غرض بیمار تو دوست نے کیا اور آخر میں قتل دشمن نے کیا۔

بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوار دوست　　غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اس کے ہجر میں

مرزا صاحب اپنے محبوب سے عشق فرمانے کے بعد یہ سمجھے ہوئے تھے کہ محبوب کے جملہ حقوق
ان کے نام محفوظ ہو گئے ہیں مگر معشوق نے ہاتھ تو بیچا تھا ذات نہیں بیچی تھی یعنی
اگر اس نے مرزا صاحب سے محبت کا رشتہ قائم کیا تھا تو اس کے معنے یہ نہیں
تھے کہ وہ مرزا صاحب کے سامنے ہر وقت سوالیہ نشان بنا بیٹھا رہے مرزا صاحب
چاہتے تھے کہ وہ مرزا صاحب سے محبت کرنے کے بعد اُن　　کی طرح اظہار گفتار

لئے پڑا رہے اور ساری دنیا سے ملنا جلنا ترک کر دے ۔ اب ایک دن کا واقعہ سنیئے کہ مرزا صاحب اور ان کا محبوب ایک جگہ موجود تھے کہ باہر سے آواز آئی ۔
"ارے بھئی! ہم آدیں" مرزا صاحب اپنے دوست کی آواز پہچان گئے اور انھوں نے اُسے اندر بلالیا ۔ یہاں جو ان کے دوست نے محبوب کو بیٹھے دیکھا تو از راہ اخلاق کہنا شروع کیا ۔ کہیئے مزاج تو اچھے ہیں نا ۔ بڑی خوش نصیبی کہ آپ سے بھی ایک مدت بعد نیاز حاصل ہو گیا کہیئے بچے وچے تو بخیریت ہیں ۔ مرزا صاحب چونکہ انتہائی شکی مزاج واقع ہوئے تھے اس لئے دوست کے تخاطب کا مفہوم آپ نے یہ لیا کہ ان کے محبوب سے اور دوست سے پُرانی یاد اللہ ہے اور ان کے دوست نے محض ان کو جلانے اور ایذا پہنچانے کی غرض سے اس طرح ان کی خیریت دریافت کی ہے ۔

چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیٔ گفتارِ دوست

مرزا صاحب محبوب کی یاد میں کبھی نالے کرتے کبھی اونچی سروں میں روتے اور کبھی چپکے چپکے بڑے بڑے آنسو بہاتے ایک دن جب مرزا صاحب اپنے اس کام میں مصروف تھے اور دھیمی سروں میں منہ لپیٹے رو رہے تھے کہ رقیب کو ان کے رونے کا علم ہو گیا اس نے سوچا چلو موقع اچھا ہے مرزا صاحب کو تپاتے چلو چنانچہ وہ مرزا صاحب کے پاس پہنچ گیا ۔ یہاں پہنچکر اس نے جو مرزا صاحب کو روتے دیکھا تو ایک نہایت زوردار قہقہہ لگا کر بولا ارے صاحب آپ بھی کس حماقت میں مبتلا ہیں ۔ رونا دھونا بند کیجیے اور

تھوڑی دیر کچھ اور باتیں کیجئے۔ اس کے بعد اس نے بظاہر مرزا صاحب سے ہمدردی اور بہ باطن ان کو تپانے کی غرض سے تجربے کے دو ایک لطیفے بیان کرنا شروع کیے اور کہا کہ ایک صاحب ان کی جگہ نہ پوچھئے ایسی اطرح واقع ہوئی ہے کہ آج جامع مسجد کے پاس نعلی کھائی ہی تھیں اور جلدی ہی میں ساری کے اوپر بیٹھی کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے بعد ہی ایک دوسرے صاحب جب ان کو چائے پلانے ایک ہوٹل میں لے گئے تو انھوں نے چائے والے کو ایک کھوٹی چونی دے دی اس پر ایک بھیڑ لگ گئی غرض اسی قسم کے دو چار لطیفے اور ان کی دوسروں سے بابت مصیبت کی نقل کرنا شروع کی اور مرزا صاحب کے چلے پر جائے ہمدردی کے الٹا تیل چھڑکنا شروع کر دیا۔

ردیف (ج)

غزل نمبر ا

گلشن میں بند و بست برنگ دگر ہے آج	قمری کا طوق حلقۂ بیرون در ہے آج

اس شعر میں قمری کے طوق اور حلقۂ در کی مشابہت ظاہر کی گئی ہے۔ آپ نے ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ یوم آزادی کے موقع پر دیکھا ہو گا کہ غیر معمولی اہتمام سے یہ دن منایا جاتا ہے اس روز بہت سے قیدی رہائی پاتے ہیں اور سرکاری طور پر اعلان کیا جاتا ہے کہ چونکہ عام خوشی کا دن ہے لہذا تمام سرکاری دفاتر بند رہیں گے حتیٰ کہ ملک بھر میں دوکانیں بھی بند رہیں گی تاکہ ہر فرد اس مسرت کے موقع پر آزادی محسوس کرے اور اس عام آزادی کا اعلان اس طرح پر کیا گیا ہے کہ قمری کے

گلے میں جو طوق پڑا ہوتا ہے اُسے نکال کر بیرونی دروازے پر بطور اعلان لگا دیا گیا ہے تاکہ ہر شخص کو اس کی اطلاع ہو جائے کہ وہ آج کے دن بالکل آزاد ہے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ یہ شعر مرزا صاحب نے ملکہ وکٹوریہ کے ہندوستان آنے کے موقع پر لکھا تھا یا پھر اس شعر میں کانگرس کے جشن آزادی کے سلسلہ میں رام لیلا گراؤنڈ کا جو منظر ہوتا ہے پیش کیا گیا ہے۔ اُدھار روز دلّی میں ترکمان گیٹ پر پولیس کا پہرہ لگ جاتا ہے اور کسی کو سڑک پار کر کے رام لیلا کے میدان تک براہ راست پہنچنے کی اجازت نہیں ہوتی اس شعر کا دوسرا مفہوم یہ بھی نکلتا ہے کہ آج گلشن پر سخت پہرہ لگا ہوا ہے اور کسی نااہل یعنی غیر عاشق کو اندر داخلہ کی اجازت نہیں ہے، گویا قمری کا طوق بطور اعلان گلشن کے باہر لگا دیا ہے کہ جو بھی اندر آنا چاہے وہ اس اس وضع کا طوق غلامی پہن کر داخل ہو ورنہ بغیر اس طرح کے پاس کے گلشن کے اندر قدم نہیں رکھ سکتا۔

اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل　　سیلاب گریہ در پئے دیوار و در ہے آج

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب جمنا میں سیلاب آتا ہے تو سیلاب زدہ علاقوں کو خود خالی کرا لیا جاتا ہے۔ اسی طرح برسات کے زمانے میں جو شکستہ مکان ہوتے ہیں ان کو بھی میونسپل کمیٹی والے خالی کرا لیتے ہیں یا پہلے سے گرا دیتے ہیں کیونکہ ان کے منہدم ہو جانے کا ڈر رہتا ہے مرزا صاحب نے یہ شعر بھی جمنا کی طغیانی یا سیلاب سے متاثر ہو کر کہا ہے یا پھر اس سے محض اپنے رونے کا اظہار مقصود ہے۔ مرزا صاحب تو عشق میں دن رات رویا ہی کرتے تھے۔ پھر ستم یہ کہ جب رونے پر آتے تو سیر دو سیر نہیں بلکہ کئی کئی من آنسو آنکھوں سے بہا دیتے تھے جس سے

مکان میں ایک اچھا بھلا سیلاب آجاتا تھا اور اُس سے مکان کے در و دیوار خطرے میں پڑ جاتے تھے چنانچہ ایک دن مرزا صاحب جو دل کھول کر روئے تو اُنھیں یہ خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں سیلاب سے اُن کے مکان کے در و دیوار نہ منہدم ہو جائیں جس سے گھر والوں کی جان پر بن آئے اور وہ بھی کچل کر مر جائیں لہٰذا آپ نے رونا شروع کرنے سے پہلے چلّا چلّا کر بیوی سے جو گھر کی منتظمہ تھیں، کہنا شروع کیا کہ اے بھئی جو لوگ اس گھر میں عافیت اور اطمینان سے ہیں وہ فوراً گھر سے باہر نکل جائیں کیونکہ ہم ایک لمبا چوڑا سیلاب لانے والے ہیں اور یہ ہم اس لیے لا رہے ہیں تا کہ ہم تنہا پریشان حال رہ جائیں اور جو مقدر میں لکھا کر لائے ہیں اُسے پورا کریں۔

معزولئی تپش ہوئی افراطِ انتظار ‫ ‫ چشم کشودہ حلقۂ بیرونِ در ہے آج

معزولئی تپش = حرارت کا اخراج

مرزا صاحب کو عشق کے سبب رات دن نیند نہیں آتی تھی اور چوبیسوں گھنٹے ان کی آنکھوں کے دروازے پاٹو پاٹ کھلے رہتے تھے اور اس دروازے سے وہ بیٹھے بیٹھے اپنے عشق کی سوزش اور تپش کا اخراج فرماتے رہتے تھے۔ اس شعر میں فرماتے ہیں کہ اب انتظار کی زیادتی کا عالم یہ ہے کہ آنکھوں کے دروازے پاٹو پاٹ کھلے رہتے ہیں اور آنسوؤں کا سلسلہ آنکھوں سے دھارے کی شکل میں جاری ہے اور سوزِ دل خون بن کر خارج ہو رہا ہے غرض کہ مرزا صاحب عشق میں دن رات آنسوؤں کے ندی نالے بہاتے رہتے تھے اور سارے گھر والوں کی نیند حرام کیے ہوئے تھے۔

غزل نمبر ۲

لو ہم مریضِ عشق کے تیماردار ہیں ‫ ‫ اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

عشق میں مرزا صاحب کی حالت دگرگوں ہے اور لوگوں کا اُن کے گھر تانتا بندھا ہوا ہے عیادت کرنے والے آ آکر صورت دیکھتے ہیں، نبض پہ ہاتھ رکھتے ہیں اور ہاتھ پاؤں چھوکر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ بظاہر کوئی مرض ورض نہیں ہے کیونکہ نہ تو بخار ہی ہے اور نہ جسم کی گرمی ہی زائل ہوئی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کھلی ہوا میں چھوڑ دیئے گئے ہیں اور کسی نے ان کی طرف توجہ نہیں کی جس کی وجہ سے ان کا مرض بڑھ گیا ہے لیکن جب مرزا صاحب کو اس کا پتہ چلا کہ لوگ اس قسم کی چہ میگوئیاں کر رہے ہیں تو انھوں نے سوچا کہ لو صاحب جس مقصد سے ہم اٹھار کھٹار لے کر پڑے تھے وہ مقصد ہی فوت ہوا جا رہا ہے بات یہ ہے کہ جب مرزا صاحب کے معشوق کو لوگوں نے برا بھلا کہنا شروع کیا۔ تو اُس نے لوگوں کو ورغلانا شروع کیا کہ اماں کہاں مرزا صاحب کے بہکانے میں آئے ہوئے ہو اور بلا سبب اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ مرزا صاحب کسی مرض میں مبتلا ہیں یقین مانو کہ مرزا صاحب بالکل ہٹے کٹے ہیں محض بنے ہوئے ہیں سردست جو تکلیف وہ بتاتے ہیں اُس کے ذمہ دار اُن کے والدین اور ان کی بیگم صاحبہ ہیں جنھوں نے رات بھر انھیں کھلی ہوا میں ڈالے رکھا اس پر مرزا صاحب جن کو یقین تھا اُن کو عشق کا مرض لاحق ہے جس کا دنیا میں کوئی علاج نہیں فرماتے ہیں کہ بھائی عشق کا مرض آج تک تو اچھا ہوا نہیں۔ اگر حکیم لقمان بھی آجائیں تو اچھا نہیں کر سکتے۔ مرزا صاحب کے اس کہنے پر اُن کا معشوق کہتا ہے کہ صاحب آج سے ہم مریض کی تیمارداری اپنے سر لیتے ہیں اس کے بعد بھی اگر آپ اچھے نہ ہوں تو آپ معالج یعنی معشوق کو سزا دیسکتے ہیں اس شعر میں مسیحا کا کیا علاج کے معنے یہ ہیں کہ مسیحا یعنی معشوق کو کون سی سزا دی جائے گی۔

ردیف (چ)

غزل نمبر ۱

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ   اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

انجمن آرزوئے نفس باہر کھینچنا = مایوس ہونا

ساغر سے مراد ساغر کی گردش کے ہیں۔

مرزا صاحب خود تو بہرحال معشوق کو زندگی بھر پریشانی میں مبتلا کیے رہے مگر انھوں نے اُسے مزید پریشان کرنے کے لیے دوست احباب کو بھی لگا دیا تھا۔

چنانچہ جب ان کے دوست احباب کو اطلاع ہوئی کہ محبوب کی محفل میں شراب کے دور چل رہے ہیں تو یہ اپنے دوستوں کی پوری ٹولی کی ٹولی وہاں بھیج دیتے اور ان کے پیچھے خود بھی جا کر بیٹھ جاتے اور جب شراب کا دور شروع ہوتا تو ان کا ساقی یعنی محبوب گھوم گھوم کر اپنی جان پہچان کے لوگوں میں شراب تقسیم کرتا اور ان کے دوست احباب کو نظر انداز کر دیتا اس پر ان کے دوست ان سے کہتے کہ اماں! کہاں لے آئے یعنی کہ دو گھنٹے سے ہم لوگ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں مگر ہم کو تو بظاہر ملتی نظر نہیں آتی اس پر مرزا صاحب چپکے سے فرماتے ہیں کہ آپ سب ڈٹے رہیے اور انجمن سے اُٹھ کر نہ جائیے آخر دیکھیں کب تک شراب نہیں دیتے   کبھی کبھی تو باری آئے ہی گی اور ان کو شراب دینا پڑے گی   انتظار ساغر کھینچ کا مقصد یہ ہے کہ اگر شراب نہیں ملتی تو اتنی دیر اس کی تقسیم ہی کا مزے لیتے رہیے۔ مرزا صاحب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ [illegible]

تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل   کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ

بستر کا ناز کھینچنا ، بستر پر لیٹے رہنا ۔

مرزا صاحب اکثر اپنے گھر میں عشق و محبت کاری ہر سل کیا کرتے تھے اور یہ کرتے تھے کہ فرصت کے وقت وہ دل کو سینے سے نکال کر بستر پر لٹا دیا کرتے تھے اور خود کھڑے ہو کر اُسے نصیحتیں کرنا شروع کر دیتے تھے ۔ دل بے چارہ پڑے پڑے معشوق کا انتظار کرتا اور آتشِ انتظار میں سلگا کرتا تھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مرزا صاحب کو دیکھا کرتا ۔ مرزا صاحب تھوڑی دیر کے بعد طنزاً کہتے کہ اب کیا انتظار کا بہانہ کئے پڑا ہے تیرا دل تو بستر پر اینڈنے کو چاہتا ہے اور ہم سے کہہ رہا ہے کہ ہم محبوب کا انتظار کر رہے ہیں جھوٹا کہیں کا ۔ یہ بتا کسی اور دینا ہم ان بتوں میں آنے والے نہیں ہیں ورنہ ہمیں تو اس کی کوئی اطلاع نہیں کہ کب معشوق نے تجھ سے آنے کا وعدہ کیا تھا اور کب کہا تھا کہ تو اس طرح پڑے پڑے انتظار کر ۔ اے تو بڑا کائیاں ہے ۔ انتظار کے بہانے سے خوب ڈٹ ڈٹ کر آرام کر رہا ہے اور مفت کا احسان معشوق کی گردن پر لاد رہا ہے ۔

مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں   بروئے شغل کباب دلِ سمندر کھینچ

قدح = پیالہ مراد دل ۔ صہبا = شراب ۔ آتش پنہاں = عشق ۔ سمندر = آگ میں رہنے والا کیڑا ۔

جو لوگ آگ کھانے کے عادی ہوتے ہیں اُن کو کوئلے کھانے میں بھی مزہ آتا ہے مرزا صاحب ایسی تن بدن میں آگ لگا دینے والی شراب عشق پیئے ہوئے تھے کہ جس کے سامنے آگ بھی آتے شرماتی تھی ۔ آگ کی گرمی کی رعایت سے مرزا صاحب اس شعر میں فرماتے ہیں کہ بھئی ایسی شراب جیسی کہ ہم پیتے ہیں اُس کے لیے کباب بھی آتش صفت ہونا چاہیے تاکہ کچھ

مزا لیے مرزا صاحب کے اِس حُسنِ طلب کی داد دیجیے کہ براہ راست کباب کبھی طلب
کر رہے ہیں تو گرم گرم سیخ ہی کے اترے ہوئے اور وہ بھی سمندر کے دل کے تلے ہوئے
چنانچہ مشورہ دیتے ہیں کہ اگر باسی کباب آئے تو گرم گرم شراب پینے کے بعد ان کا کوئی مزہ
یا ذائقہ زبان کو حاصل نہ ہو سکے گا لہٰذا دل کے کباب اگر دسترخوان پر لائے جائیں تو
وہ مزہ دیں گے کہ زبان گھنٹوں ان کے چٹخارے لیا کرے گی۔

ردیف (د)

غزل نمبر ۱

حُسنِ غمزہ کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد — بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

مرزا صاحب کو حسینوں کے ہاتھوں پٹنے میں مزہ آتا تھا اور یہ خون اُن کے جسم
کو ایسا لگا ہوا تھا کہ مرتے دم تک وہ اس ذائقہ کو نہ بھولے وہ ہمیشہ اپنے کو معشوق کے ناز و غمزوں کا
جوہری سمجھتے رہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ اب میرے مرنے کے بعد محبوب کے نشترِ غمزوں کو کون
برداشت کرے گا کیونکہ جب تک میں بقیدِ حیات رہا ان کی ہر قسم کی اچھی بری سہتا رہا اور
ان کے جور و تشدد برداشت کرتا رہا۔ اب میرے مرنے کے بعد جب اہلِ جفا یعنی حسینوں کو
اطلاع ہوگی کہ ان کے غمزے اٹھانے والے صاحب اپنی دوکان بڑھا گئے تو نہ جانے اُن
پر کیا گزرے گی آپ کا خیال ہے کہ آپ کے مرنے کے بعد اسی سبب سے حسینوں نے اپنے
سارے نشترِ غمزوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے حالانکہ صورتِ حال اس سے مختلف
ہے اور وہ یوں کہ مرزا صاحب کی زندگی میں حسینانِ عالم بڑی مصیبت میں مبتلا تھے
اُن کو دن رات مرزا صاحب سے غمزے کرنا پڑتے تھے اور وہ بیچارے اس درجہ مصروف رہتے تھے کہ دنیا میں
دوسرا کوئی کام کر ہی نہیں پاتے تھے۔ مرزا صاحب کے مرنے سے انھیں یہ فائدہ ہوا کہ

انھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس غمزہ بازی سے نجات مل گئی۔ اور اب وہ نہایت آرام و سکون کی زندگی بسر کر رہے ہیں مگر مرزا صاحب بلا سبب مرنے کے بعد بھی شہر کے اندیشے میں دُبلے ہو رہے ہیں اور محض اپنی بڑائی جتانے کے لیے کہہ رہے ہیں کہ ہائے ان حسینوں کے نشتر غمزوں کو ان کے مرنے کے بعد اب کون برداشت کرے گا ان کے غمزے زنگ آلود ہو کر رہ جائیں گے۔

خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
ان کے ناخوں ہوئے محتاج حنا میرے بعد

دل خون ہونا: سخت رنج ہونا۔ احوالِ بتاں: حسینوں کی گری ہوئی حالت۔

مرزا صاحب کوئی چھٹ بھئیے قسم کے عاشقوں میں تو تھے نہیں کہ مرنے کے بعد عشق سے دست کشی اختیار کر لیتے چنانچہ مرنے کے بعد بھی انھیں فکر لگی ہوئی ہے کہ ہائے بیچارے ونگین معشوق جو میں دنیا میں چھوڑ آیا ہوں انھیں کیسی پریشاں حالی کی زندگی بسر کرنا پڑی ہوگی۔ اُن کا سہاگ تو بہرحال اسی روز ختم ہو گیا ہوگا جس روز آپ نے دنیا سے کوچ فرمایا اور ان کے بناؤ سنگار کے لیے غازہ، لپ اسٹک اور مہندی لانے والا کوئی نہ رہا۔ چنانچہ قبر میں لیٹے لیٹے مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ہائے وہ سب کی سب رانڈیں سفید دوپٹہ پہنے کیسی بری معلوم ہوتی ہوں گی ظاہر ہے کہ جب مرزا صاحب کو خوش کرنے کے لیے وہ اکثر مہندی لگایا کرتی تھیں اب مرزا صاحب کے مرنے کے بعد اُن کے ناخنوں پر مہندی کہاں سے نظر آئے گی جب کہ مہندی لانے والا بیچارہ خاک ہو چکا ہے بلکہ یہاں تک سنا ہے کہ مرزا صاحب گرمیوں کے دنوں میں جب مہندی کے پیڑ خشک ہو جاتے تھے تو اپنا تھوڑا بہت خون انھیں دیا کرتے تھے اور وہ اُسے کیوٹکس کی جگہ استعمال کر لیا کرتی تھیں لیکن اب جبکہ مرزا صاحب مر چکے ہیں انھیں کون ہے جو اپنا خون بطور کیوٹکس

استعمال کرنے کو دے گا لامحالہ اپنا شوق پورا کرنے کے لیے انھیں دوسروں سے
مرزا صاحب والا کام لینا پڑے گا۔

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

جب تک مرزا صاحب زندہ رہے اس وقت تک وہ حسینوں کی خدمت میں مہر و وفا کے
مٹکے کے مٹکے لنڈھاتے رہے اب مرزا صاحب کو اپنے مرنے سے زیادہ غم اس کا ہے کہ ان کے
بعد مہر و وفا کی خدمت میں تعزیت کون پیش کرے گا۔ اور کون مہر و وفا سے کہے گا کہ
بڑا افسوس ہوا آپ کے مرزا صاحب کے مرنے کا اور آپ کے بے یار و مددگار ہو جانے کا
کیونکہ مرزا صاحب کے مرنے کے بعد مہر و وفا کا بھی جنازہ نکل گیا گویا کہ دنیا میں مہر و وفا
کے جملہ حقوق مرزا صاحب ہی کے نام محفوظ تھے اور اب مرزا صاحب کیا مرے مہر و وفا
کی ٹھیکیداری ختم ہو گئی۔

ردیف (ر)

وفور اشک نے کاشانے کا یہ حال کیا کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

اس شعر میں بھی مرزا صاحب نے اشکوں کے سیلاب کا ایک منظر پیش کیا ہے
غالباً جمنا کے سیلاب سے متاثر ہو کر یہ شعر ان کے قلم سے نکلا ہے اکثر رونے دھونے
کے معاملہ میں وہ دریاؤں اور سمندروں کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے تھے اور
اس سے گھٹ کر تو وہ رونا ہی نہیں جانتے تھے۔ بظاہر دیکھنے میں تو آدمی دبلے پتلے
تھے مگر آنکھوں میں اشکوں کے پورے پورے سمندر چھپائے ہوئے تھے جب رونے
پہ آتے تو بڑی بڑی حویلیاں اور بڑی بڑی بارہ دریاں سیلاب اشک سے

منہدم کر دیتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دیواریں گر گر در دازے بن جاتیں اور دروازے گر گر ملبے کی شکل اختیار کر لیتے اور یہ ملبہ کبھی گھر میں دیوار کا کام کرتا اور کبھی دوسرے کاموں میں استعمال ہوتا۔

جو ہے تجھے سر سودائے انتظار تو آ کہ ہے دوکان متاع نظر در و دیوار

سر: خیال۔ سودا: حسن جنوں۔ متاعِ نظر: انتظار کا ساماں یا مال و دولت

اس شعر میں سودا، دوکان۔ متاع رعایت لفظی ہیں۔

خدا نہ کرے کہ انسان بیکار ہو کیونکہ بیکاری ہی میں انسان دن رات پڑے پڑے ادھر اُدھر نظریں دوڑایا کرتا ہے۔ مرزا صاحب نے چونکہ زندگی بھر کوئی ملازمت نہیں کی اس لیے انھوں نے عشق کا کاروبار شروع کر دیا۔ اور معشوق کے انتظار میں پڑے پڑے کاہلی میں اتنی مشق بہم پہنچالی کہ اب بڑے بڑے رقیب کو چیلنج دینے لگے کہیں کوئی صاحب جو ہماری طرح مہینوں اور برسوں لگاتار ایک چارپائی اور ایک بستر پر پڑے پڑے معشوق کا انتظار کرتے رہے ہوں اگر کوئی صاحب ہوں تو ہمارے گھر تشریف لائیں اور ہم سے نبرد آزمائی فرمائیں ہم کوئی معمولی پرچون کی دکان کھولنے والے بنئے بقال نہیں ہیں ہم نے انتظار کی پونجی کی دوکان کھول رکھی ہے جس کے در و دیوار کے جملہ حقوق معشوق ہمارے نام محفوظ کر چکا ہے۔ یقین نہ ہو تو کچہری کے کاغذات نکلوا کر دیکھ لیجئے پھر اگر مال خالص اور اچھا نہ ہو تو دام واپس یقین مانئے کہ ایسا پختہ اور مضبوط قسم کا انتظار آپ کو کسی دوسری دوکان میں نہیں مل سکتا۔ مگر مرزا صاحب کے معشوق کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ باوجود اتنا کھرا مال رکھنے کے وہ ایک دن بھی مرزا صاحب کی دوکان سے انتظار کی پڑیا

بندھوائے نہیں آیا حالانکہ ساری دنیا بھرنا چاہتا پھر آخر میں مرزا صاحب نعرہ بلند فرماتے ہیں کہ اگر انتظار کا مزہ لینا ہو تو ادھر آیئے بہترین قسم کا ڈوال کاٹو تا انتظار صرف ہماری دوکان میں ملتا ہے چنانچہ اس شعر میں فرماتے ہیں کہ اگر تجھے شوق انتظار خریدنا ہے تو ہماری دوکان پر آ کیونکہ انتظار کی اسٹیشنری کا سامان ہمارے یہاں ملتا ہے۔

غزل نمبر ۲

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر ‏ ‏ جانے گا اب بھی تو مرا کیا گھر کہے بغیر

اس شعر میں بڑا طنز ہے وہ یوں کہ مرزا صاحب کا محبوب بڑا سیانا ہے جب مرزا صاحب اُس سے کہتے کہ آپ ہمارے گھر تشریف نہیں لاتے تو وہ جھوٹی سچی اڑانے لگتا اور کہہ دیتا کہ آپ کے مکان کا نمبر نہیں معلوم تھا اور نہ یہی معلوم تھا کہ جناب کس گلی میں رہتے ہیں اور یہ بہانا وہ صرف مرزا صاحب کو پریشان کرنے کی غرض سے کرتا تھا۔ مرزا صاحب بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے انھوں نے جھوٹے کو گھر تک پہنچانے کے لیے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ اُسی کے مکان کے دروازے کے سامنے جو خالی زمین پڑی تھی اُس پر بغیر یہ دریافت کیے کہ زمین میونسپلٹی کی ہے یا امپرومنٹ ٹرسٹ کی اپنا مکان بنوانا شروع کر دیا اور ایسی پھرتی میں بنوایا کہ چند روز کے اندر اندر مکان بنکر تیار ہو گیا۔ بعد میں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ زمین اُنھیں کے معشوق کی ملکیت تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ بغیر معشوق کو اطلاع کیے اور زمین کا بیعنامہ کیے محبوبہ کی زمین پر مکان بنوا لینا بڑی جرأت کا کام تھا مگر تنگ آمد بجنگ آمد مرزا صاحب بھی کیا کرتے کیونکہ محبوبہ نے ان کو ٹالتے چرکے دیے تھے کہ آخر میں اُنھیں بھی ایک بھرلور

دھوبی پاٹے کا داؤں کرنا پڑا۔ مکان بننے کے بعد مرزا صاحب ان کی خدمت میں
حاضر ہوئے اور فرمانے لگے کہ کہئے اب بھی کسی عذر کی گنجائش ہے یہ جو آپ کہتے تھے
کہ بغیر بتائے میں کیا جانوں کہ تیرا گھر کہاں ہے۔ بہرصورت اب گھر حاضر ہے۔ خواہ کسی طرح
پر بھی بنا ہو جھگڑا ختم ہو گیا اب جب آپ کنڈی کھٹکھٹائیں گے تو بندہ کو اپنی خدمت میں
حاضر پائیں گے اور اب آپ کو مکان کا نمبر اور محلہ کا نام بھی پوچھنے کی زحمت نہ ہوگی
اس شعر کا سارا لطف سمجھے بغیر ہیں ہے۔

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقت سخن   جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

مرزا صاحب کا معشوق سینکڑوں طرح کے داؤں مرزا صاحب کے ستانے میں استعمال
کرتا تھا جب تک مرزا صاحب جوان رہے اور ان کے قویٰ اس قابل رہے کہ وہ
محبوب کی ہر بات کا جواب ترکی بہ ترکی دے سکتے اس وقت تک اس نے مرزا صاحب
کی خیر عافیت تک نہ پوچھی اور جب اس کو اس کا پورا یقین ہو گیا کہ مرزا صاحب
اب بوڑھے ہو چکے ہیں اور ان کی سماعت اور قوت گویائی بھی ضعیفی کی وجہ سے
سلب ہو چکی ہے تو سوچا کہ اب چلنا چاہئے چنانچہ ایک دن محبوب مرزا صاحب کی
خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ کہئے مرزا صاحب! مزاج تو بخیر ہیں؟ مرزا صاحب
بیچارے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد تو سن ہی پائے کہ کوئی صاحب کچھ پوچھ رہے ہیں اس کے بعد
چونکہ بڑھاپے کے سبب قوت گویائی جواب دے چکی تھی اس لیے پھر خاموش ہو گئے
اب جب دیر تک ان کا محبوب جواب کا انتظار کرتا رہا اور بقول شخصے صدائے نہ برخاست
تو وہ مرزا صاحب کے دوست احباب جو شاید اسے گھیر کر لائے تھے۔ مخاطب ہو کر
بولا کہ دیکھئے صاحب ہم تو آپ لوگوں کے اصرار سے آ گئے مگر اب انصاف فرمائے کہ

بغیر بتائے ہم کسی کے دل کی بات کیوں کر جان سکتے ہیں مرزا صاحب اگر جوان ہوتے تو انھیں دنداں شکن جواب دیتے مگر وہ بیچارے کرتے کیا خاموش رہے بھلا اس سے زیادہ ظلم اور شرارت مرزا صاحب کی شان میں اور کیا ہو سکتی تھی۔

سر پھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

مرزا صاحب کو اپنی محبوبہ سے جو والہانہ عشق تھا وہ تو بہر حال سبھی کو معلوم ہے چنانچہ انھوں نے محبوبہ کی پکی حویلی کی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر اپنی جان دے دی۔ مرزا صاحب کے انتقال کے ایک عرصہ بعد تک وہ حویلی جوں کی توں رہی۔ چنانچہ ایک صاحب جو اس واقعہ سے بخوبی واقف تھے انھوں نے ایک روز حسب المعمول ملاقات اپنی محبوبہ سے ذکر کیا کہ صاحب آج آپ سے ملنے کا شرف اس لئے حاصل کر رہا ہوں کہ ابھی جب میں بازار سے سودا سلف لینے نکلا تو آپ کی حویلی دیکھ کر مجھے مرزا صاحب کی موت یاد آگئی بس میں سوچا کہ چلو آپ سے بھی ملتا چلوں کیونکہ یہی وہ حویلی ہے جس کی دیواروں سے سر ٹکرا کر غالب جیسے بلند پایہ عاشق اپنی جان سے گذر گئے۔ حیرت ہے کہ آپ نے ذرہ برابر پرواہ نہیں کی اور مرزا صاحب کو خودکشی کرنے سے نہیں روکا۔

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ دیرانی سفیدی دیدہ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

حضرت یعقوب کی آنکھیں حضرت یوسف کے فراق میں روتے روتے سفید ہو گئی تھیں اور نور چشم جاتا رہا تھا یہی نور چشم زندان زلیخا پر منتقل ہو گیا اور اس نے زنداں کو منور اور سفید کر دیا حضرت یوسف علیہ السلام حضرت یعقوب کے نور نظر تھے اور ان کے حسن و جمال کا یہ عالم تھا کہ جس طرف وہ نکل جائے در و دیوار پر نور برسنے لگتا چنانچہ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ حضرت یوسف خانہ یعقوب اور دیدۂ یعقوب کا اس وقت

تک نور بنے رہے جب تک وہ کنعاں میں رہے اور جب زلیخا نے ان کو قید کرا دیا تو وہاں بھی ظاہر ہے کہ ساری کوٹھری اُن کے نور سے منوّر ہو گئی گویا وہ دیدۂ یعقوب کی سفیدی ہی زنداں کی رونق کا باعث ہو گئی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زلیخا نے جب حضرت یوسف کو دیکھا کہ وہ کسی طرح اس کے بس میں نہیں آرہے ہیں تو اس نے سوچا کہ ان کو کسی تیرہ و تاریک گوشہ میں قید کر دیا جائے شاید تاریکی سے تنگ آ کر وہ اُس کے چکر میں آ جائیں مگر حضرت یوسف کو اس کی کیا پرواہ ہو سکتی تھی جبکہ وہ نور خداوندی سے اس درجہ معمور تھے کہ ان کو اپنے قید خانہ کے لیے نہ کسی لالٹین کی ضرورت تھی اور نہ کسی دیئے کی چنانچہ وہ نہایت آرام و سکون کے ساتھ قید رہے اور زلیخا اس غلط فہمی میں مبتلا رہی کہ ان کی کوٹھری میں کوئی چراغ نہیں ہے لہذا وہ تاریکی سے بدحواس ہو کر رام ہو جائیں گے۔

غزل نمبر ۳

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا　　رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

اگر آپ نے بھی کسی سے عشق کیا ہوگا تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہر عاشق عاشق ہوتے ہی معشوق کے جور و تشدد کا حقدار صرف اپنے آپ کو سمجھتا ہے اور یہ صرف عشق ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے جو بڑے بڑے مظالم عاشق نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتا ہے۔ سچ پوچھئے اور بوالہوس عاشق معشوق کے ایک ہی وار میں جیں بول جاتے ہیں اب معشوقوں کی چالبازی ملاحظہ ہو کہ انھوں نے

عاشقوں کو بدنام کرنے کے لیے بوالہوسوں پر مظالم شروع کر دیئے۔ اور جب وہ برداشت نہ کر سکے تو انھوں نے ایک کلیہ بنالیا کہ تمام عشاق کم ظرف ہوتے ہیں ایسے گئے ہیں کہ کرے داڑھی والا اور پکڑا جائے مونچھوں والا چنانچہ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ جب حضور رقیب پر ظلم و تشدد کرتے ہیں تو ہم کو بڑی تکلیف ہوتی ہے کیونکہ اس میں آبروریزی ہم سچے عاشقوں کی ہوتی ہے اس وجہ سے کہ جب وہ سب کے سب بُزدلے ثابت ہوں گے تو آپ ہم کو بھی اسی گینڈے کا عاشق سمجھنے پر مجبور ہوں گے۔ حالانکہ قسم آپ کے سرِ عزیز کی کوئی دوسرا سوائے اس خاکسار کے آپ کے آزار کا نہ تو مستحق ہے اور نہ اُسے برداشت کر سکتا ہے۔

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

عیار = کسوٹی۔ قاعدہ ہے کہ چاندی اور سونے کو کسوٹی پر گھس کر اس کے کھرے کھوٹے کو دیکھتے ہیں اگر معیار پر پوری اترے تو اس سے اشیاء کا تبادلہ کیا جاتا ہے ورنہ کھوٹا سکہ واپس کر دیا جاتا ہے۔ مرزا صاحب کا دستور تھا کہ وہ سخن فہموں اور گھامڑ شعراء میں تمیز کرنے کے لیے پہلے دو ایک شعر سنا کر پرکھ لیتے تھے اور اس کے بعد جب اُن کو اندازہ ہو جاتا تھا کہ واقعی ان میں شعر فہمی کی صلاحیت ہے تو کھُل کر وہ اپنا چو غزلہ یا پنج غزلہ اُن پر مسلط کر دیا کرتے تھے کم سواد اور کج فہموں کے لیے وہ اپنی شعر و شاعری کی دوکان کے دروازے مقفل رکھتے تھے چنانچہ اس شعر میں بھی مرزا صاحب نے اس کا ذکر کیا ہے اور فرماتے ہیں کہ بھائی میں ایسا تھرڈ کلاس شاعر نہیں ہوں جب تک سامع کو پرکھ نہیں لیتا اس کی جان پر اپنی غزلیں لے کر مسلط نہیں ہوتا۔

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

مرزا صاحب کے بعض اشعار اچھا خاصہ چوں چوں کا مربہ ہوا کرتے تھے بظاہر تو اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ مرزا صاحب کے معشوق کو مرزا صاحب کی محبت پر ذرہ برابر اعتماد نہیں۔ دوسری طرف مرزا صاحب کا عالم ملاحظہ ہو کہ یہ عشق میں گھلتے گھلتے انگوٹھا ہو کر رہ گئے تھے اور اس قابل بھی نہ رہے تھے کہ ان کو انگلی پر ٹانگ دیا جاتا۔ جب دیکھئے مراقبہ میں پڑے محبوب کی یاد میں مصروف ہیں یا ہار رہے ہیں یہاں تک کہ نہ انھیں بیوی بچوں کی پرواہ تھی اور نہ گھر کے سودا سلف کی فکر۔ نہ گھر کی صفائی ستھرائی کی طرف کوئی توجہ کرتے تھے اور نہ گرد آلود اشیاء کی صفائی کی ان کو فکر تھی گویا فنا فی العشق تھے مگر اس کے باوجود محبوب کی بدگمانی ملاحظہ ہو کہ وہ جب اپنا بناؤ سنگار کرنے آئینہ کے سامنے کھڑا ہوتا تو آئینہ کو دیکھ کر آئینہ کے زنگ پر ایک دوسری محبوبہ کا شبہہ ہوتا اور وہ مرزا صاحب کی محبت میں شک کرنے لگتا۔ اور سمجھتا کہ مرزا صاحب کی دلچسپیاں اس کے علاوہ دوسروں سے بھی ہیں چنانچہ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ محبوب کو آئینہ کے زنگ پر چونکہ طوطی کا شبہہ ہوا اس لیے اس نے کہنا شروع کیا کہ اچھا مرزا صاحب نے میرے ہوتے ہوئے دوسری چیزوں سے بھی دلچسپی لینا شروع کر دی اور گھر میں ایک طوطی پال رکھی ہے۔

سر پھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا | یاد آگیا مجھے تیری دیوار دیکھ کر

مرزا صاحب کو اپنی محبوبہ سے جو والہانہ عشق تھا وہ تو بہرحال سبھی کو معلوم ہے چنانچہ انھوں نے کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق محبوبہ کی پکی حویلی کی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر اپنی جان دیدی تھی اس طرح مرزا کو گذرے ایک زمانہ ہو گیا مگر وہ دیواروں کی تب جیسی تھی ویسی قائم رہی۔ ایک صاحب جو اس واقعہ سے بخوبی واقف

تھے اُنھوں نے ایک دن عند الملاقات مرزا صاحب کی محبوبہ سے ذکر کیا کہ صاحب!
آج آپ سے ملنے کا شرف اس لیے حاصل کر رہا ہوں کہ میں ابھی جب اِس طرف سے
بازار سودا سلف لینے جا رہا تھا تو یاد آگیا کہ ہائے یہی وہ حویلی ہے جس کی دیوار سے
سر ٹکرا کر مرزا صاحب جیسا بلند پایہ عاشق ابھی جان سے گزر گیا لہذا میں نے کہا کہ آپ
کو بھی دیکھتا چلوں کہ آپ کس مزاج اور کس طبیعت کی ہیں کہ آپ نے ذرہ برابر رحم نہ فرمایا
اور مرزا صاحب کو خودکشی کرنے سے روکا بھی نہیں۔

غزل نمبر ۱

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی ۔۔۔ سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

حضرت یعقوب کی آنکھیں حضرت یوسف کے فراق میں روتے روتے سفید ہوگئی
تھیں اور ان کی آنکھوں کا نور جاتا رہا تھا یہی نور زندانِ زلیخا میں منتقل ہو گیا جس نے
زنداں کو منور اور روشن کر دیا حضرت یوسف علیہ السلام حضرت یعقوب کے نورِ نظر تھے
اور ان کے حسن و جمال کا عالم یہ تھا کہ جس طرف نکل جاتے، در و دیوار پر نور برسنے لگتا۔
اس شعر میں مرزا صاحب کہتے ہیں کہ حضرت یوسف خانۂ یعقوب اور دیدۂ یعقوب کا نور
اُس وقت تک بنے رہے جب تک کہ وہ کنعاں میں رہے اور زلیخا نے اُن کو قید کر رکھا
اور جتنے عرصہ تک وہ قیدی رہے قید خانہ اُن کے نور سے منور رہا گویا دیدۂ یعقوب
کی سفیدی ہی زنداں کی رونق کا باعث ہو گئی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب زلیخا نے دیکھا
کہ حضرت یوسف کسی طرح اُس کے بس میں نہیں آ رہے ہیں تو اُس نے یہ سوچا کہ ان کو
کسی تیرہ و تاریک کوٹھری میں قید کر دیا جائے اور شاید تاریکی سے تنگ آ کر وہ اُس سے
محبت کرنے لگیں مگر حضرت یوسف کو اس کی کیا پروا ہو سکتی تھی جب وہ نورِ خدا وندی

سے اِس درجہ مسحور تھے کہ اُن کو اپنے قید خانے کے لیے نہ کسی لالٹین کی ضرورت تھی اور نہ کسی دیئے کی۔ چنانچہ وہ نہایت آرام و سکون کے ساتھ قید رہے اور زلیخا اس غلط فہمی میں مبتلا رہی کہ اُن کی کوٹھری میں کوئی چراغ نہیں ہے۔

فنا تعلیم درسِ بیخودی ہوں اُس زمانے سے ۔۔۔ کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

فنا تعلیم درسِ بیخودی: بیخودی کے سبق سے فنا کی تعلیم حاصل کرنیوالا

مرزا صاحب کو اپنے عشق پر اتنا ناز تھا کہ وہ مجنوں کو لونڈے لاڑیوں میں شمار کرتے تھے اور اپنے عشق کے مقابلے میں بڑے سے بڑے تاریخی عشاق کو طفلِ مکتب سمجھتے تھے چنانچہ فرماتے ہیں کہ یہ جو مجنوں صاحب کی ساری دنیا میں شہرت ہے اور وہ سارے عشاق کے لاٹ صاحب بنے پھر رہے ہیں۔ اِس کا واقعہ یوں ہے کہ جس زمانے میں یہ خاکسار بیخودی کی تعلیم دینے میں کامل ملکہ اکمل ہو چکا تھا اُس زمانے میں "احاطے کالے خاں" کے سامنے جو مکتب ہے اُس کی دیواروں پر ایک صاحبزادے ہاتھ میں تختی لیے اور کان میں کلک کا قلم دبائے چاک سے مکتب کی دیواروں پر الف اور لام لکھا کرتے تھے بعد میں لوگوں نے اِنہی صاحبزادے کو مجنونِ وقت اور عاشقِ دوراں کہنا شروع کردیا۔ یقین مانئے اگر مقابلہ کیا جائے تو عشق و محبت کے میدان میں وہ مجھ سے میلوں پیچھے ہیں بلکہ جس وقت وہ "غوں غاں" کرتے تھے اس وقت آپ کا یہ بندۂ ناچیز عشاق میں اساتذہ کی حیثیت رکھتا تھا مگر دنیا کی ہٹ دھرمی ملاحظہ ہو کہ گرو تو گرو ہی رہے اور چیلے صاحب شکر ہو گئے۔ واہ ری دنیا!

فراغت کسقدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے ۔۔۔ بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر

تشویش معنی فکر، پاسجھو۔ مرہم زخموں کے ٹکڑوں کو یکجا اور مندمل کرتا ہے۔

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ جب اُن کے معشوق نے اپنے ناز و انداز کے ہتھوڑوں سے اُن کا دل چور چور کر دیا اور اس کے جور و ستم سے ان کا دل پارہ پارہ ہو گیا تو کچھ لوگوں نے مرزا صاحب کے معشوق سے جا کر عرض کی کہ حضرت یہ آپ کی کون سی حرکت تھی کہ میں نے ایک اچھا بھلا دل ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ یہ سن کر اُن کے معشوق کو بڑی خجالت اور شرمندگی ہوئی بہر صورت اب دل کے اُن ٹکڑوں کو یکجا کرنے کا سوال تھا۔ لہٰذا سب سے پہلے اُس نے ایک عدد نمکدان طلب کیا جس میں چوٹی تک نمک بھرا ہوا تھا۔ اور پھر اُن ٹکڑوں پر نمک چھڑکنا شروع کیا کہ شاید نمک پاشی سے دل کے ٹکڑوں سے جو خون رس رس کر نکلے وہ اُن ٹکڑوں کو پھر سے جوڑ دے مگر یہ علاج کارگر نہ ہو سکا اب اُن ٹکڑوں کی بلا نوشی ملاحظہ فرمائیے کہ دل کے ٹکڑوں نے جو نمکدان دیکھا تو ہر ٹکڑے کے منہ میں پانی بھر آیا اور اُس نے سوچنا شروع کیا کہ ہم پورے نمکدان پر قبضہ کر کے بھرپور لذت اندوز ہوں۔ عاشق کے دل کا معاملہ کچھ ایسا ہی ہوتا ہے کہ لوگ نمک پاشی سے تڑپتے اور بے چین ہو جاتے ہیں مگر نمک سے ان کے دل کو — اتنی رغبت ہوتی ہے کہ ایک نمکدان کیا اگر آپ پورا نمک کا ایک ٹوکرا لا کر رکھ دیں تب بھی عشاق کی سیری نہ ہو گی بلکہ خدا جھوٹ نہ بلائے اگر نمک کی پوری کان بھی ہو تو وہ دل کے ایک ٹکڑے کے لئے ناکافی ہے چنانچہ نمک کی تقسیم پر دل کے ٹکڑوں میں اچھا خاصہ بلوہ ہو گیا اور اُن کا جتھا تو دور رہا وہ سب ایک دوسرے سے "لپاڈگی" پر آمادہ ہو گئے جب محبوب نے یہ دیکھا تو اُس نے کہا کہ بظاہر اِن ٹکڑوں میں صلح کی کوئی صورت نظر نہیں آتی لہٰذا اب تھوڑا سا کسی دوا خانے سے مرہم منگوائیے تاکہ اُن سب کو کسی نہ کسی طریقہ پر جوڑا جائے۔

غرض دل ٹوٹنے کے بعد بھی مرزا صاحب کے دل کے ٹکڑے محبوب کے لیے ایک اچھی بھلی مصیبت بنے رہے۔

بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

پروازِ شوقِ ناز : یعنی شوقِ ناز کی پرواز۔

کہتے ہیں کہ قیامت کے روز حضرت اسرافیل صور پھونکیں گے اور صور پھونکتے ہی دنیا میں ایک ہیجان اور تلاطم بپا ہو جائے گا اور آندھیاں چلنا شروع ہو جائینگی ان آندھیوں کا اثر اتنا ہیبت ناک ہوگا کہ مُردے اپنی اپنی قبریں چھوڑ چھوڑ کر نکل بھاگیں گے مگر مرزا صاحب کا خیال ہے کہ جن لوگوں نے محبوب کے ہاتھوں شہادت کا رتبہ حاصل کیا ہے وہ اُسی طرح اپنی اپنی قبروں میں ڈٹے رہیں گے اُن میں سے کوئی صاحب اُٹھ کر یہ بھی دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کریں گے کہ دوسرے مُردے اپنی اپنی قبریں چھوڑ کر کیوں بھاگ رہے ہیں۔ اُن کے قبروں سے نہ اُٹھنے کا جواز مرزا صاحب یہ پیش کرتے ہیں کہ صاحب! وہ تو جس وقت دفن کیے گئے تھے اُسی وقت اُن کے تمام جسم شوقِ جاناں میں تحلیل ہو گئے تھے لہذا اب اُن کی قبروں میں ہے کون جو اُٹھے؟ اُن سب قبروں پر عجب نہیں جو "خالی" کی تختی لگا دی گئی ہو۔ یعنی یہ کہ شہیدانِ وفا کی قبریں "کرایہ کے لیے خالی" میں اور چونکہ یہ سب شہیدانِ وفا داور محشر کے سامنے حاضر نہ ہو سکیں گے اس لیے وہ قیامت کی دارو گیر سے بے نیاز ہو جائینگے اسی لیے وہ قیامت سے چنداں خوف زدہ نہیں ہیں کیونکہ اب ان میں پروازِ شوق کے کچھ آثار ہوں تو ہوں ورنہ ان کی قبروں میں اب ہے کیا جس سے وہ ڈریں لہذا ان کے لیے قیامت ایک معمولی طوفانی ہوا سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔

: لڑنا ناصح سے غالب کیا ہوا اگر اس نے شدت کی　　ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ان مولویوں اور نصیحت کرنے والوں نے تو ہمارا ناک میں دم کر رکھا ہے جب دیکھئے کھڑے نہایت ترش روئی سے نصیحت فرما رہے ہیں کہ عشق و جنون سے دست کشی اختیار کر لو یقین مانیے کہ اگر نصیحت، نصیحت کے انداز میں کی جاتی تو بھی قابل قبول ہو سکتی تھی مگر یہ کیا ہے کہ ادھر دیکھا ادھر نہایت ترش و تلخ لہجہ میں فرمانے لگے کہ دیکھئے آپ عشق سے باز آئیے نہیں تو اندھیرے جائیں گے سمجھو تو ہمارا معاملہ تو یہ ہے کہ ہم تو خیر عاشق و مجنوں ہیں اور ان مولوی ملاؤں کی بات کو گدھے کی لات سمجھتے ہیں مگر کوئی صاحب اپنے ایک ادنیٰ غلام سے اس انداز میں مخاطب ہو کر دیکھ لیں تب پتہ چلے تو وہ موجود ہیں بر پیادگی کی نوبت نہ آجائے ان مولویوں نے خیال ڈال کر ہم کو کوئی غلام اور بچہ سمجھ رکھا ہے جو ہم پر اتنی سختی فرما رہے ہیں۔

ناصح صاحب کے اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر ہم پہلے چھٹانک بھر عاشق تھے تو اب ان کی ضد میں دو چھٹانک وزن کے عاشق ہو گئے ہیں اور ہماری وحشت اور ہمارا تاؤ ان کے طرز عمل کو دیکھ کر اتنا بڑھ گیا ہے کہ اب ہم بالکل بے قابو ہو کر ان کے گریبان میں ہاتھ ڈالنے پر آتے ہیں لیکن پھر یہ سوچ کر ضبط کئے ہوئے ہیں کہ مولوی صاحب ہی تو ہیں ان سے کیا لڑیں اگر وہ اتنا ترش و تلخ لہجہ اختیار کئے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ہاں وہ تو اسی کی روٹی کھاتے ہیں۔ اسی لیے مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ہاں جو کچھ تاؤ ہے وہ ہم اپنے گریبان پر جو بلا شرکت غیرے ہمارا ہی گریبان ہے، اپنا غصہ گرمی اتار لیں گے۔ اور اپنی وحشت کا علاج اپنے گریبان پھاڑ کر خود کر لیں گے کیونکہ یہ فعل تو بہرحال ہمارا اختیاری فعل ہے اور جب ان

ناصح صاحب کو اس کی اطلاع ہوگی تو اُن کو معلوم ہوگا کہ اُن کی نصیحت کا ہم نے کس حد تک اثر قبول کیا۔

غزل نمبر ۵

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات

دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

اس شعر سے تو کچھ ایسا گمان ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کی محبوبہ کوئی ترک تھی جو علاوہ ترکی زبان کے دوسری زبانوں سے نابلد تھی۔ اس شبہ کو تقویت اس سے بھی ہوتی ہے کہ خود مرزا صاحب بھی اپنے کو ترکی النسل بتاتے تھے اور چونکہ وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے اس لیے اپنے بزرگوں کی زبان سے ناآشنا تھے ورنہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مرزا صاحب کا تجربہ ہے لاکھوں التجائیں کرنا اور ان محترمہ کے کان پر جوں تک نہ رینگنا کیا معنی؟ "نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات" سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ محترمہ ترکی زبان کے علاوہ کوئی زبان نہیں جانتی تھیں اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ نہ تو وہ سمجھی ہیں اور نہ آئندہ ان کی بات سمجھنے کا کوئی امکان ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ مرزا صاحب جب خوشامد کے تمام منازل طے کر چکے تو آخر میں بارگاہِ ایزدی میں سر بسجود ہو گئے اور انھوں نے گڑگڑا گڑگڑا کر مناجات شروع کر دی کہ اے مقلب القلوب اگر میری زبان میں کوئی اثر نہیں ہے اور تو نے مجھے ایسی زبان عطا کی ہے جسے وہ سمجھنے سے قاصر ہیں تو پھر اپنی رحمت کے صدقے میں اُن کا دل ہی پھیر دے تاکہ وہ مجھ پر مہربان ہو جائیں یا پھر ترکی زبان کے علاوہ ہندی اُردو بھی سمجھنے لگیں۔ اس سلسلے میں مرزا صاحب نے ایک تیر سے ممکن ہے کہ دو ہرن زخمی کئے ہوں

اوّل محبوب کی حالت بیان کی ہو یا پھر اُن لوگوں کی طرف اِس شعر میں اشارہ کیا ہو جو اُن کے کلام کو بے معنی یا بعید الفہم کہتے تھے۔

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اُٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جان اور

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کی محبوبہ پر مرزا صاحب کے علاوہ دو چار ہزار دوسرے حضرات بھی جان دے چکے تھے اور ان کے دل و جان کباڑیوں نے تھوک میں خرید کر جامع مسجد میں پرانے مال کی دکانوں میں لگا رکھے تھے جس کی وجہ سے مرزا صاحب کو توقع تھی کہ اگر وہ یعنی محبوبہ زندہ ہیں تو مارکیٹ میں نئی نئی وضع اور نئے نئے ڈیزائن کے دل و جان آتے رہیں گے اور اُن کی کمی نہیں رہے گی اور چونکہ پرانے دھرانے دل بازار میں ہلکی پھلکی قیمت پر یا مفت مل جائیں گے اس لیے اگر محبوب نے ان کے دل و جان کو پسند فرمایا اور لے لیا تو خالی جگہ پر پرانے استعمال شدہ دل لگا کر اپنا کام چلا لیا جائیگا۔ اسی لیے مرزا صاحب ہر وقت اپنے محبوب سے مطالبہ کرتے رہتے تھے کہ واللہ قیمت کی کوئی بات نہیں اگر آپ کو دل و جان پسند ہیں تو حاضر ہیں آپ لے لیں" اس پر محبوب نے کہا کہ نہیں صاحب یہ تو کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ آپ بغیر جان و دل کے ادھر اُدھر پھریں اور جا دیجہ آپ کی گھر والی کو یہ چیز گراں گزرے" اس پر مرزا صاحب نے فرمایا کہ اگر آپ کو اس کا خیال ہے تو آپ بالکل پریشان نہ ہوں کیونکہ اگر خدا نخواستہ کوئی ایسی ضرورت لاحق ہوئی تو میں بازار سے پرانا استعمال شدہ دل خرید لوں گا کیونکہ آپ کی موجودگی میں پرانے دھرانے دلوں کی کیا کمی ہے۔؟

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

مرزا صاحب اس شعر میں فرماتے ہیں کہ کوچۂ عشق میں صرف وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو مار کھانے اور گھس کر تماشہ دیکھنے والے ہاتھ پاؤں رکھتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب آپ سر اور دھڑ کی بازی لگا کر عاشق ہوئے تھے اُسی وقت آپ نے سوچ لیا ہوگا کہ ایک دن محبوب کے ہاتھوں جام شہادت نوش کرنا برحق ہے لہٰذا اب ہمارے لئے قتل ہونے لہو بہ سر اڑنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ آپ کھڑے ہو کر ہم کو جلاد سے پٹوائیں اور اگر ذرا بھی پٹائی میں کمی دیکھیں تو کہیں کہ ہاں ذرا اور کس کے مرمت کرو! آپ کی اس ہاں ہاں سے ہمارے سارے کے سارے پیسے جو ہم نے عشق میں لگائے ہیں وصول ہو جائیں گے اور سر اڑنے کی کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

لیتا نہ اگر دل تمہیں دیتا کوئی دم چین　　کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

مرزا صاحب جب سے عشق کے چکر میں آئے اُس وقت سے مرتے دم تک اُن کو چین نصیب نہ ہوا جب دیکھئے مضطرب اور بے چین نظر آ رہے ہیں اُن کے اضطراب کو دیکھ کر اُن کے محبوب نے کہا کہ مرزا صاحب آپ کو چاہئے کہ تھوڑی دیر سکون اور اطمینان سے گھر پر آرام کریں اس پر مرزا صاحب نے جواب دیا کہ صاحب چین و آرام تو اُسی دن سے ہمارے مقدر سے اُٹھ گیا جس دن سے ہم آپ پر عاشق ہوئے۔ بھلا دل دینے کے بعد کس کو چین نصیب ہوا ہے جو ہم کو نصیب ہوگا۔ یقین مانئے اب تو آہ و فغاں کی پٹی پاؤں میں بندھی ہوئی ہے اور یہ ساری زندگی اسی طرح آہ و فغاں کرتے گزرے گی البتہ اگر اب مجھے چین و سکون نصیب ہو سکتا ہے تو صرف موت سے۔ ورنہ آپ کے سر عزیز کی قسم اگر آپ کی محبت میں مر نہ گیا ہوتا تو جب تک زندہ رہتا۔ آہ و فغاں کی آوازیں میرے گھر سے آتی رہتیں۔

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے　　رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور
برسات میں جب نکاس کی جگہ کوڑا اٹ جاتا ہے تو نالے کا پیٹ بے پناہ پھول
جاتا ہے دریائے جمنا میں جب بند باندھ دیا جاتا ہے تو پانی جو بند سے ٹکرا کر واپس
ہوتا ہے وہ بہت سے قریب کے علاقوں کو تباہ کر دیتا ہے اور اُس کے دھارے میں
ایک غیر معمولی ہیجان اور تیزی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مرزا صاحب کی طبیعت بھی
کچھ اسی قسم کے سیلاب زدہ نالے کی سی تھی۔ ان کے دل میں جو نالے آہ و فغاں کے
تھے اگر وہ سر ہونے سے رک جاتے۔ تھے تو اُس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ اُن کی طبیعت میں
ایک غیر معمولی روانی پیدا کر دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی شخص کو آپ تکلیف پہنچائیں
یا کوئی شخص عشق کی چوٹ کھائے ہوئے ہو اور اس کے ڈر سے وہ ایک لفظ زبان
سے نہ نکال سکتا ہو تو لامحالہ وہ شاعری پر اُتر آئے گا اور اشعار کی معرفت اپنے عشق و
محبت کے جذبے کو خارج کرنا شروع کر دے گا۔ اُس کے اشعار میں بھی وہ روانی اور
وہ زور ہو گا جیسا کہ بند بندھے ہوئے نالے میں ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ مرزا صاحب
کے کلام میں جو روانی یا زور تھا وہ اسی وجہ سے تھا کہ وہ عشق کی چوٹ کھائے ہوئے
تھے اور معشوق نے اُن کے جذبات کے نالے پر بند باندھ رکھا تھا۔

غزل نمبر ۲

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

ایک صاحب جن کی زندگی حد درجہ مصائب میں گذرتی رہی اور جن کے لیے
دنیا دوزخ سے بدتر ہو گئی تھی انھوں نے گھبرا کر خودکشی کر لی اب آپ جانتے ہیں کہ

خودکشی کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کے ہاں سخت سزا دی جائے گی اس شعر میں مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ مرنے کے بعد جب داورِ محشر کے سامنے اُن کا اعمال نامہ پیش ہوا تو حکم ہوا کہ ان کو جہنم میں ڈال دو۔ یہ سُنکر فرشتے مرزا صاحب کو جہنم لے جانے لگے مگر ایک فرشتہ ان کو دوبارہ لے کر داورِ محشر کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے عرض کی کہ اے پاک بے نیاز! تُو نے اس بندہ کو سزا نہیں دی حالانکہ یہ بڑا سیاہ کار ہے۔ ارشاد ہوا کہ جہنم کی سزا تو دیدی گئی۔ پھر فرشتہ نے عرض کی کہ حضور! یہ سزا تو کوئی سزا ہی نہیں ہوئی کیونکہ یہ تو جہنم ہی سے آ رہا ہے یہ تو جہنم میں کیا محسوس کرے گا کہ اس کو کوئی سزا ہی نہیں ملی کیونکہ ساری زندگی اس نے ایسے مصائب میں بسر کی ہے کہ جہنم کے مصائب اس کے سامنے ہیچ ہیں لہٰذا اس کو تو جنت میں بھیجنا چاہئے تاکہ جن چیزوں کا یہ عادی نہیں رہا ہے ان چیزوں سے اس کو دوچار ہونا پڑے۔ مرزا صاحب کی طبیعت بھی کچھ اسی قسم کی تھی اور قدرت نے ان کے خمیر میں وحشت اس درجہ دے رکھی تھی کہ کہ ہر دم وحشت ہی اُن پر سوار رہتی تھی ہرن کی طبیعت میں رمیدگی اور وحشت فطری ہے اس کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں چنانچہ مرزا صاحب کی وحشت کا علاج اس طرح کیا گیا کہ کسی حکیم نے مشورہ دیا کہ ان کو کچھ عرصہ جیل میں بند کر دیا جائے طبیعت رو بہ اصلاح ہو جائے گی مگر انھوں نے کوئی اثر قبول نہ کیا اس کے بعد ایک صاحب نے مشورہ دیا کہ کچھ عرصہ آزاد چھوڑ دیا جائے تب بھی ان پر وہی وحشت طاری رہی اس کے بعد تجویز ہوئی کہ ان کو بالکل بے سروسامان چھوڑ دیا جائے شاید اس سے یہ وحشت دور ہو جائے ایک صاحب بولے کہ حضرت! اگر وحشت دور کرنا ہے تو ان کے گرد و پیش سامانِ عیش و نشاط فراہم کر دیا جائے وحشت کا سارا نشہ ہرن ہو کر

رہ جائے گا چنانچہ ان کے لیے رنڈیوں کے مجرے، بھانڈوں کی نقلوں کا انتظام کیا گیا۔ دو ایک ٹوکیوں میں لے جایا گیا دس پانچ فلم دکھائے گئے مگر انھوں نے اس کا بھی اثر قبول نہ کیا کیونکہ یہ اپنی فطرت میں وحشت لے کر آتے تھے آخر میں ہر قسم کی شرابیں پلائی گئیں کہ شاید غنودگی کے عالم میں ان کو سکون میسر ہو مگر بجائے اُن پر نشہ غالب ہونے کے اُس حالت میں بھی یہ نشہ پر غالب رہے آخر میں سبھوں نے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا چنانچہ یہ چھٹتے ہی صحرا کی طرف بھاگے اور جس طرح ہرن چھٹنے سے گھبرا کر چوکڑیاں بھرتا ہوا فرار ہوتا ہے اُسی طرح یہ بستی والوں سے پیچھا چھڑا کر صحرانوردی پر اُتر آئے۔

غزل نمبر ۷

برنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک طپیدن پر

مرزا صاحب کی ہر بات انوکھی اور نرالی ہوتی تھی ہم آپ جب پہاڑا پڑھتے ہیں تو دو دونی چار اور دو تیے چھ قسم کی چیزیں دہراتے ہیں مگر مرزا صاحب کے پہاڑے میں جدت اور گنتی میں ندرت ہوتی تھی چنانچہ اس شعر میں انھوں نے ہزار آئینہ دل کے معنی ہزار دل کے لیے ہیں اس میں لفظ آئینہ زائد ہے جس طرح ہزار زنجیر فیل، ہزار دانہ انبہ، ہزار نفر سپاہی وغیرہ "بال" "یک طپیدن" میں بال زائد ہے طپیدن کو بھی بال فرض کر لیا گیا ہے دل اور آئینہ میں حیرانی اور صفائی مشترک ہے اسی طرح مرغِ بسمل کے بال میں اور نفسِ طپیدن میں تڑپ مشترک ہے۔ نیرنگِ بیتابی کے معنی فسونِ بیتابی کے ہے۔ یعنی بیتابی نے جادو کیا ہے۔

اس شعر میں مرزا صاحب اپنی بیتابی اور عشق میں پیچ و تاب کھانے کا ذکر کرتے

ہیں جس طرح آگ سے کاغذ پیچ و تاب کھاتے ہوئے جلتا ہے اُسی طرح عشق میں مرزا صاحب پیچ و تاب کھاتے ہیں اور تڑپتے ہیں بات یہ ہے کہ مرزا صاحب چونکہ ترکی نسل تھے لہٰذا ان کے یہاں کسی سے دھونس کھانے کا سوال ہی نہ ہوتا تھا۔ مگر جب عشق کے جھمیلے میں پھنسے اور محبوب کے انتظار میں جتنا بی بڑھی تو یہ پوری طرح پیچ و تاب پر اتر آئے اسی لئے مرزا صاحب کے یہاں وہی پیچ و تاب ہے جو عاشقوں کے یہاں ہوتا ہے یعنی عاشقوں کی ایک تڑپ کئی ہارس پاور کی ہوتی ہے اور ان کی ایک ایک تڑپ میں ہزاروں دل بندھے ہوتے ہیں جو ان کی تڑپ کے ساتھ اُچک پھاند شروع کر دیتے ہیں۔ بہر حال مرزا صاحب نے اس شعر میں کئی ہزار ہارس پاور کی تڑپ کا ذکر کیا ہے۔

فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضہ ہے
متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

عیش رفتہ = گذری ہوئی خوشیاں ۔ متاع بردہ = چوری کیا ہوا مال

خدا نہ کرے کہ انسان تعیش کی زندگی گذارنے کے بعد مفلس ہو جائے کیونکہ ایسے لوگ ساری زندگی بیکار رہتے ہیں اور پدرم سلطان بود پر اتر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضت! ہماری جیسی ہوئی شکل پھٹے ہوئے کپڑوں اور مڑے ہوئے جوتوں کو مت دیکھئے واللہ انھیں پیروں نے گینڈے کی کھال کے جوتے پہنے ہیں اور والد صاحب قبلہ تھے ہیں سڑکوں پر ہاتھی کی پیٹھ پر بٹھا کر سویرے سے شام تک گھومتے تھے اور گرد و پیش لوگ حضور حضور۔ اور سرکار سرکار کے نعرے بلند کرتے تھے ایسے لوگ یہ بھی کہا کرتے ہیں تھے کہ ارے صاحب وقت کی بات ہے ورنہ آپ دیکھتے کہ اقبال پھر یاوری

کرے گا اور آج جو آپ ہمیں ذلیل سمجھتے ہیں ایک دن ہم پھر بلندی پر ہوں گے اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اگرچہ فلک نے عیش رفتہ کو باقی رکھا اور نہ ہمارے حالات کو اچھی حالت میں رہنے دیا مگر واللہ یقین مانئے کہ سامانِ تعیش جو فلک کج رفتار نے ہم سے چھین لیا ہے وہ ایک قرضہ ہے جو ایک دن ادا ہو کر رہے گا۔

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

جب کسی کو کسی چیز کی چاٹ پڑ جاتی ہے تو پھر اسی میں اس کو مزہ آتا ہے۔ بیڑی پینے والے کی خدمت میں اگر آپ اپنی گولڈ فلیک کی ڈبیا پیش کریں تو وہ یہ کہہ کر معذرت کرے گا کہ حضرت! جو لطف اس بیڑی میں ہے وہ بھلا گولڈ فلیک کو کہاں نصیب؟ یہی حال انسان کی دوسری عادتوں کا ہے اگر جرائم پیشہ جرم کرنے کا عادی ہے تو اس کو جرائم میں جو مزہ ملتا ہے اور پولیس کے تشدد میں جو حلاوت نصیب ہوتی ہے وہ کہیں نصیب نہیں ہوتی۔ عشاق کو ان کے معشوق کونسی ایسی مار ہے جو نہیں مارتے ہیں مگر جب دیکھئے وہ کوچۂ محبوب میں ٹہل ٹہل کر بیڑیاں کے تڑے پیتے دکھائی پڑیں گے۔ مرزا صاحب کے عاشق پر بھی ہزار دن مظالم محبوب نے توڑے ہیں یہاں تک کہ ایک دن انھیں گھائل کر کے قتل کر دیا مگر گھائل ہو جانے کے بعد بھی وہ حضرت چھپکلی کی دم کی طرح تڑپ تڑپ کر قاتل سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہاں دو ایک ہاتھ اور لگا۔ بڑا مزا آرہا ہے بلکہ جوشِ محبت میں فرماتے ہیں کہ ابھی جتنے عاشقوں کی جانوں کی قربانی آپ کریں اور جے ہزار عشاق آپ کے ہاتھ سے جامِ شہادت نوش فرمائیں اس کی پرواہ مت کیجئے ان سب کی ذمہ داری اور ان کا خون آپ کا یہ بندۂ ناچیز اپنی گردن پر لینے کو تیار ہے۔

غزل نمبر۱

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

انتہائی محبت اور شفقت کے جذبے سے سرشار ہو کر جس طرح کوئی باپ اپنے بیٹے کو ڈانٹتا ہے اُسی طرح اس شعر میں مرزا صاحب زین العابدین خاں عارف کے انتقال پر اظہار رنج و ملال کے ساتھ مرحوم عارف پر بگڑ رہے ہیں۔ عارف مرزا صاحب کی بیوی کے بھانجے تھے اور مرزا صاحب کو اُن سے غیر معمولی محبت تھی کچھ عزیز داری کی بنا پر اور کچھ اس وجہ سے کہ وہ نہایت خوش فکر شاعر تھے چنانچہ مرزا صاحب اُن کی جوانا موت پر اظہار خیال فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں تم سے بار بار کہتا تھا کہ تم میرے بعد آنا تاکہ تم کو مرنے کے بعد تنہائی محسوس نہ ہو اور میں پہلے سے وہاں موجود رہوں مگر تم نے میری بات پر سمجھ کر نہ مانی کہ بوڑھا آدمی ہے سٹھیا گیا ہے یونہی کہتا ہوگا۔ مگر اب جب تم کو وہاں تنہائی ستاتی ہوگی تو تم اپنے دل میں محسوس کرتے ہوں گے کہ کبھی کبھی بڈھوں کی باتیں بھی مان لینا چاہیئے۔ بہر حال اب تو جو غلطی ہوئی وہ ہوئی اب چند روز توقف کرو میں بھی آنے والا ہوں

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد وستد کے
کرتے ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

چونکہ مرزا صاحب قرض کی نوک پلک سے بخوبی واقف تھے اور جانتے تھے کہ بعض قرضے ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کی ادائیگی میں اگر دو چار دن کی تاخیر ہو جائے تو بھی زیادہ شرمندگی کا سوال نہیں پیدا ہوتا لیکن بعض قرض فوراً ہی ادا کرنا ہوتے ہیں مثلاً مغلئے کا قرض فوراً ہی ادا کر دینا چاہیئے کیونکہ وہ قبر تک پیچھا نہیں چھوڑتا۔

چنانچہ جان فرماتے ہیں کہ جو مالک حقیقی کی ایک امانت ہے اُسے لوٹانا ہر شخص کے لیے ضروری ہے لیکن یہ ایک ایسا قرض ہے کہ فوراً ہی اگر نہ بھی ادا کیا جائے تو کوئی حرج نہیں اب مرزا صاحب عارف سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تمھیں جب یہ امانت لوٹانا ہی تھی تو زودایک بار تقاضے آتے اور تم کہلوا دیتے کہ اِس وقت گھر پر موجود نہیں ہیں بازار گئے ہوئے ہیں یا کوئی دوسرا بہانا کر دیتے کہ صاحب آج اندو پاک مشاعرہ کے سلسلہ میں سری رام صاحب کی کوٹھی پر گئے ہوئے ہیں مگر تم نے عام قرضداروں کے مسلک سے ہٹ کر یہ نئی بات کی کہ پہلے ہی تقاضہ پر سارا قرضہ ادا کر دیا ارے میاں! قرض لینا اور قرض دینا علم دریاؤ ہے اِس کو ہر شخص نہیں سمجھتا یہ باتیں تجربے سے آتی ہیں۔

ردیف (ز)

غزل نمبرا

ہے ناز مفلساں زرِ از دست رفتہ پر ہوں گل فروش شوخی داغ کہن ہنوز

آپ نے دیکھا ہوگا کہ اگر کوئی دولت مند گردش روزگار کے ہاتھوں مفلس ہو جاتا ہے تو اُس کے دماغ سے امارت کی بوباس ایک زمانہ تک نہیں جاتی اور اُس میں وہ تمام کمزوریاں باقی رہتی ہیں جو امیرانا ٹھاٹ باٹ کی خصوصیات ہیں مثلاً یہ کہ اگر حقہ بھرنے میں ذراسی تاخیر ہو جائے تو خواہ بیوی ہی حقہ کیوں نہ بھر رہی ہو مگر اُسے بھی یہ حضرت اِس طرح ڈانٹیں گے کہ گویا وہ ان کی کوئی زرخرید لونڈی ہے۔ چنانچہ یہی حال مرزا صاحب کا تھا چونکہ زندگی میں

ہر قسم کے ٹھاٹ کئے تھے اور جوانی نہایت آرام و سکون سے گذری تھی لہذا تیور وہی تھے یہی حال ایک رٹائر پہلوان کا ہوتا ہے کہ خواہ اُسے لنگوٹ اُتارے کتنا ہی عرصہ کیوں نہ گذر گیا ہو مگر جب بات کرے گا تو اُس میں وہی پہلوانی تیور ہونگے۔ انسان اگر فطرتاً خوش مزاج ہوتا ہے اور اُس کی طبیعت میں شوخی اور بذلہ سنجی ہوتی ہے تو وہ لاکھ جوانی سے اتر جائے مگر بڑھاپے میں بھی اُس کے منہ سے کچھ فقرے ایسے نکل جاتے ہیں جس سے گرد و پیش بیٹھنے والے مسکرا دیتے ہیں آپ نے بڑے بڑے شعراء کو دیکھا ہوگا کہ اکثر غزلوں میں وہ محبوب کے رخسار یا اُس کی زلفوں اور شوخیوں پر ایسے انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں گویا حسین لڑکیاں اور عورتیں اُس گئی گذری عمر میں بھی آپ پر جانیں قربان کرتی ہیں چنانچہ مرزا صاحب کے عشق کا داغ اگرچہ کئی برسات دیکھ چکا تھا اور پرانا ہوگیا تھا مگر اس حالت میں بھی اُن کے اشعار بڑھاپے میں بھی ویسے ہی شوخ و شنگ ہوتے تھے جیسے کہ جوانی میں ہوا کرتے تھے۔

غزل نمبر ۲

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

حریف کے معنیٰ دوست یعنی کام بنانے والا یا مقابلہ کرنے والا۔

فسونِ نیاز معنیٰ عاجزی۔ منت دعا

فرماتے ہیں کہ انسان کو بعض اوقات ٹکے کا جواب ٹکے سے دینا پڑتا ہے مقصد یہ کہ مشکل کے مقابلہ میں بعض اوقات عاجزی کارگر نہیں ہوتی مثلاً آپ کوئی امتحان دیکر آئیں اور گھر میں آکر وضو کر کے نہایت عاجزی اور گڑگڑاہٹ کے ساتھ بارگاہِ ایزدی میں دعائیں مانگنا شروع کر دیں کہ اے پاک بے نیاز مجھے اس امتحان میں پاس کر دے

اگرچہ میں پرچہ خراب کر کے آیا ہوں تاہم تیری رحمت کا طالب ہوں اور اس کے بعد آپ اگر اطمینان کر کے بیٹھ جائیں کہ اب تو دعا کر ہی لی ہے فیل ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور اس کے بعد جو نتیجہ آئے تو آپ کا نام اخبار میں نہ ہو اور آپ اس کا عہد کر لیں کہ اب امتحان دینے سے کوئی نتیجہ نہیں کیونکہ دعاؤں کے بعد بھی آخر نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا اور اس کے بعد آپ اپنی کوششوں کا سلسلہ ختم کر دیں مرزا صاحب اس شعر میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مشکلات کا حل عمل پیہم اور سعی مسلسل سے ہوتا ہے ورنہ یوں لیٹے لیٹے دعائیں کرنے سے مقصد پورا نہیں ہوتا اور بغیر کوشش کے مقصد براری کی امید ویسی ہی بے معنی ہے جیسے حضرت خضرؑ کی درازیٔ عمر کی دعا مہمل ہے۔

غزل نمبر ۳

یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت نقش پا میں ہے تپِ گرمیٔ رفتار ہنوز

یک قلم معنی بالکل یا پورا صفحۂ دشت معنی صحرا

مرزا صاحب کے رگ و پے میں چونکہ عشق و محبت کی کرنٹ دوڑتی رہتی تھی اس لیے کسی ایک جگہ اُن کو قرار نہ تھا عشق کی کرنٹ نے ان کی رفتار کو بجلی کے مانند تیز کر دیا تھا اس لیے وہ چشم زدن میں بڑے بڑے میدانوں اور صحراؤں کو عبور کر لیتے تھے اُن کے نقش پا میں باوجود پیران سالی عشق کی اتنی حرارت تھی کہ اگر صحرا پر سے گذرتے تو دشت و صحرا کو ایک قسم کا بجلی کا شاک لگتا اور زمین کاغذ کی طرح جل جاتی اس شعر میں مرزا صاحب اپنی عشق کی کرنٹ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ معلوم نہیں کہ نقش پا کی یہ حرارت کب دور ہو۔ اس نقش پا کی حرارت سے آپ اندازہ کر سکتے

ہیں کہ مرزا صاحب کی گرمیٔ رفتار اور وحشت میں کیا زور ہوگا جب نقش پا کا یہ عالم ہے کہ وہ زمین جھلسائے دیتا ہے تو ظاہر ہے کہ ان کی گرمیٔ رفتار وحشت کی فراوانی کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہو سکتا کہ وہ کیسے بارس پا ورکی ہوگی۔

غزل نمبر ۴

واقعہ سخت ہے اور جان عزیز تاب لائے ہی بنے گی غالب

مرزا صاحب اس شعر میں فرماتے ہیں کہ واللہ جب موت کا تصور کرتا ہوں تو جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کیونکہ موت کا واقعہ بڑا سخت ہوتا ہے۔ نہ جانے کیسا سناں لگتا ہوگا کہ انسان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہوں گی اور جان پھر سے اڑ جاتی ہوگی مگر سوال یہ ہے کہ موت سے بھاگ کر جائیں تو کہاں جائیں ایک دن بہرحال ہر شخص کو پیش ہونا ہے اور ہم آپ بھی پیش ہو کر رہیں گے۔

غزل نمبر ۵

میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز تو اور آرائش خم کاکل

مرزا صاحب زندگی بھر اپنی محبوبہ کو مشکوک نظروں سے دیکھتے رہے چنانچہ وہ بھی مرزا صاحب کو پریشان کرنے کے لیے نئے نئے ہتھکنڈے اور داؤں وضع کرتی تھی مثلاً وہ آئینہ کے سامنے کھڑی اپنے بالوں میں کنگھی کر رہی ہے کہ مرزا صاحب کے دل میں خیال پیدا ہونا شروع ہوا کہ ہو نہ ہو رقیب کے گھر جانے کے چکر میں یہ بناؤ سنگار ہو رہے ہیں چنانچہ وہ بھی مرزا صاحب کو پریشان کرنے کے لیے دن بھر اپنے جوئیں دیکھ دیکھ کر کنگھی کرتی رہتی اور مرزا صاحب کو تپاتی رہتی۔ مرزا صاحب کو ہمیشہ بہت دور کی سوجھتی تھی چنانچہ مصرع ثانی میں اندیشہ ہائے دور دراز زلف کی درازی کی مشابہت سے کہا ہے

اور پہلے مصرع میں زلفوں کے بنانے سے مرزا صاحب ہم آپ سب پر یہ دھونس ڈالنا چاہتے ہیں کہ ان کی محبوبہ کی زلفیں ایسی نہیں تھیں کہ محض گدی سے چار چار انگل باہر نکلی ہوں اور یہ خدا ناکردہ کسی پر کٹی مغرب زدہ لڑکی جیسی تھیں بلکہ وہ کوئی بنگالن و نگالن تھی جس کے بال اور زلفیں کمر سے نیچے تک چلی گئی تھیں چنانچہ اس کے بالوں کی لمبائی کی مناسبت سے مرزا صاحب کو بڑے لمبے لمبے خطرے بھی لاحق ہوتے تھے۔

اے ترا غمزہ یک قلم انگیز اے ترا ظلم سر بسر انداز

انگیز اردو زبان کا مصدر جس کے معنی برداشت کرنا لہٰذا انگیز کے معنی ہیں برداشت مراد اسی سے ہے۔ قابل برداشت انداز معنی غمزہ ادا۔

مرزا صاحب کا یہ شعر تو یونیٹری میتھڈ کا ایک اچھا بھلا سوال معلوم ہوتا ہے جس میں عام طور پر کچھ اس نوعیت کے سوال ہوتے ہیں کہ دو گدھے مل کر ایک کام کو چار گھنٹے میں کرتے ہیں تو بتائیے دو بکرے اسی کام کو کتنے دن میں انجام دیں گے جبکہ ایک بکرا ایک گدھے کے برابر کام کرتا ہے۔ مرزا صاحب نے فارسی مصادر انگیختن اور انداختن سے دو حاصل مصدر لا کر حسب عادت لفظوں کی تہوں میں سیدھے سادھے مطلب کو چھپانے کی کوشش کی ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ محبوب کا ظلم اور انداز ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ انگریزی میں جیسے (ہارس) Horse کہتے ہیں اسی کو اردو میں گھوڑا کہتے ہیں چنانچہ محبوب کا ظلم بالکل اسی انداز کا ہے اور انداز کا دوسرا نام ظلم ہے۔ دونوں میں ذرہ برابر فرق نہیں اب رہے شتر غمزے تو وہ بھی چور کے بھائی گرہ کٹ گویا وہ بھی ناز و انداز کا جامہ پہنے ہوئے ہیں۔ پس

تحقیق کر ثابت ہوا کہ غمزہ برابر انداز کے اور انداز برابر ظلم کے اور ظلم برابر غمزہ و انداز کے لہذا سارا ظلم برابر ہے قوت برداشت کے۔ آپ نے اقلیدس کے مثلث کی شکل میں بھی اس شعر کو ممکن ہے کہ دیکھا ہو۔

ردیف (س)

غزل نمبر ۱

مژدہ اے ذوق اسیری کہ نظر آتا ہے   دام خالی قفس مرغ گرفتار کے پاس

مژدہ = خوش خبری ۔ ذوق اسیری = گرفتاری کا شوق ۔ قفس = پنجرا

لکھنؤ میں بٹیر باز ایک بٹیر کو جو قد و قامت میں بڑا ہوتا ہے اور پالی میں کسی بٹیر سے ہار جاتا ہے اسے پھندیت کر لیتے ہیں یعنی اس کو ایک پنجرے میں بند کر کے پنجرے کے چاروں طرف کپڑا لپیٹ دیتے ہیں اور بٹیر کو خوب کھانے پینے کو دیتے ہیں جس سے وہ بہت جلد فربہ ہو کر "فٹ، فٹ" کرنے لگتا ہے۔ بٹیر باز جب شکار پر جاتے ہیں تو جال لگا کر اس پنجرے کو ٹانگ دیتے ہیں۔ یہ بٹیر رات میں خوشی میں آ کر فٹ فٹ کرتا ہے جس سے جنگلی بٹیروں کو شبہ ہوتا ہے کہ اس کے ہم جنس وہاں موجود ہیں اور وہ زمین پر جس پر جال بچھا ہوتا ہے گرنا شروع ہو جاتے ہیں اور آن واحد میں سب گرفتار ہو جاتے ہیں۔ مرزا صاحب اس شعر میں فرماتے ہیں کہ عشاق کو قید و بند کے آزار میں چونکہ مزا ملتا ہے اس لیے وہ ہر وقت اس فکر میں رہتے ہیں کہ ان کو کسی معشوق کی محبت میں گرفتار کرا دیا جائے۔ اس شعر کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے کسی کو دام محبت میں گرفتار دیکھ پایا تھا اور اس کا مکان کا پتہ نوٹ کر لیا تھا اب گھر پہنچ کر وہ اپنے ذوق اسیری کو دعوت

دے رہے ہیں کہ چل عاشق کے پڑوس میں ایک مسماۃ رہتی ہیں اُن پر چل کر فریفتہ ہوئے۔ یہاں ہمسائی کے مکان کو خالی قفس قرار دیا ہے۔

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے   خوب وقت آئے تم اِس عاشقِ بیمار کے پاس

اِس سے قبل اسی قسم کا ایک دوسرا شعر مرزا صاحب کہہ چکے ہیں فرماتے ہیں ؎

"مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مرے بالیں پہ اُسے پھر کس وقت

اس شعر سے پتہ چلتا ہے کہ جب تک دوست مرزا صاحب کے محبوب کو مرزا صاحب کا آخری دیدار کرانے لائیں مرزا صاحب پر نزعی کیفیت طاری ہو چکی تھی اور جب مسماۃ اُن کے سرہانے لاکر کھڑی کی گئیں تو صرف آنکھوں میں جنبش باقی تھی جو بے چینی سے اُن کا انتظار کر رہی تھی چنانچہ اُن کے انتظار میں آنکھیں کھلتے کھلتے بند ہو گئیں۔

میں بھی رک رک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے   دشنہ اِک تیز سا ہوتا مرے غم خوار کے پاس

غم خوار = طنزاً غم خوار کہا ہے مراد اس سے دشمن ہے۔ یہ دشمن معشوق بھی ہو سکتا ہے اور رقیب بھی۔ جب مرزا صاحب کی حالت عشق میں ایسی ہو گئی کہ بچنے کی کوئی اُمید باقی نہ رہی تو رقیب دوست یا غم خوار بن کر اُن کی مزاج پرسی کو آیا اور لگا چکنی چپڑی باتیں کرنے مثلاً بولا " کہئے مرزا صاحب کیسی رہی؟ مزاج تو اچھے ہیں آپ تو بہت جلد گھل گئے بھلا عاشق کہیں ایسی تیزی سے گھلتے ہیں خیر اب یہ بتائیے کہ ہجر میں کیا کیا مزے لوٹے "

غرض ٹھہر ٹھہر کر اُس نے مرزا صاحب پر زبان سے چھریاں چلانا شروع کیں۔ مرزا صاحب جو عشق کی چوٹ کھائے ہوئے تھے بڑے سیانے تھے اگرچہ

محبوبہ کی ایک ایک ایذا جان لیوا تھی پھر بھی اگر مرزا کی جگہ کوئی ناتجربہ کار عاشق ہوتا تو شاید ایک چوٹ بھی برداشت نہ کر پاتا اور مرجاتا مگر مرزا صاحب بھی اپنے تجربات کی روشنی میں رک رک کر مرتے رہے۔ دوسرے مصرع میں مرزا صاحب سے اور اُن کے دل سے جو باتیں ہو رہی ہیں اُن کا ذکر ہے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ اس طرح ایذا پہنچا کر اور رگو بر سونگھا سونگھا کر مارنے سے تو بہتر تھا کہ وہ زبان کے بدلے ایک تیز سا خنجر گلے پر چلا دیتے تاکہ ایک ہی وار میں کام تمام ہو جاتا اور یہ جو زبانی چرکے دے دے کر انھوں نے مارا ہے یہ ضرور تکلیف دہ ضرب ہے۔

ذہن شیر میں جا بیٹھئے لیکن اے دل　　نہ کھڑے ہو جیئے خوبانِ دل آزار کے پاس

بیٹھئے اور کھڑے ہو جیئے دو مقابل کے الفاظ اس شعر کی جان ہیں۔

مرزا صاحب کو چونکہ ایک دل آزار معشوق سے سابقہ پڑا تھا لہذا اُس کے چرکوں سے وہ حد درجہ بیزار تھے اور اُن کی زندگی بے حد تلخ ہو گئی تھی رات دن چرکے کھاتے کھاتے ایک دن مرزا صاحب سوچے کہ کاش ہم کو کوئی شیر لقمۂ اجل کر لیتا تو اس طرح گو بر سونگھ سونگھ کر مرنے سے تو نجات ملتی۔

ردیف "ش"

غزل نمبر ا

نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے　　لگاوے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

خس جوہر: آئینہ کی روشن لکیروں کو خس سے تشبیہ دی ہے لفظ سبزہ سے طراوت اخذ کر کے اُس سے خس کو نم کر دیا۔ روئے نگار: دوست۔ آتش رخسار۔

مرزا صاحب کے معشوق کے حسن کا یہ عالم تھا کہ اُس کے دونوں رُخسار اچھے بھلے انگارے معلوم ہوتے تھے جس سے ہر وقت آگ لگ جانے کا خطرہ تھا اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مرزا صاحب کا محبوب کوئی ایرانی النسل معشوق تھا یعنی صنفِ ثقیل میں سے تھا جس کی داڑھی مونچھیں نکل آئی تھیں یا ممکن ہے کہ سبزۂ آغاز ہو چنانچہ اس شعر میں فرماتے ہیں کہ دست کے سبزۂ خط سے جوہرِ آئینہ نے طراوت حاصل کر لی یعنی جب وہ آئینہ دیکھنے کھڑا ہوا تو آئینہ میں تھوڑی سی نمی آ گئی ورنہ اُس کے آتش فشاں رخسار آئینہ میں ضرور آگ لگا دیتے۔ بہر حال مرزا صاحب بڑے نقصان سے بچے ورنہ آئینہ تو جہنم ہی واصل ہو جاتا۔

ردیف "ع"

غزل نمبر

جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع   چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

جادۂ رہ = نشانِ راہ ۔ خور = خورشید ۔ چرخ = آسمان ۔ آغوشِ وداع = کسی کے رخصت ہوتے وقت بغلگیری کے لیے ہاتھوں کو پھیلانا۔

عاشق جب کسی چیز کو دیکھتا ہے تو کسی نہ کسی عنوان سے اپنے معشوق کی یاد کا شغل کر لیا کرتا ہے چنانچہ مرزا صاحب بھی ایک دن شام کو کھڑے سورج کے غروب ہونے کا منظر دیکھ رہے تھے سورج آسمان کی مسافت طے کر کے غروب ہو رہا تھا اور آسمان سے رخصت ہو کر راہِ سفر اختیار کیے تھا شام کے وقت کی شعاعیں اُس کے سفر کی نشان دہی کر رہی تھیں اس لیے یہ شعاعیں نشانِ راہ یا جادہ راہ بن گئیں آسمان اپنے اس نورانی عزیز

دوست سودرج کو بڑی محبت سے رخصت کر رہا تھا اس وقت مرزا صاحب کو اپنا محبوب یاد آگیا کہ ہائے اس کا محبوب مرزا صاحب سے بوقت رخصت بغلگیر ہونے کے لیے اپنے ہاتھوں کو کس طرح پھیلا دیتا تھا خدا جانے ایسا واقعہ کبھی پیش بھی آیا یا محض دل خوش کرنے کے لیے مرزا صاحب نے اپنی تخیل پہ زور دیکر گھڑ لیا۔ بہر حال یہ کہہ کر مرزا صاحب قریب کے ایک درخت سے لپٹ گئے۔ معلوم نہیں کیوں؟

غزل نمبر ۲

جلتا ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو ✽ نہ کیوں ہو دل کا دل پہ میرے داغِ بدگمانیِ شمع

مرزا صاحب عاشق ہونے کے بعد ہر چیز کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے تھے اور اُن کو شبہ ہوتا تھا کہ ہر چیز مجھ کو دیکھ دیکھ کر جل رہی ہے اس میں ذی روح اور غیر ذی روح کی کوئی قید نہ تھی چنانچہ فرماتے ہیں کہ اب دیکھئے نا کہ یہ شمع جو جل رہی ہے یہ بھی محض جوش رقابت میں بالینِ یار پر کھڑی جل رہی ہے اس لیے مجھے اس کی طرف سے بھی مستقل طور پر خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ یہ میرے محبوب سے عشق تو نہیں کیے ہوئے ہے۔ اس بدگمانی میں مرزا صاحب جو بیسوں گھنٹے مبتلا رہتے تھے اور اُن کا دل داغ دار ہوتا رہتا تھا چنانچہ فرماتے ہیں کہ وہ مجھ پر جل رہی ہے اور میں اس بات پر پھنکا جا رہا ہوں کہ وہ میرے معشوق پر بلاسبب عاشق ہو کر مجھے جلا کر خاکِ سیاہ کیے دے رہی ہے۔

ردیف "ف"

غزل نمبر ۱

بیم رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش ✽ مجبوریاں تلک ہوئے اے اختیار حیف

بیم رقیب : رقیب کا ڈر ۔ وداع : رخصت

مرزا صاحب کا محبوب مرزا صاحب پر نئے نئے رُخ سے وار کیا کرتا تھا کبھی اپنے جلووں سے مرزا صاحب پر مسمریزم کی مشق کرتا اور ان کو بے ہوش کر دیتا اور کبھی جلووں کے ایٹم بم استعمال کر کے اُن کے ہوش و حواس ختم کر دیتا تھا۔ ایک دن مرزا صاحب کا محبوب اور اُن کا رقیب دونوں پلتھی مارے ایک محفل میں برابر بیٹھے ہوئے تھے۔ مرزا صاحب بھی اتفاق سے اس محفل میں پہنچ گئے یہ محبوب کو دیکھتے ہی بیہوش ہو جانے کے ہمیشہ سے عادی رہے تھے مگر یہاں چونکہ محبوب کے بغل میں اُن کا رقیب بیٹھا نہ جانے کیا کر رہا تھا کہ مرزا صاحب عمداً اُس وقت بے ہوش ہونے کے لیے تیار نہ ہوئے مگر مصیبت یہ تھی کہ ہوش و حواس پر ان کو کوئی اختیار نہ تھا لہٰذا سوچے کہ یارا اگر اس وقت بے ہوش ہوئے جاتے ہو تو یہ رقیب ناہنجار محبوب کو لے کر اُڑن چھو ہو جائیگا یا ان کے بیہوش ہونے کے بعد وہ نہ جانے کہاں کی جھوٹی سچی باتیں ان کے خلاف کہہ کر محبوب کو ان سے متنفر کر دے۔ غرض مرزا صاحب عجیب گومگو کے عالم میں بیٹھے تھے کہ نہ تو بے ہوش ہونے پر قادر رکھتے اور نہ محبوب کے جلووں کی تاب لا سکتے تھے چنانچہ فرماتے ہیں کہ ہم اگر خدانہ کردہ بیہوش ہو جائیں تو اس کا مفہوم دنیا یہ نہ سمجھے کہ ہم رقیب کے خوف سے بے ہوش ہوئے ہیں بلکہ ہمارے لیے مصیبت یہ ہے کہ ہم محبوب کے جلووں کی تاب نہ لا کر برابر بیہوش ہوتے رہتے ہیں مگر اس وقت ہم نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کے عالم میں گرفتار ہیں۔

ردیف "ک"

غزل نمبر ۱

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک ۔۔۔ کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نمک کے بے حد شوقین تھے خواہ وہ نمک زخموں کے ذریعہ، اُن کے جسم میں پہنچایا جائے یا کوئی نمکین چیز انہیں کھانے کو مل جائے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ ہم جب محبوب کے عشق میں دیوانہ ہو کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے تو لونڈے لاڑیوں نے ہم پر خشت زنی شروع کر دی اور ہم جدھر سے نکل جاتے لڑکے ہم کو دو چار پتھر مار کر زخمی کر دیتے مگر چونکہ بچوں میں کسی بات کا سلیقہ نہیں ہوتا اس لیے وہ خشت باری بھی سلیقے سے کرنا نہیں جانتے تھے ورنہ اگر ان میں سلیقہ ہوتا تو سب سے پہلے وہ پتھر مارتے اور جب ہم پتھر سے زخمی ہو جاتے تو گھر جا کر ایک پڑیا میں نمک لا کر ہمارے زخموں پر چھڑک دیتے تاکہ ہم کو نمک کا مزا حاصل ہوتا اور ان کو اپنی خشت باری کا بھی پورا پورا لطف حاصل ہوتا۔ بہر حال اگر ایسا نہیں تھا تو اپنے گھروں میں نمک میں پتھروں کو جوش کرا لیتے اور نمکین پتھر جیب میں ڈال کر نکلتے اور جب ہمیں دیکھتے تو دیکھتے ہی ایک آدھ پتھر ہم پر کھینچ مارتے ہمیں اس سے یہ فائدہ ہوتا کہ نمک پاشی کی علیحدہ ضرورت باقی نہ رہتی اور ہمارے نمک کے دام بچ جاتے مگر ان بدتمیزوں کو پتھر مارنے کا بھی ذرہ برابر سلیقہ نہیں نتیجہ یہ ہے کہ نمک کے شوق میں پہلے ہم اُن کے پتھر کھاتے ہیں اور اس کے بعد ہم کو زخمی حالت میں زخموں پر نمک چھڑکنے کے لیے گھر جانا پڑتا ہے اور بلا سبب ہمارا وقت ضائع ہوتا ہے۔

داد دیتا ہے میرے زخم جگر کی واہ واہ یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہی وہ جس جا نمک

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا محبوب کسی نمک کی کانوں میں ملازم تھا یا کسی ایسے سرکاری دفتر میں ملازم تھا جہاں اُس کے سپرد نمک کی کانوں کا معائنہ کرنا تھا چنانچہ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ہمارا معشوق جہاں کہیں نمک دیکھ پاتا ہے فوراً اُس کو ہماری یاد تازہ ہو جاتی ہے اور ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہتا ہے کہ کاش غالب کو اپنے ساتھ یہاں لائے ہوتے تو تھوڑا بہت نمک استعمال ہو جاتا اور اُس کے زخم جگر پر نمک چھڑک کر دیکھتے کہ آیا نمک میں کوئی میل تو نہیں ہے۔ مرزا صاحب کو جب کسی نے بتایا کہ حضرت آپکو یہ سنکر خوشی ہوگی کہ جب نمک کی کان کا معائنہ کرنے گزشتہ ہفتہ وہ آیا تھا تو آپ کو بڑی طرح یاد کر رہا تھا۔ مرزا صاحب بہت خوش ہوئے کہ لیجئے عشق کے سارے پیسے وصول ہو گئے اور کچھ نہیں تو مجبور ہو کر محبوب کو اُن کے زخم جگر ہی کی داد دینا پڑے گی۔

چھوڑ کر جانا تن مجروح عاشق حیف ہے دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک

غالب کے معشوق کو ایک دن اطلاع ملی کہ جب وہ اُس کے عشق میں دیوانہ وار گھوم رہے تھے تو کسی نے انھیں مجروح کر دیا مگر کسی صاحب کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ جب زخمی کیا تھا تو لپک کر زخموں پر تھوڑا بہت نمک بھی چھڑک دیتے۔ ان کے زخموں کا بھی عجیب خاصہ تھا کہ وہ جسم پر لگتے ہی نمک پاشی کے طالب ہو جاتے تھے اور جب تھوڑا سا نمک چھڑک دیا جاتا تو زخموں کو کامل سکون میسر آجاتا۔

یاد ہیں غالب تجھے وہ دن کہ وجد ذوق میں زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

پلکوں سے چننا تعظیماً و احتراماً۔ پرانے زمانے میں نمک بہت کمیاب تھا اس لیے اُس کی بڑی قدر کی جاتی تھی چنانچہ احتیاط کو اعتقاد میں داخل کر دیا گیا اور سمجھا جانے لگا

کہ اگر کسی کے ہاتھ سے نمک گر جائے تو قیامت کے روز اُس کی ایک ایک کنکری اُس سے پلکوں کے ذریعہ چنوائی جائے گی۔

غالب ایک دن دسترخوان پر بیٹھے تھے اور رنگین چیزوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دوست احباب نے کہا کہ حضرت آپ نے کسی میٹھی چیز سے شوق نہیں فرمایا بولے بھائی میں نمکین چیزوں کا بچہ شوقین ہوں اور اب تو وہ پہلا سا ذوق و شوق باقی نہیں یاد رہے ایک زمانہ تو ایسا گزرا ہے کہ اگر میرے زخموں پر کوئی نمک پاشی کرتا اور اتفاق سے کوئی کنکری زخموں سے نکل کر زمین پر گر جاتی تو میں بڑی احتیاط اور احترام سے اُسے پلکوں کے ذریعہ چن کر زخموں میں دوبارہ رکھ لیا کرتا تھا تاکہ کھانے میں اگر کسی وقت نمک کم ہو جائے تو ہنڈے میں سے نکال کر ڈال لوں۔

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ دیکھیں کیا گذرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

نہنگ : مگرمچھ ۔ صد کام نہنگ : سَو مگرمچھ کے منہ۔

مرزا صاحب کو چونکہ زندگی بھر ہر قسم کی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا تھا اس لئے اُنھیں ہمیشہ اگر کوئی سیدھی بات بھی کرنا ہوتی تو نہایت مشکل انداز میں ادا کرتے اور ہمیشہ ٹیڑھے طریقہ پر ہر چیز کی ناک پکڑا کرتے۔ مثلاً اگر ان کو یہ کہنا ہے کہ انسان کو درجہ کمال تک پہنچنے میں صدہا دشواریاں پیش آتی ہیں تو وہ پہلے اپنی تخیل کو دریا کے قریب لے جائیں گے اُس کے بعد دریا کی موجوں کو پکڑ کر ان کا دھاگا بنیں گے۔ پھر ان دھاگوں سے ایک جال تیار کریں گے۔ جال تیار کرنے کے بعد مگرمچھ پکڑیں گے پھر مگرمچھ کا منہ کھول کر اُس کی لمبائی چوڑائی سے اس کے خطرناک ہونے کا اندازہ کریں گے اُس کے بعد اُس کو چھوڑ کر پانی کے ایک ایک قطرہ کو لیں گے اس کی جانچ کرنے کے بعد اس

بات پر غور کریں گے کہ یہ قطرہ موتی کی شکل کس طرح اختیار کرتا ہے اور قطرۂ نیساں کو گہر بننے
ہیں کتنی مدت لگتی ہے۔ اس لیے وہ فرمائیں گے کہ صاحب سنیئے دریا کی ہر موج ایک دام ہے
اور ہر دام میں سو مگرمچھ منہ کھولے ہوئے ہیں ایسی صورت میں قطرۂ نیساں کے لیے گوہر بننے
تک صدہا خطرات اور مشکلیں ہیں اور آخر میں کہیں گے کہ طالب حق کے لیے منزل
مقصود تک پہنچنے میں صدہا مشکلات ہیں ان مشکلات کو دور کرنے کے بعد ہی منزلِ
مقصود تک رسائی ممکن ہے۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن خاک ہو جائیں گے ہم تمکو خبر ہونے تک

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کا محبوب کسی دور دیہات میں رہتا تھا کیوں کہ
اُس زمانے میں نہ تو پختہ سڑکیں تھیں اور نہ آمد و رفت میں اتنی آسانیاں ہی تھیں جیسی کہ
آج کل ہیں مرزا صاحب دلّی میں مقیم تھے چنانچہ ایک دن یہ محبوب سے اُس کے گاؤں ملنے
گئے۔ اور چلتے وقت اُنھوں نے کہا کہ اچھا صاحب خدا حافظ زندگی کا کیا ٹھیک۔ آج مرے
اور کل دوسرا دن لہذا آپ وعدہ کیجیے کہ اگر ہم مرگئے تو آپ ہمارے جنازے میں شرکت
فرماکر میت کو کاندھا دیں گے۔ محبوب نے پیچھا چھڑانے کے لیے وعدہ کر لیا کہ "ارے
صاحب بھلا ہم آپ کی میت کو کاندھا دیں گے تو کیا اپنی میت کو کاندھا دیں گے چنانچہ
یہ مطمئن ہوکر واپس آگئے اور انھیں پورا یقین ہو گیا کہ وہ ضرور تشریف لائیں گے
دلّی پہنچنے کے بعد مرزا صاحب کا انتقال ہوگیا۔ چنانچہ اس کی اطلاع اُن کے محبوب
کو ہوئی کہ مرزا صاحب انتقال فرما گئے ہیں اور جنازے میں آپ کی شرکت ضروری ہے
مگر اُن کے آنے میں تاخیر ہوئی کیونکہ اُس زمانے میں دور دراز دیہاتوں سے شہر تک
آنے میں ہفتوں صرف ہوتے تھے چنانچہ مرزا صاحب کی تجہیز و تکفین کر دی گئی اور وہ جنازہ

میں شریک نہ ہوسکے۔

ردیف "گ"

غزل نمبر ۱

گر تجھ کو ہو یقین اجابت دعا نہ مانگ یعنی بغیر یک دل بے مدعا نہ مانگ

مرزا صاحب کو ازل میں جو دل ملا تھا اُس میں آرزوؤں اور تمناؤں کو اِس بری طرح ٹھونس دیا گیا تھا کہ وہ ایک دوسرے پر لدی پڑی اُن کے یہاں تک پہنچی تھیں چنانچہ مرزا صاحب اُن آرزوؤں سے سخت عاجز تھے اور آرزوئیں مرزا صاحب سے پناہ مانگے ہوئے تھیں۔ مرزا صاحب دن رات ان آرزوؤں کو پورا کرنے کے سلسلہ میں پریشان رہتے تھے اور اُن کا زیادہ وقت مصلی پر گزرتا تھا مرزا صاحب چاہتے تھے کہ اُن کی ہر دعا قبول ہو جائے مگر دعائیں تھیں کہ قبول ہونے کا نام نہ لیتی تھیں۔ ریس کے گھوڑے کی طرح ہر بار مرزا صاحب اپنی دعاؤں پر داؤں لگاتے کہ اب کی دعائیں ضرور قبول ہونگی مگر ہمیشہ ناکامی اور نامرادی کا انھیں منھ دیکھنا پڑتا۔ آخر تنگ آکر ایک صاحب نے اُن کو مشورہ دیا کہ حضرت! آپ نے بھی تو غضب کیا کہ جس وقت آپ کو دل دیا جا رہا تھا اس وقت مارے ہوکے کے آپ نے اتنی بہت سی آرزوئیں اپنے ذمہ لے لیں۔ آپ نے وہیں عذرداری کیوں نہ کردی۔ جو لوگ دل تقسیم کر رہے تھے اُن سے آپ نے کہا ہوتا کہ حضرت اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی پسند کے مطابق اِس جھوے میں سے اپنی پسند کا دل چھانٹ لوں اس کے بعد آپ اُن دلوں میں سے ایک اچھا سا دل بے مدعا چھانٹ لیا ہوتا مگر اب آپ کر کیا سکتے ہیں اب تو جو غلطی ہو گئی وہ ہو گئی اب آپ سے بھگتیے اب نجات کی ایک

صورت یہ ہے کہ آپ دعا کیجئے کہ اے پاک بے نیاز اس دل کی جگہ ایک ایسا دل عنایت کر جس کا کوئی مدعا نہ ہو تاکہ اس کے بعد آپ کی ساری شر درتیں ختم ہو جائیں اور آپ کو کسی چیز کی حاجت نہ رہے

ردیف "ل"

غزل نمبرا

خوش حال اس حریف سیہ مست کا کہ جو — رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بہ پائے گل

سیاہ مست : رند کی صفت ہے یعنی ایسا رند جس نے خوب شراب پی لی ہو۔ سیاہ مست کی مناسبت سے خوش حالی : خوش نصیبی۔ حریف سیہ مست : ہم پیشہ و رقیب یا دوست۔ یہاں بمعنی رفیق کے۔ اس شعر میں سایہ کی سیاہی میں ایک رعایت ہے۔ دوسرے سایہ ہمیشہ درخت کے پاؤں پر ہی پڑتا ہے۔

مرزا صاحب ہمیشہ اس کے خواہشمند رہے کہ وہ ہمہ وقت محبوب کے قدموں پر سر جھکائے اُس کے عشق میں ضربیں مارا کریں جس طرح گل کا سایہ ہمیشہ درخت گل کے قدموں ہی پر پڑا رہتا ہے یہ بھی اس کے قدموں پر پڑے رہیں۔ عشق و محبت میں ہمیشہ قدموں پر سر رکھنے کی منزل اُس وقت آتی ہے جب محبوب نکاح کرنے پر راضی ہو جائے اس شعر میں مرزا صاحب اس کی آرزو کر رہے ہیں کہ کاش کوئی صورت محبوب سے نکاح کی پیدا ہو جائے جس سے روز روز کی اس مصیبت کا خاتمہ ہو جائے اسی لئے انھوں نے اپنے محبوب سے جنکو انھوں نے اس شعر میں حریف سیاہ مست کہا ہے اس کے قدموں پر گل کے سایہ کی طرح چوبیسوں گھنٹے پڑے رہنے کی آرزو کی ہے حالانکہ مرزا صاحب کو ایک نکاح کرنے کے بعد اس کا تلخ تجربہ ہو چکا تھا کہ جب محبوبہ کا نکاح ہو جاتا ہے تو وہ پہلی پہری کی

طرح سر پر اس طرح مسلط ہو جاتی ہے کہ اس سے جان چھڑانا دشوار ہو جاتا ہے۔

ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لیے بہار میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گُل

نفسِ عطر سائے گُل یعنی گل کی خوشبو یعنی نکہتِ گل

مرزا صاحب جیسا کہ اس سے قبل بار ہا بیان کیا جا چکا ہے ہر چیز کو جو محبوب سے قریب ہوتی تھی اُسے اپنا رقیب تصور کر لیا کرتے تھے خواہ وہ عطر ہی کیوں نہ ہو چنانچہ بہار کے موسم میں پھول کھلتے ہیں اور ان پھولوں سے عطر کشید کیا جاتا ہے جسے جوان جوان لڑکیاں اور لڑکے استعمال کرتے ہیں۔ مرزا صاحب کا بڑھاپے میں جوشِ رقابت اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اب وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ محبوب اپنے کپڑوں میں عطر تک لگائے۔ حالانکہ جوانی میں ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ہر قسم کی زیب و زیبائش کرے مگر مرزا صاحب چاہتے ہیں کہ تمام عطر کے کارخانے توڑ دیے جائیں اور ملک میں عطر بننا بند ہو جائے تاکہ عطر کو اس کا موقع نہ ملے کہ اُسے اُن کا معشوق اپنے کپڑوں میں لگا سکے اس لیے آپ کو نکہتِ گل کی طرف سے خطرہ محسوس ہونے لگا ہے کہ ممکن ہے کہ نکہتِ گل ان کے محبوب کو اغوا کرے۔ اچھا ہوا جو ان کے محبوب نے اُن سے نکاح نہ کیا ورنہ اس کی جان سخت مصیبت میں پڑ جاتی۔

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

مینائے بے شراب = شراب کا خالی شیشہ

دلِ بے ہوائے گل = ایسا دل جس میں گل کی خواہش نہ ہو یعنی بجھا ہوا دل۔

بادِ بہار = موسمِ بہار

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے یہ شعر اُس وقت کہا تھا جب ان کے قوی

بالکل کمزور ہو گئے تھے نہ انھیں موسم بہار کی آمد سے کوئی دلچسپی باقی رہی تھی اور نہ بہار آنے پران کے دل میں کوئی اُمنگ پیدا ہوتی تھی ورنہ بہار کے موسم کا تقاضہ ہے کہ لوگ سیر گل کے لیے چمن میں جائیں اور چونکہ مرزا صاحب پیسے سے ٹوٹے ہوئے تھے اس لیے ممکن ہے کہ مفلسی کی وجہ سے چونکہ وہ شراب نہیں خرید سکتے تھے اس لیے اگر وہ موسم بہار کی اس خواہش کو پورا بھی کرنا چاہتے تو کیسے کرتے کیونکہ بہار سے پورے طور پر لطف اندوز ہونے کے لیے شراب کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ وہ بہار کا لطف کیسے حاصل کرتے کیونکہ ایک طرف تنگدستی اور دوسری طرف جسم میں اتنی توانائی باقی نہیں کہ بہار سے لطف اندوز ہو سکیں اس لیے باد بہار سے شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب شراب ہی نہ ہو تو بہار کے موسم سے کوئی خاک لطف اٹھائے۔

ردیف "م"

غزل نمبر ۱

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

حقیقت یہ ہے کہ صحیح معنوں میں آزاد وہی شخص ہے جو دنیا کے ہر قسم کے رنج و غم سے آزاد ہو اور دنیا کے مصائب کی ذرہ برابر پرواہ نہ کرے چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک نہیں ہزار موتیں ہو جائیں مگر ایک رند مشرب اور آزاد انسان اس کا اثر محض وقتی طور پر قبول کرتا ہے اس کے بعد پھر ہُو حق میں لگ جاتا ہے ہمارے دوستوں میں بھی ایک صاحب اسی قسم کے آزاد واقع ہوئے ہیں ایک مرتبہ ان کے والد صاحب قبلہ بیمار پڑے اور عین اُس وقت جبکہ وہ نزع کے عالم میں تھے اُن سے دوا لانے کے لیے کہا گیا یہ دوا لینے گئے

رستہ میں جو دوست احباب مل گئے اور انھوں نے اصرار کیا کہ چلو دو ایک ہاتھ تاش ہی کے ہو جائیں چنانچہ یہ تاش کھیلنے بیٹھ گئے اور وہاں والد صاحب انتقال فرما گئے واپسی پر دوسرے دن جب دواے کر آئے تو معلوم ہوا کہ والد صاحب کو انتقال کیے دوسرا دن ہے اور ان کی تجہیز و تکفین بھی ہو گئی ہے یہ سُن کر ایک نعرہ باواز بلند مارا کہ ہائے ہم یتیم ہو گئے اس کے بعد پھر اپنے دوسرے کاموں میں لگ گئے۔ اس شعر میں مرزا صاحب بھی اسی کا ذکر فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھئی صحیح معنوں میں آزاد انسان تو وہ ہے کہ بڑے سے بڑا حادثہ پیش آ جائے تو اس کے لئے صرف دو ایک منٹ غم کے لیے نکال دیے جائیں اس کے بعد پھر اپنے کاروبار میں لگ جائے اور دوسرے مصرع سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خود بھی اس پر عملدرآمد کرتے تھے چنانچہ فرماتے ہیں کہ ہمارے ماتم خانہ کی شمع برق ہے جس سے ماتم خانہ روشن کیا گیا ہے یعنی جسطرح برق کی تڑپ ایک لمحہ میں ختم ہو جاتی ہے اسی طرح ہم کسی حادثہ سے متاثر ہوتے ہیں اس کے بعد ہم پھر اپنے کاروبار میں لگ جاتے ہیں کیونکہ یہ تو معلوم ہی ہے کہ دنیا آلام و مصائب کا گہوارہ ہے اس میں کب تک کوئی کسی کے مرنے کا ماتم کرے۔

مخفیں برہم کرے ہے گنجفۂ بازِ خیال ہیں ورق گردانیٔ نیرنگِ یک بُت خانہ ہم

برہم کرنا = الٹ پلٹ کرنا۔ خیال معنی وہم۔ گنجفہ بازِ خیال معنی خیال کو گنجفا باز فرض کیا۔ نیرنگ یہ لفظ کثیر المعنی ہے ایک معنی اس کے تصویر کے خاکہ کے ہیں یہاں اس سے مراد تصویر کا البم ہے۔

نیرنگ یک بتخانہ سے مراد ایسا البم جس میں ایک بتخانہ بغیر بتوں کی تصاویر کے ہو

اس شعر سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا صاحب تصویروں کا البم رکھنے کے سخت مخالف تھے دوسرے چونکہ خود گنجفہ کے شوقین تھے اس لیے یہ شعر عجب نہیں جس وقت وہ گنجفہ کھیل رہے ہوں اُس وقت اُنھوں نے نظم کیا ہو چنانچہ فرماتے ہیں کہ جس طرح گنجفہ باز کے ہاتھوں میں گنجفہ کے متعدد اور مختلف رنگ کے پتے ہوتے ہیں اور ہر پتے پر ایک تصویر ہوتی ہے اُن تصاویر کے مختلف نام ہوتے ہیں مثلاً کسی کا بادشاہ نام ہے کسی کا رانی اور کسی کا غلام ظاہر ہے کہ سب نام فرضی ہوتے ہیں ۔ گنجفہ باز اُنھیں فرضی اور باطل تصاویر سے الٹ پلٹ کر کھیلتا ہے ۔ یہی حال انسان کے وہم کا ہے ۔ موجودات کی جو شکلیں اور تصویریں ہمارے سامنے آتی ہیں وہم سمجھتا ہے کہ یہ ان کا اپنا وجود ہے ۔ اور ہم نے اُن کے جو نام مقرر کئے ہیں ۔ ان کے اصلی نام حالانکہ گنجفہ کی تصویروں کی طرح یہ نام بھی فرضی اور باطل ہوتے ہیں لہٰذا اسی طرح خدائے واحد کے سوا جتنے بھی خدا یا بت ہوں باطل ہیں اسی طرح وجود واحد کے سوا دوسرے وجود بھی باطل اور فرضی ہیں اور یہ مختلف شہریں جو ہمارے سامنے ہیں وہ باطل بتوں کی تصاویر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں جن سے ہمارا وہم کھیلتا ہے لہٰذا وہم یا قصور فہم کے باعث ہم اُن بتوں کی تصاویر کے البم کی ورق گردانی کرتے ہیں ۔ یہ واقعہ ہے کہ مرزا صاحب اگرچہ ظاہراً ہر رند مشرب تھے تاہم دل میں ہر وقت اللہ ہو اللہ ہو کرتے رہتے تھے ورنہ ایک طرف تو بتوں کی یاد میں ہمہ وقت اپنے آپ کو مصیبت میں مبتلا کئے ہوئے ہیں اور دوسری طرف وحدت الوجود کے بھی قائل ہیں اور پھر اس درجہ کہ سوائے باری تعالیٰ کے تمام بتوں کو سیج سمجھتے ہیں گویا مرزا صاحب تھے تو بڑے درویش صفت انسان مگر کسی کو اپنی درویش منشی کی اطلاع نہیں دیتے تھے ۔

ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو

ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

ضعف معنی کمزوری مراد مجبوری سے قناعت ، خدائے تعالیٰ جو ابھی دے اس کو کافی سمجھنا زیادہ حرص نہ کرنا۔ ترکِ جستجو معنی ترکِ سعی وبال معنی بار تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ معنی ہمتِ مردانہ کا بھروسہ۔

دنیا میں ایک کاہل تو وہ ہوتا ہے جو لحاف میں پڑے پڑے دن رات بیٹر یا ل پیا کرتا ہے اور اس کی ساری زندگی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کو پڑا رہنے دیا جائے وہ کم ہمت بھی ہوتا ہے اور مجبور بھی بعض لوگ اس وجہ سے کسی کام میں کوشش یا جستجو نہیں کرتے کہ وہ فطرتاً آسانی کے قائل ہوتے ہیں اور نہ ان کو اپنی ذات پر بھروسہ ہوتا ہے اور نہ اپنی ہمت پر ایسے لوگ ہمیشہ دوسروں کے کندھوں پر رکھ کر بندوق چھڑایا کرتے ہیں اور طفیلی بنے پڑے رہتے ہیں کسی نے کھانا دیدیا کھا لیا، حقہ بھر دیا پی لیا۔ منہ دھلا دیا۔ دھو لیا۔ ورنہ یوں ہی خیرات، زکوٰۃ اور فطرہ میں زندگی بسر کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہوتے ہیں جو قناعت کی بنا پر کوئی جستجو نہیں کرتے ایسے لوگ نہایت بلند حوصلہ اور عالی ہمت ہوتے ہیں اور ان کی عالی ہمتی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ دنیا جیسی حقیر چیز کے لیے اپنی صلاحیت کوشش اور توانائی صرف کریں وہ اپنے سامنے ایک عظیم الشان مقصد رکھتے ہیں اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر وقت مصروف رہتے ہیں ایسے لوگوں کی ضروریات بہت محدود ہوتی ہیں اور وہ صرف زندہ رہنے کی حد تک خواہشات رکھتے ہیں۔ مرزا صاحب کا تعلق پہلی جماعت اور پہلے گروہ سے ہے مقصد یہ کہ یہ دن رات شاعری کی قائل ہیں اور

چاہتے ہیں کہ ان کو بیٹھے بیٹھے کھانے کو ملنا چاہئے اور ان سے کوئی کام نہ لیا جائے اور شاید اسی وجہ سے ان کی گھر والی زندگی بھر ان سے ناخوش رہیں۔ مگر مرزا صاحب اسی کے ساتھ ساتھ اپنی اس کمزوری پر شرمندہ بھی ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم قناعت پسند اور بلند ہمت لوگوں کے اوپر ایک بار ہیں مقصد یہ ہے کہ مرزا صاحب لیٹے لیٹے اپنے پلنگ پر سے جو احکامات دوسروں کے نام صادر کیا کرتے تھے اس کے بارے میں سمجھتے ہیں کہ لوگوں کو ان کے یہ احکامات گراں گزرتے ہوں گے مگر وہ بیچارے کرتے بھی کیا اپنی عادت اور فطرت سے مجبور تھے

غزل نمبر ۲

بنالہ حاصل دل بستگی فراہم کر   متاع خانۂ زنجیر جز صدا معلوم

بنالہ = آہ و زاری - حاصل دلبستگی = دل بستگی کا نتیجہ - متاع = مال و دولت۔ خانۂ زنجیر = حلقۂ زنجیر۔

یہ شعر بھی مرزا صاحب نے اس وقت کہا ہوگا جب وہ آخر عمر میں اللہ ھو اللہ پر اتر آئے ہوں گے۔ کیونکہ اس میں وہ جو درس دنیا والوں کو دے رہے ہیں وہ عام طور پر ایسے لوگ ہیں جو دنیا کے تمام تجربے حاصل کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ یہ دنیا چند روزہ ہے اور بجز رنج و افسوس کے کوئی چیز اس سے حاصل نہیں ہوتی چنانچہ فرماتے ہیں کہ بھئی اس دنیا سے صرف اس حد تک تعلق رکھو جہاں تک کہ تمہاری ضروریات کا تعلق ہے جو نا گزیر ہیں بقیہ اوقات اللہ ھو اللہ ھو میں گذار دو۔ کہنا صرف اتنا ہے مگر جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا کہ مرزا صاحب ہمیشہ گھما کر ناک پکڑنے کے عادی ہیں اس لیے انھوں نے پہلے زنجیر کا اس کے حلقوں

سے تعلق بتایا ہے پھر حلقہ اور زنجیر کی دل بستگی کا ذکر کیا ہے فرماتے ہیں کہ زنجیر کو بجز صدا و نالہ کوئی چیز حاصل نہیں اس کے بعد زنجیر اور نالہ کی صدا کی رعایت سے فرماتے ہیں کہ اگر کوئی بھی تعلقات دنیوی کی زنجیروں میں جکڑا ہے تو اس وابستگی سے تجھ کو آہ اور نالے ہی کی دولت حاصل ہوگی اور کوئی دوسری دولت حاصل نہ ہو سکے گی ۔ اس پورے شعر کا مطلب اگر آپ براہ راست نکالیں تو اس کا جواب بتا ئیں یوں نکلے گا کہ اللہ تعالیٰ کو بھول کر جو لوگ دنیاوی میں اپنی زندگی گذارتے ہیں وہ سخت مصائب میں مبتلا رہتے ہیں ۔

غزل نمبر ۳

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور — رکھ لی میرے خدا نے میری بیکسی کی شرم

مرزا صاحب کی ساری زندگی قرض لیتے گذری اور جب قرض اس منزل پر پہنچ گیا کہ اس کی ادائیگی کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہا تو مرزا صاحب سوچے کہ استاد اب تو جیب میں کفن کو بھی کوئی پیسہ نہیں ہے ۔ لہذا وطن میں لاوارث مرنے سے تو یہی بہتر ہے کہ شہر چھوڑ کر بھاگ چلو اور کہیں پردیس میں چل کر جان دو ۔ ورنہ اگر وطن میں مرے تو مغلیئے اپنا قرض وصول کرنے کی غرض سے گھیریں گے اور مرنے کی خبر سنتے ہی گھر پر آدھمکیں گے ۔ چنانچہ اس شعر میں مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ واللہ یہ حقیر تو حد درجہ گنہگار تھا مگر قربان جائیے اس خدائے قدوس کے کہ قرض خواہوں سے بچنے کے لیے یہ ترکیب سمجھ میں آگئی کہ چل کر پردیس میں انتقال فرمایئے یہاں نہ کوئی شناسا ہوگا اور نہ کوئی یہ جاننے والا کہ مرنے والا کس مرتبے اور کس پائے کا قرضدار انسان ہے دوسرے اس سے یہ فائدہ بھی ہوگا کہ اول تو رسوائی اور ذلت سے بچ گئے ،

دوسرے میں بھی سوارت ہو جائیگی چنانچہ اپنی اس موت پر خدائے قدوس کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اے پاک بے نیاز تو نے میری بیکسی یعنی مقروض ہونے کی شرم رکھ لی اور مجھے وطن میں نہیں مارا ورنہ عزیز واقارب کو سخت مصائب میں مبتلا ہونا پڑتا اور میری صد درجہ رسوائی ہوتی ۔

ردیف (ن)

غزل نمبرا

یوں دام بخت خفتہ سے یک خواب خوش ولے
غالبؔ یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

دام معنی قرض بخت خفتہ = سویا ہوا نصیب یعنی بد قسمتی
خواب خوش = گہری نیند یا آرام کی نیند

غالبؔ چونکہ زندگی بھر مقروض رہے لہٰذا آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ اُن کے اشعار میں لین دین اور قرض کا جگہ جگہ ذکر ملتا ہے اور بہت سی باتیں جو وہ کہنا چاہتے ہیں وہ قرضداروں کی اصطلاحات میں ہوتی ہیں چنانچہ اس شعر میں بھی آپ دیکھیں گے کہ دام اور ان کی ادائیگی کا مسئلہ درپیش ہے اُن کا یہ فرمانا بالکل بجا ہے کہ میری قسمت شروع ہی سے سوتی رہی اور قیامت تک سوتی رہے گی ۔ خدا جانے کہاں کی خواب آور گولیاں ان کے مقدر کے ہاتھ آگئی تھیں جو انھوں نے اتنی مقدار میں کھالیں کہ ساری عمر آنکھ کھلنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوا اسی لیے مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ہمارا مقدر نیند کے سرمایہ سے مالا مال ہے اور یہ اُس کے پاس سونے کی کوئی کمی نہیں ۔ اچھی نیند اُس

نیند کو کہتے ہیں جس میں انسان زوردار خراٹے لے چنانچہ "خواب خوش" یعنی خراٹے دار نیند کا بڑا زبردست ذخیرہ ان کی قسمت کے پاس موجود ہے۔ اب دوسری طرف مرزا صاحب کے ساتھ یہ مصیبت ہے کہ انھوں نے دنیا میں آنے کے بعد اپنے آپ کو عشق میں مبتلا کر رکھا ہے جس میں نیند کا دور دور ڈھائی میل تک سوال ہی نہیں پیدا ہوتا چونکہ مرزا صاحب کو محبوب کے انتظار میں جاگتے جاگتے اپنی جان سے بیزار ہو جانا پڑتا ہے لہٰذا مرزا صاحب چاہتے ہیں کہ اگر تھوڑی سی دیر نیند آ جائے تو سستا کر انتظار کی دوسری قسط تازہ دم ہو کر شروع کی جائے۔ لہٰذا سوچتے سوچتے آخر میں اس معاملہ میں بھی قرض لینے کی ترکیب ان کی سمجھ میں آ گئی۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ چونکہ مقدر کے پاس نیند کی کوئی کمی نہیں اور اس کے پاس نیند کے کئی گدام موجود ہیں لہٰذا کیوں نہ بطور قرض اس سے نیند ادھار لے لوں مگر اس کے بعد پھر اس قرض کی ادائیگی کا سوال ہے اور یہ نیند کے ٹوٹے ہوئے ہیں لہٰذا اگر کسی وقت ان کے بخت خفتہ نے اپنے نیند کے قرضہ کا مطالبہ کیا تو یہ کہاں سے ادا کریں گے چونکہ مرزا صاحب عشق میں مبتلا ہیں اور رات بھر انھیں انتظار یار میں جاگنا پڑتا ہے اس لیے ان کے پاس صرف جاگنے کا اسٹاک ہے نہ کہ سونے کا۔ لہٰذا سخت مصیبت میں مبتلا ہیں کہ قرض لوں یا نہ لوں مقصد یہ کہ ساری زندگی گو مگو کے عالم میں گذری ہے نہ قرض لیتے بن پڑتا ہے اور نہ زندگی بھر جاگنے میں چین میسر ہے۔

غزل نمبر ۲

فرصت کاروبارِ شوق کسے ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

مرزا صاحب بوڑھے ہو چکے ہیں اور اب قویٰ اس درجہ کمزور ہیں کہ عشق و محبت کا کاروبار ان کے چلائے نہیں چلتا۔ اور اب کمزوری کا یہ عالم ہے کہ

حسین سے حسین اور خوبصورت سے خوبصورت لڑکی ان کے پاس سے کیوں نہ گذر جائے یہ نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ لہذا اس شعر میں فرماتے ہیں کہ حضرت! جوانی کیا گئی اپنے ساتھ ساری اُچک پھاند اور شوق و ذوق لیے چلی گئی۔ اب تو ہماری حالت بالکل ملگنی پڑا نگنے والے انگوچھے کے مانند ہو گئی ہے۔

دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا　　شورِ سودائے خط و خال کہاں

شورِ سودا یعنی خیال کی دھوم دھام۔ خط و خال کے معنی حسن۔

جوانی میں مرزا صاحب نے وہ رنگ رلیاں اور مزے کئے تھے کہ بڑھاپے میں اُس کی یاد اُن کو ہمہ وقت تڑپاتی رہتی تھی اس شعر میں مرزا صاحب اپنے موجودہ حالات کا ذکر فرماتے ہوئے اپنی حالتِ زار پر ماتم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عمر کے ساتھ ساتھ دل تو بوڑھا ہوا ہی تھا لیکن دماغ بھی اس درجہ کمزور اور نحیف ہو گیا ہے کہ حسن سے لطف اندوز ہونا تو بڑی بات اب محبوب کے خط و خال کا تصور بھی دماغ پر بار ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ بڑھاپے میں جب قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں اور عمر زندگی کا سارا عرق کشید کر لیتی ہے تو اس وقت انسان محض لُجھی لُجھی ہو کر رہ جاتا ہے

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق　　واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں؟

قمار خانۂ عشق = عاشقی کے اڈے۔ مال سے مراد روپیہ اور یہاں مراد توانائی سے۔

عاشقی کے اڈوں پر وہی لوگ بیٹھتے ہیں جو گانٹھ کے پکے اور جسم کے توانا اور مضبوط ہوتے ہیں۔ چنانچہ مرزا صاحب بھی ایک زمانہ میں جب ان کو یہ دونوں چیزیں میسر تھیں ہر وقت انھیں اڈوں پر بیٹھے دکھائی پڑتے تھے مگر اب جب بوڑھے

ہو گئے تو اول تو ڈال کے ٹوٹے عاشق اُن کو وہاں بیٹھنے نہیں دیتے تھے دوسرے چونکہ ان کا شادی بیاہ ہو چکا تھا اور گھر کے مصارف اس قدر تھے کہ ان کی گرہ میں کبھی اتنی رقم ہی نہ تھی جو وہ وہاں جا کر رنگ رلیوں میں شریک ہوں کیونکہ یہ وہ جگہیں ہوتی ہیں جہاں اگر آج کسی نے آپ کو بیڑی پلائی ہے تو کل آپ اُسے اپنی بیڑی کا بنڈل پیش کیجئے۔ شادی ہونے کے بعد بھلا مرزا صاحب کے پاس اتنے پیسے کہاں جو ایک بیڑی کا بنڈل بھی خرید یں۔

چنانچہ فرماتے ہیں کہ بھئی اب جبکہ بڑھاپے نے ہم کو سوالیہ حلیہ کا نشان بنا دیا ہے۔ لہٰذا ان اڈوں یہ یا تاڑی خانے میں ہم کہاں جا سکتے ہیں نہ جیب میں پیسہ ہے اور نہ ہاتھ پیروں میں عشق لڑانے کی طاقت ہے۔

غزل نمبر ۳

آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اُن سے کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

مرزا صاحب اِس شعر میں اول تو اس بات کو واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اُن کا معشوق کتنا حسین اور کیسے ہاتھ پاؤں والا انسان ہے جس کے سامنے جاتے ہر شخص کی سٹی بٹی گم ہو جاتی تھی دوسرے مقصد یہ کہ اُس کے رعب حسن سے ہر شخص کی اُس کے سامنے گھگھی بندھ جاتی تھی اور جو کچھ وہ اُس سے کہنا چاہتا تھا نہیں کہہ پاتا تھا اس کے علاوہ اس شعر کا یہ بھی مفہوم ہو سکتا ہے کہ مرزا صاحب جو سوالات رات دن غور کرنے کے بعد اُس سے کرنے کے لیے تیار کرتے تھے اُن کے بارے میں یہ خوف تھا کہ معلوم نہیں اُن سوالوں کے جواب میں وہ کیا کہہ بیٹھے مثلاً اگر انھوں نے یہ سوال کیا کہ حضت! ہم آپ کے اوپر جان قربان کرتے ہیں تو اس کے جواب میں وہ یہ کہہ بیٹھے کہ جان تو بکرے بھی قربان کرتے ہیں

یہ کون سی بڑی بات ہے۔ دوسرے یہ بھی خطرہ تھا کہ اگر ہم نے اُن سے کہا کہ ہم آپ جان دیتے ہیں اور انھوں نے آدمی کو حکم دیا کہ جاؤ جا کر ان کی قربانی کر دو تو اس کا یہ نتیجہ ہوگا چڑیا اپنی جان سے جائے گی اور کھانے والے کو مزہ تک نہ ملے گا۔

اِک مشرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائے گا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

مرزا صاحب ساری زندگی عشق و محبت کی آگ میں جلا کئے پھر جوں جوانی سے اترتے گئے عشق کی آگ میں بھی بتدریج کمی ہوتی گئی اور آخر عمر میں جب خاصے بوڑھے ہو گئے تو عشق کی محض ایک چنگاری دل میں باقی رہ گئی مگر چونکہ جوانی میں عشق کے الاؤ دل میں جلتے رہتے تھے اس لیے اس چنگاری سے اُن کو تشفی نہیں ہوتی تھی وہ چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ آگ ہو تاکہ جلنے کا مزا آئے ایک دن سوچے کہ چلو اس چنگاری ہی کو ہوا دے کر بھڑکاؤ تاکہ اس سے شعلے پیدا ہوں اور اُن سے جلنے کا لطف حاصل ہو لیکن دشمنوں نے جب مرزا صاحب کو یہ کرتے دیکھا تو مشہور کر دیا کہ مرزا صاحب عشق کی آگ سے گھبرا چکے ہیں اور اُسے ٹھنڈی آہیں بھر کر ٹھنڈا کرتے رہتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں تھا بلکہ مرزا صاحب بیچارے آہوں کی دھونکنی سے عشق کی آگ کو تیز کر رہے تھے۔

غزل نمبر ۴

ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

رنگ ہو کر اڑ گیا = یعنی خون رنگ ہو کر اڑ گیا۔ عاشقوں کا رنگ اڑا ہوا ہوتا ہے مرزا صاحب جب تک جوان تھے اُس وقت تک جوانی کا خون اُن کی رگوں میں دوڑتا رہتا تھا

اور وہ اُس خون کو اپنے رونے دھونے میں استعمال کرتے رہتے تھے اُن کے اس کام سے آنسو بھی مطمئن تھے کہ مرزا صاحب کے جسم میں بلڈ بینک تو موجود ہی ہے جس وقت ضرورت ہو گی خون کی دو ایک بوتلیں حاصل کر لی جائیں گی مگر عشق میں انسان کو جتنا رونا اور جلنا پڑتا ہے اُس کے لیے اگر دس بیس بلڈ بینک بھی جسم میں ہوں تو نا کافی ہیں۔ چنانچہ جب مرزا صاحب عشق میں روتے روتے بوڑھے ہو گئے تو اُن کے جسم کا خون بھی ختم ہو گیا مگر اس کے بعد بھی رونے کی عادت جاری رہی جسم میں اب اتنا خون باقی نہ تھا جو اِن کے گریہ کو خون کا پورا کوٹا دے سکتا لہٰذا اب جو گریہ نے مزید خون کا مطالبہ کیا تو مرزا صاحب نے اُس سے اپنی مجبوری کا اظہار کیا اور کہا کہ بھئی اول تو بڑھاپے کے سبب جسم میں خون باقی نہیں دوسرے جو تھوڑا بہت خون تھا وہ اشکوں کے ذریعہ دامن پر آ رہا۔ اِس کے بعد بھی کچھ خون بچ رہتا اگر وہ رنگ بنکر اُڑ نہ جاتا۔ لہٰذا اب لے دے کر ضعف ہی ضعف ہے اور اب خون کی جگہ کمزوری ہی کمزوری ہے اُس سے اگر کام چل سکتا ہو تو چلاؤ۔

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

چارہ جوئی : علاج یعنی درد کم کرنے کی تدبیر۔ لذّت : درد

جو لوگ آزاد پسند ہوتے ہیں اگر اُن کو مصائب اور تکالیف سے دور رکھا جائے تو وہ اور زیادہ تکلیف محسوس کرتے ہیں عشق میں ظاہر ہے کہ آئے دن لاٹھی پونگے چلا ہی کرتے ہیں اور عشاق زخمی ہو ہو کر اپنے اپنے گھروں کو پہنچائے جاتے ہیں کبھی تیر نظر سے زخمی ہوتے ہیں تو کبھی تیغ ابرو سے گھائل مرزا صاحب جو عشق کا زخم کھائے ہوئے تھے وہ برابر بڑھ رہا تھا اس لیے ایک دن رفوگر کے پاس پہنچے کہ بھیا ذرا ہمارا زخم سی دینا اس نے سوئی اٹھا کر سلائی شروع کر دی اتفاق سے اُس

طرف سے ان کا رقیب گذر رہا تھا اس نے جو دیکھا کہ مرزا صاحب اپنا زخم ٹکوا رہے ہیں تو اس نے محبوب سے جاکر شکایت کی کہ آج مرزا صاحب درد کم کرنے کی غرض سے ایک نوگر کے یہاں اپنا زخم سلوانے پہنچے ہوئے ہیں حالانکہ ایسا نہیں تھا بلکہ مرزا صاحب زخم میں اور لذت پیدا کرنے کی غرض سے اُس میں سوئیاں چبھوا رہے تھے اور نیا درد پیدا کرکے اُس سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

نے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی میری موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

موجِ مے = شراب۔ نخوت = غرور۔ قلزم آشامی = بلانوشی یا کثرتِ مے نوشی رگِ گردن یعنی = تکبّر۔

رگِ جان مراد شراب کی لکیر ہے جو صراحی کی گردن میں اوپر تک چڑھ آتی ہے خدا جانے مرزا صاحب کا محبوب شراب کا کنٹریکٹر تھا یا شراب ناجائز طور پر کشید کراتا تھا۔ بہرصورت جو بھی ہو اُس کے گھر میں ہر وقت شراب کا بڑے سے بڑا ذخیرہ موجود رہتا تھا اور اسی طرح کئی کمروں میں شیشے اور خُم کا اسٹاک بھرا تھا محبوب کو اپنے اس شراب کے سرمائے پر بڑا گھمنڈ اور غرور تھا لیکن مرزا صاحب جیسے بلانوشوں سے بھی اُس کو کم سابقہ پڑا ہوگا چنانچہ ایک دن مرزا صاحب جو اُس کے یہاں شراب پینے گئے تو انھوں نے اُس کے پاس جتنی شراب تھی اُس کا سارا اسٹاک خالی کر دیا اور اُس کے حواس باختہ کر دیے اسی لیے مرزا صاحب دوسرے مصرع میں فرماتے ہیں کہ جب میں نے شرابِ پورے پورے سمندر چڑھانا شروع کر دیے تو اُس کا سارا نشہ ہرن ہو کر رہ گیا۔

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

شان ۔ قدر و عزت ۔ غربت = مسافری ۔ مشت خس = مٹھی بھر گھاس ۔ گل خن = بھاڑ یا بھٹی ۔

مرزا صاحب کو اس شعر میں صرف یہ کہنا ہے کہ جب تک میں وطن میں رہا تو تنگدستی نے ساتھ نہ چھوڑا اور اب پردیس میں ہوں تو وہاں والے کبھی قدر نہیں کرتے ۔ اتنی سی بات کہنے کے لیے مرزا صاحب کو ایک مٹھی گھاس اور ایک عدد بھٹی کا انتظام کرنا پڑا اس کے بعد جب مسافت اختیار کی تو آخر میں اپنی شان اور عزت سے بھیک مانگ کر شعر کا مطلب ادا کیا چنانچہ فرماتے ہیں کہ میں ایک مٹھی بھر گھاس کی حیثیت رکھتا ہوں جہاں رہا وہاں لوگوں نے ذلیل کیا اور میرے مرتبہ کی کوئی قدر نہ کی گھاس کے تنکے جب تک گھر میں پڑے رہتے ہیں تو انہیں جھاڑو سے جھاڑ دیا جاتا ہے اور جب انہیں باہر پھینک دیا جاتا ہے تو لوگ ان کو اپنے پیروں سے روند کر مٹی میں ملا دیتے ہیں اب رہا گھاس کا سوال تو گھاس بھٹی کی رونق ہوتی ہے اور جب گھاس کو بھٹی میں ڈال دیا جاتا ہے اور اس میں آگ لگا دی جاتی ہے تو بھٹی روشن ہو جاتی ہے اور وہ ماحول کو بھی روشن کر دیتی ہے یہی حال میرا ہے کہ وطن میں کوئی عزت نہیں گویا نہ وطن والے قدر کرتے ہیں اور نہ غربت میں کوئی عزت سے دیکھتا ہے ۔

غزل نمبر ۵

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

نوا = آواز ۔ نوائے جگر خراش = آہ دلِ سوز یا نالۂ روح فرسا ۔

مرزا صاحب کا رات دن کا مشغلہ لے دے کر صرف یہی رہ گیا تھا کہ وہ نالے

اور آہ و زاری سنے تو متاثر ہو کر ایک آدھ مٹھی اپنے حسن کے جلوؤں سے لے کر
اِن کو دے دے مگر وہ یا تو کچھ اونچا سنتا تھا یا تجاہل عارفانہ سے کام لیتا تھا کہ ان
کے نالوں کو سنی اَن سنی کر کے چپ سادھے بیٹھا رہتا اور یہ بھی بیچارے کیا کرتے
یا تو اُلٹے سیدھے نالے نشر کرتے یا پھر آہیں بھرا کاسٹ کرتے۔

غزل نمبر ۶

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت　　میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

عاشقوں کا معاملہ ایسا ہے کہ جب وہ عشق کرنے نکلتے ہیں تو سب سے پہلے
اپنی خودداری کو گھر رکھ آتے ہیں کیوں کہ عشق کے کوچے میں ابن فلاں اور
بنت فلاں کا خیال نہیں کیا جاتا وہاں تو گویا "ہر چیز کا دام چھ پیسہ" گر نیز چھابے
والے مال کا سا حساب کتاب ہوتا ہے ہر عاشق کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاتا
ہے ورنہ اگر کوئی ذرا بھی خوددار انسان ہو تو اگر کوئی ایک مرتبہ اُس سے بے التفاتی
برتے یا اُس سے بری طرح پیش آئے تو اُس کی طرف مڑ کر نہ دیکھے مگر عاشقان
صادق میں یہ خودداری مفقود ہوتی ہے وہ معشوق کے ہاتھوں ذلیل ہوتے ہیں۔
اُس کی ڈانٹ ڈپٹ کھاتے ہیں۔ جھڑکیاں اور گھڑکیاں سنتے ہیں پھر بھی کما شہ
گھس کر دیکھتے ہیں اور محبوب کے در پر چوبیسوں گھنٹے لوٹا کرتے ہیں۔

ایک دن مرزا خدا جانے کس وقت اپنے محبوب کی خدمت میں پہنچ گئے
تھے کہ وہ اپنے نوکروں چاکروں پر غصہ میں بیٹھا تھا۔ جوں ہی اُس نے مرزا صاحب
کو دیکھا وہ اِن پر بھی برس پڑا۔ مرزا صاحب نے حضور سرکار کر کے کسی طرح اپنی
جان بچائی اور چلتے وقت کہا کہ خیر کوئی بات نہیں اِس وقت تو بہر حال آپ

غصہ ہیں اور غصہ کی وجہ سے میری صورت پر بھی نظر ڈالنا نہیں چاہتے مگر جب آپ کا غصہ ذرا دھیما ہو جائے تو از راہ کرم اِس خاکسار کا خیال رکھے گا اور اپنی محبت اور شفقت سے مجھے محروم نہ فرمائیے گا۔ میرا معاملہ ایسا ہے کہ میں دن رات بیکار گھر میں پڑا رہتا ہوں جس وقت آپ یاد فرمائیں گے حاضر ہو جاؤں گا۔ مجھے بلوانے میں آپ کو ذرہ برابر بھی زحمت نہ ہوگی۔ اِدھر آپ کا حکم پہنچا کہ صاحب نے سلام بولا ہے میں فوراً پورے یونی فارم میں حاضر خدمت ہو جاؤں گا۔

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے　　　بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

اغیار = جمع "غیر" کی

مرزا صاحب نے عشق کیا تھا کہ ایک اچھی بھلی مصیبت اپنے سر مول لے رکھی تھی چنانچہ بڑھاپے میں اِن پر گھروالی اور اِن کے اعزا اور مخالفین سخت "ڈانٹ ڈپٹ" کرتے تھے اور طرح طرح سے اُن پر طعن و تشنیع کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بڑھاپے میں یہ کیسی بڑھبس سوار ہوئی ہے کہ گھروالی کی موجودگی میں عشق کر رکھا ہے۔ مرزا صاحب ان تمام باتوں کو سنتے تھے اور خون کے گھونٹ پی پی کر رہ جاتے تھے اس شعر میں اپنے محبوب سے فرماتے ہیں کہ ارے بھائی تم ہمارے عزیز و اقارب اور مخالفین کے طعن و تشنیع کا شکوہ بیکار کرتے ہو تم نے تو یہ باتیں آج سنی ہیں اور ہم تو جس وقت سے تمھارے دام محبت میں گرفتار ہوئے ہیں اُس وقت سے سُن رہے ہیں۔ جوانی میں جب ہم نے اِن طعنوں کی پرواہ نہ کی تو اب بڑھاپے میں کیا کریں گے جبکہ عادی ہو چکے ہیں وہ باتیں ہی تو سناتے ہیں بات کوئی سر

تو نہیں ہے جو بوجہ یا کمزوری کی وجہ سے اُٹھ نہ سکے تم کو تو ہمارا ظرف دیکھنا چاہیئے کہ باوجود پیران سالی اور ضعیفی کے یہ ساری باتیں برداشت کر رہے ہیں اور ایک حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے تم کو تو ہماری اِس جوانمردی کی داد دینا چاہیئے۔

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ　　کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی سکوں

اکثر لوگ کہتے ہیں کہ فلاں صاحب کو تو فلاں کام کرنے کی قسم ہے تو اُس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اُن صاحب کو اُس کام کے کرنے سے انکار ہے عشق میں عشاق منٹ منٹ پر زہر کھاتے ہی رہتے ہیں چنانچہ مرزا صاحب بھی پچاسوں بار محبوب کو زہر کھانے کی دھمکی دے چکے ہیں لہٰذا ایک دن جب انھوں نے محبوب سے کہا کہ دیکھئے اگر آپ نے ملاقات میں　　بخل سے کام لیا تو یاد رکھیئے کہ میں زہر کھا لوں گا اِس پر محبوب نے کہا کہ ارے تم کل کے کھاتے آج کھا لو تمہاری پرواہ کسے ہے اِس پر مرزا صاحب سوچے کہ اب کیا ترکیب کی جائے چنانچہ فرمانے لگے کہ واللہ زہر کوئی آپ کے ملنے کی قسم کی طرح کی کوئی چیز تو ہے نہیں، جو میں نہ کھا سکوں ہر وقت بازار سے منگوا کر کھا سکتا ہوں مگر کیا عرض کروں کہ بازار میں زہر دستیاب نہیں ہوتا ہے کھاؤں تو کیا کھاؤں ۔ غرض جہاں معشوق عاشقوں کو پچاسوں چرکے دیتا ہے وہاں عاشق بھی معشوق کو داد دینے کے بہت سے گر جانتا ہے۔

غزل نمبر ۷

ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن　　ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن

کھل جانا = بے تکلف ہونا ۔ عذر مستی = نشہ کا بہانہ

مرزا صاحب آدمی نہایت ذہین تھے ۔ چنانچہ مختلف طریقوں سے اپنے محبوب کو پھسلاتے اور پٹاتے رہتے تھے اُنھوں نے محبوب کو بھی شراب پینے کا عادی بنا دیا تھا سوچے کہ یار کوئی ترکیب ایسی کرنا چاہیئے جس سے وہ ہم سے کبھی بے تکلف ہو جائے ۔ سوچتے سوچتے اُن کی سمجھ میں ایک بات یہ آئی کہ اب خوشامد درآمد سے کام نہیں چلے گا اب تو بہر حال ٹیڑھی انگلیوں گھی نکالنا پڑے گا چنانچہ ایک دن جبکہ یہ اور ان کا محبوب نشہ میں سرشار تھے اُنھوں نے اس کا ہاتھ پکڑ ہی تو لیا اور بولے کہ دیکھئے صاحب! اب اس طرح کھنچے کھنچے رہنے سے کام نہیں چلے گا کیونکہ شراب نوشی کا لطف اسی میں ہے کہ سب کھل مل کر آپس میں باتیں کریں مگر آپ ہیں کہ شراب پینے کے بعد بھی اُسی طرح ہم سے کھنچے کھنچے ہیں جس طرح کہ بغیر شراب پیئے ہم سے مخاطب نہیں ہوتے ۔ لہٰذا اگر آپ نے ہماری بات نہ مانی اور بے تکلف ہونے میں تاخیر کی تو پھر ہم چھیڑ چھاڑ شروع کر دیں گے اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ہم نشہ کے عالم میں ہیں ۔ لہٰذا ہم سے ہر قسم کی نازیبا اور ناز یبا حرکت سرزد ہو سکتی ہے اگر آپ پولس میں رپٹ لکھوائیں گے تو بھی آپ کی رپٹ لائق باز پرس اس وجہ سے نہ ہو گی کہ ہمارے پاس مستی کا معقول عذر موجود ہے ۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں   رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

رنگ لانا = بُرے نتائج پیدا کرنا ۔ فاقہ مستی = بحالت تنگدستی مزے اڑانا ۔

مرزا صاحب یہ تو بہر حال جانتے ہی تھے کہ شراب نوشی ایک بری عادت ہے

اور اس میں پڑنے کے بعد انسان دو کوڑی کا نہیں رہتا اوّل تو دنیا والے
تھڑی تھڑی کرتے ہیں اور دوسری طرف مرنے کے بعد جہنّم تو بہرحال شراب
پینے والوں کے لیے مخصوص ہی ہے لیکن ان عواقب پر نگاہ رکھنے کے باوجود مرزا
صاحب پیتے تھے اور خوب ڈٹ ڈٹ کر پیتے تھے پہلے گھر کا اثاثہ بیچ کر پیتے رہے
اُس کے بعد قرض کی نوبت آئی اور قرض لے لے کر پیتے رہے اور گھر والی کو
پریشان کرتے رہے نوبت بہ ایں جا رسید کہ گھر میں فاقے ہونے لگے مگر اس فاقہ مستی
میں بھی انھوں نے شرابِ نوشی سے دست کشی اختیار نہ کی۔

دھول دھپہ اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

شیوہ = طرز یا روش ۔ پیش دستی = پہل کرنا یا ہاتھ ڈالنا۔

غالبؔ کا معشوق کسی شریف گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور اُس کے عادات
واطوار بھی شریف گھر کی بہو بیٹیوں جیسے تھے لیکن جب کسی شریف کی عزت و
آبرو پر بن آتی ہے تو مجبوراً وہ بھی تنگ آمد بجنگ آمد پر اتر آتا ہے اور اپنی عزت
بچانے کے خاطر ہاتھا پائی اور لپاڈگی سے بھی گریز نہیں کرتا چنانچہ ایک دن جب
مرزا صاحب غالباً نشہ کے عالم میں تھے انھوں نے ممکن ہے کہ محبوب کا ہاتھ پکڑ
لیا ہو جس پر وہ لپاڈگی پر اتر آیا ہو جب مرزا صاحب کا نشہ ہرن ہوا تو سوچے تو
یار یہ تو بہت بُرا ہوا اس کے علاوہ لوگوں نے بھی ان پر اور ان کی محبوبہ دونوں پر انگشت
نمائی شروع کی تو مرزا صاحب نے محبوبہ کی وکالت شروع کر دی اور کہا کہ صاحب
جو غلطی تھی وہ حقیقتاً ہماری تھی اور ہماری ہی طرف سے پہل ہوئی تھی ورنہ یقین
مانیے وہ بڑے شریف گھرانے کی ہیں بھلا وہ لپاڈگی کیسے کر سکتی تھیں۔

غزل نمبر۹

ہم کو ستم عزیز ستم گر کو ہم عزیز　　نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

ستم : ناز و غمزہ

مرزا صاحب آدمی چالاک تھے کسی نہ کسی ترکیب سے حساب لگا کر اپنی تسکین کر لیا کرتے تھے چنانچہ اِس شعر میں بھی اِنھوں نے حساب جوڑ کر اپنی تسکین کر لی مرزا صاحب کو یہ تو معلوم ہی تھا کہ اُن کا محبوب نہایت کڑے خاں اور مار تو خاں قسم کا انسان ہے وہ حسبِ عادت منجملہ دوسروں کے اِن پر بھی جور و تشدد کیا کرتا تھا اور جب تک سویرے سے شام تک وہ دو چار عاشقوں پر طبع آزمائی نہ کر لیتا اُسے چین و اطمینان میسر نہ آتا تھا اب اُس کے جور و تشدد کے پیشِ نظر مرزا صاحب اپنی محبت کے سوال کو حل کر کے جواب اُس کی مہربانیوں کی شکل میں اس طرح نکالتے ہیں کہ دیکھئے صاحب! یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہم کو معشوق کے جور و ستم بے حد عزیز ہیں اور یہ بھی آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ محبوب کو ایک ایسے عاشق کی ضرورت رہتی ہے جس کو وہ اپنے جور و تشدد کا ہدف بناتا رہے اِس لحاظ سے اگر آپ دیکھئے تو معشوق ہم کو پسند کرتا ہے کیونکہ ہر وقت ہم چلّا چلّا کر کہا کرتے ہیں کہ آ بیل تو مجھے مار۔ یعنی تو آ اور ہم پر تشدد کر۔ پس یقین کہ ثابت ہوا کہ معشوق ہم پر مہربان ہے کیونکہ وہ ہم پر طبع آزمائی کرتا رہتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ہم ہی پر جور و تشدد کیوں کرتا۔ پس لاکھ دنیا کہے کہ وہ ہم پر مہربان نہیں ہم تو یہی کہے جائیں گے کہ وہ ہم پر مہربان ہے اور بے حد مہربان ہے۔

بوسہ نہیں نہ دیجیے دشنام ہی سہی　　آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

دہن = تنگی دہن ۔ خوبصورتی کی علامت ہے اس لئے شعراء دہن کو تنگ کرتے کرتے اُس کو معدوم سمجھتے ہیں ۔

غالب کا محبوب کسی قیمت پر اُن کو بوسہ دینے پر آمادہ نہیں ہے اور یہ ہیں کہ اس بات پر مُصر ہیں کہ اِن کو ایک بوسہ دے کر وہ اپنی ماں چھٹ سے خیانچہ اُس نے ایک بڑی دلچسپ دلیل بوسہ نہ دینے کے سلسلے میں اِن کے سامنے پیش کی جس سے یہ بھی جھک ہو گئے اور ان کو قائل ہونا پڑا اور وہ دلیل یہ تھی کہ صاحب! آپ دہن کا بوسہ طلب کر رہے ہیں مگر آپ ہی حضرات کا کہنا ہے کہ ہم لوگوں کے دہن ہوتا ہی نہیں تو سوال یہ ہے کہ ہم بوسہ دیں تو کہاں کا دیں یہ سُن کر مرزا صاحب صدر درجہ شرمندہ ہوئے اور سوچے کہ چلو ایک دوسرا طریقہ اختیار کر کے تسکین خاطر کر لو لہذا بولے کہ اچھا دہن دہن کی بات چھوڑیئے اگر آپ کے پاس دہن نہیں ہے تو بہر حال زبان تو ہے اگر بوسہ نہیں دیتے تو اپنی زبان اقدس سے دو چار گالیاں ہی دے دیجئے ۔ آپ کی گالیاں بھی ہمارے لیے تسکین کا باعث ہوں گی ۔ غرض مرزا صاحب کو آخر میں گالیوں پر توڑ کرنا پڑا اور یہ سوچ کر کہ ذکر العیش نصف العیش بوسہ نہ سہی گالیاں ہی سہی اُن میں بھی ایک طرح کی لذت ہے ۔ بھاگے بھوت کی لنگوٹی بھلی ۔

ہر چند جاں گدازئ قہر و عتاب ہے　　ہر چند پشت گرمئ تاب و تواں نہیں

جاں مطرب ترانۂ ہل من مزید ہے　　لب پردہ سنج زمزمۂ الاماں نہیں

جاں گدازی = تکلیف ۔ قہر و عتاب ۔ مراد ظلم و ستم یا خفگی پشت گرمی:

تائید۔ سہارا یا حمایت۔ مطرب : گانے والا۔ ترانہ : نغمہ یا گیت۔ ھل من مزید : قیامت کے روز جب گناہ گار دوزخ میں داخل کئے جائیں گے تو دوزخ پکارے گی ہل من مزید : یعنی کیا کچھ اور ہے۔ مقصد یہ کہ ابھی میرا پیٹ نہیں بھرا اور کچھ زیادہ چاہیئے۔ پرزہ سنج : نغمہ سنج۔ گانے والا۔ زمزمہ : نغمہ یا گیت۔ الامان : امان، پناہ۔ رحم۔

یہ دونوں شعر قطعہ بند ہیں۔

عاشق کا معاملہ کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اس پر جس قدر جور و تشدد ہوں اُسی قدر وہ خوش ہوتا ہے اور نحیف الجثہ عاشق بھی نہایت صبر و استقلال کے ساتھ معشوق کے جور و ستم پورے صبر و ضبط کے ساتھ برداشت کرتا ہے خواہ دل میں یہی کیوں نہ کہتا ہو کہ "مار تجھے خدا مارے" مگر زبان سے یہی کہے جائے گا کہ صاحب جور و تشدد سے سیری نہیں ہو رہی ہے چنانچہ مجنوں فرہاد جیسے جاں باز عاشقوں پر کیسے کیسے ظلم اور تشدد کے پہاڑ توڑے گئے مگر جو چون کرتے کبھی۔ جوں تک نہ کی وہ رحم و امان کی درخواست تک نہیں کرتے تھے ورنہ ایک معمولی شخص کے اگر آپ دو چار ہنٹر رسید کر دیں تو چلانا شروع کر دے گا۔ اور کہے گا دہائی لاٹ صاحب کی بچائیے مارے ڈال رہے ہیں۔

نقصان نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

ہر عاشق کو نہ جانے کیا مرض ہے کہ وہ معدے کا مریض ہوتا ہے اور محبت کی غذا غالباً اُس کو ہضم نہیں ہوتی جس کی وجہ سے وہ گھر بار چھوڑ کر صحراؤں اور جنگلوں میں ٹہل ٹہل کر کھانا ہضم کرتا ہے گھر سے جانے کے بعد ظاہر ہے یا تو گھر میں گندی

لگا کر جاتا ہوگا یا گھر کو اسی حالت میں چھوڑ کر چل دیتا ہوگا جس سے گھر بار تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ پھر ستم یہ ہے کہ بجائے اس خانہ ویرانی پر کفِ افسوس ملنے کے الٹے بغلیں بجاتا ہے اور کہتا ہے کہ عشق میں یہ چیز بھی فائدہ مند ہوتی ہے اور اس فائدہ کا جواز یہ پیش کرتا ہے کہ گھر میں تو محض چپہ بھر زمین چھوڑنا پڑی مگر اسکے بدلے سینکڑوں گز زمین صحرا کی ٹہلنے کو مل گئی۔ لہٰذا کوئی نقصان نہیں ہوا۔

روح القدس اگرچہ میرا ہم زباں نہیں پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی

داد پاتا ہوں یعنی انصاف پاتا ہوں، تحسین و تعریف حاصل کرتا ہوں۔

روح القدس و روح الامین = دونوں حضرت جبرئیلؑ کے لقب ہیں۔ ہم زباں = ہم کلام یا متفق الرائے۔

اس شعر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کے زمانہ میں ملائکہ کے بچوں کے نصاب میں دیوان غالب بھی داخل تھا۔ مرزا صاحب کو اپنے اشعار پر اس درجہ ناز تھا کہ وہ اتھو، نتھو، کلو کو دھیان میں لاتے تھے بہت سے حشرات الارض قسم کے شاعروں نے جو اُن کا کلام سمجھنے سے قاصر تھے اُن کے کلام کو لچر اور مہمل قرار دیا تھا مرزا صاحب نے اس سے تنگ آکر ایک ایسی بات کہی کہ اُن سب کے ہوش درست ہو گئے۔ آپ نے فرمایا کہ بھائی ہمارے کلام میں بعض الفاظ تو ایسے ہیں کہ اکثر حضرت جبرئیل علیہ السلام اُن کے مطالب دریافت کرنے تشریف لاتے رہتے ہیں مگر میں اُن سے بھی زیادہ مطمئن نہیں ہوں اس وجہ سے کہ وہ بھی میرے اشعار کا مطلب واجبی ہی واجبی سمجھ پاتے ہیں۔

جہاں تک اشعار میں فصاحت کا تعلق ہے اُس تک تو خیر وہ بھی نہیں پہنچ پاتے اور پہنچ بھی کیسے سکتے ہیں کیونکہ نہ انھوں نے کبھی دلی آنے کی زحمت فرمائی اور نہ یہاں کی زبان سیکھی۔

Scanned with CamScanner

جہاں اُن کا قیام ہے وہاں کی سرکاری زبان عربی ہے لہٰذا تھوڑے بہت عربی کے مطالعے سے مدد لے کر وہ میری زبان سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہرصورت یہی غنیمت ہے اگر وہ اتنا بھی نہ سمجھتے تو میں اُن کا کیا بگاڑ سکتا تھا اس چیز سے اندازہ ہوتا ہے کہ جناب جبرئیل علیہ السلام بھی اکثر مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن سے اُن کا کلام سمجھ جاتے تھے اور اُس کے بعد عرش بریں پر جا کر اپنے اسکول کے بچوں کو اشعار کا مطلب بتاتے تھے۔

جاں ہے بہائے بوسہ و لے کیوں کہے ابھی غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

بہا: قیمت۔ ابھی: یعنی غالب جب تک جاندار ہے۔ نیم جاں: بے دم۔ کمزور، ادھ موا۔

غالب کے محبوب کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اُس نے خفیہ طریقہ پر مرزا صاحب کی مالی حالت دریافت کر لی ہے۔ ایک دن کا واقعہ سنئے کہ مرزا صاحب محبوب کی دکان پر کچھ بوسے خریدنے تشریف لے گئے اور دریافت کیا کہ قبلہ! آج کل بوسوں کا کیا بھاؤ ہے۔ اُس زمانے میں ایک بوسہ کی قیمت جان کے برابر تھی۔ مرزا صاحب چونکہ "بقید حیات" تشریف لے گئے تھے اس لئے محبوب نے خیال کیا کہ اگر میں اصلی قیمت بتائے دیتا ہوں تو مرزا صاحب فوراً جان کے عوض خرید لیں گے کیونکہ مرزا صاحب کے پاس وہ چیز اُس وقت موجود تھی۔ اس لیے اُس نے مرزا صاحب کو بتا دیا کہ صاحب بوسہ کی قیمت کا حساب کتاب نہ پوچھئے کیونکہ اُس کا بھاؤ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اور اُس کی حالت پاکستانی اور ہندوستانی سکے جیسی ہے۔ آج کچھ ہے تو کل کچھ اور یہ کہہ کر اُس نے بوسے کی اصلی قیمت بتانے سے انکار کر دیا۔ مرزا صاحب سمجھ گئے کہ اُس نے بوسے کا صحیح بھاؤ کیوں

نہیں بتایا۔ حقیقتاً وہ یہ چاہتا تھا کہ مرزا صاحب کو کچھ عرصے اور اُلجھائے رکھے اور اِس انتظار میں مرزا صاحب کو اس حد تک تڑپائے کہ وہ نیم جاں ہو جائیں اور جب وہ نیم جاں ہو جائیں اور بوسہ کی قیمت ادا کرنے کے قابل نہ رہیں تب کہیں کہ حضت تبدیلیٔ جنس کے پیمانے پر ایک بوسہ کی قیمت پوری ایک مسلّم جان ہے اُس صورت میں مرزا صاحب بے بس ہو کر واپس ہو جائیں گے کیونکہ اُن کے پاس صرف نصف قیمت (نیم جاں) ہو گی۔

غزل نمبر ۹

سر کھجاتا ہے جہاں زخم سر اچھا ہو جائے   لذت سنگ باندازہ تقریر نہیں

سر کھجانا = پٹنے کی خواہش ہونا۔ باندازہ تقریر نہیں = یعنی بیان سے باہر ہے۔

اگر آپ کی ملاقات کسی داد زدہ شخص سے ہوئی ہو گی تو آپ نے اندازہ کیا ہو گا کہ داد کھجانے میں اُس کو کیسا مزہ آتا ہے۔ اگر آپ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُس سے کہیں کہ داد نہ کھجاؤ اور اُس کے بدلے میں کائنات عالم لے لو تو بھی وہ انکار کر دے گا کیونکہ داد کھجانے میں جو لذت اُسے حاصل ہوتی ہے وہ بڑی سے بڑی قیمت سے بالاتر ہے۔ مرزا صاحب جو عشق میں مجنوں و دارفتہ سڑکوں پر پھرتے تھے۔ بچے اُن پر تفنن طبع کی خاطر خشت باری کرتے تھے اور اُس سے اُن کا جسم زخمی ہو جاتا تھا اور اُن زخموں سے اُن کو بجید لذت حاصل ہوتی تھی چنانچہ جہاں زخم مندمل ہونا شروع ہوئے یہ پھر سپتھر کھانے پہنچ جاتے اور ان کو دوسرے زخم کی خواہش پیدا ہوتی گو یا زخمی ہونا ان کا طبیعت ثانیہ بن گیا تھا۔ زخم کو کھجانے میں ان کو وہ مزہ آتا تھا کہ کیا کسی داد والے کو یہ لذت حاصل ہوتی ہو گی۔

غزل نمبر ۱۰

مت مردمکِ چشم میں سمجھو یہ نگاہیں   ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

مردمکِ چشم = آنکھ کی پتلی ۔ سویدائے دل = دل کے سیاہ دھبے۔

مرزا صاحب جس عشق میں مبتلا تھے وہ کئی بار سر پاور کا تھا چنانچہ ان کے ہر بن مُو سے حسرتوں کے فوارے چھوٹتے تھے۔ حسرت کا حساب کتاب کچھ ایسا ہے کہ اس کا تعلق دل اور آنکھ دونوں سے ہے پھر حسرت کے ساتھ اگر آہیں نہ ہوں تو ہانڈی بے نمک ہو کر رہ جاتی ہے حسرت زدہ دل چونکہ حسرتوں کو نالہ و آہ کے ذریعے نشر کرتا رہتا ہے اس لیے بہر حال بلا شرکت غیرے اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتا ہے لیکن آنکھوں کا معاملہ دل سے مختلف ہے۔ کیونکہ اس میں ایک معمولی چارپائی تک بچھانے کی جگہ نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس نے اپنی پتلی کو آہ کی شکل میں منتقل کر لیا ہے اور اس کا اخراج تارِ نظر سے ہوتا رہتا ہے مرزا صاحب کے خیال میں آنکھ کو بھی ایک دل سمجھنا چاہیے اور آنکھوں میں جو پتلی ہے اس کو اگر سویدائے دل قرار دیا جائے تو بہر حال اس صورت میں نگاہوں کو آہ سمجھنا ہی پڑے گا۔ مرزا صاحب نے اس شعر میں یہ بتایا ہے کہ یہ جو عام انسانوں کی پتلیاں ہوتی ہیں وہ تو بہر حال دیکھنے کے کام میں آتی ہیں مگر عشاق کی آنکھوں کی پتلیاں اگر کسی خورد بین سے دیکھی جائیں تو اُن میں آہوں کا ذخیرہ بھی خاصی مقدار میں ملے گا۔

غزل نمبر ۱۱

برشگالِ دیدۂ عاشق ہے دیکھا چاہیے   کھل گئی مانندِ گل سو جا سے دیوارِ چمن

برشگال = برسات ۔ چمن = خانہ باغ

مرزا صاحب کے نزدیک عشاق روتے کیا ہیں، آنکھوں کے ذریعے ساون

بھادوں کا اخراج کرتے ہیں۔ برسات میں اگر موسلا دھار بارش ہوتی ہے تو چمن کی دیوار کسی ایک جگہ سے گر گرا پڑتی ہے لیکن اگر کوئی ڈال کا ٹوٹا عاشق رونے پر اُتر آتا ہے تو وہ ایسا موسلا دھار رونا روتا ہے کہ گل کی طرح دیوار چمن کے پرخچے اُڑا دیتا ہے گویا یہ سارا برسات کا موسم ایک طرف اور عاشق زار صاحب کا معمولی گریہ ایک طرف مقصد یہ کہ عاشق رُلائی کے معاملے میں برسات کے موسم کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا۔

غزل نمبر ۱۲

راز معشوق نہ رسوا ہو جائے ورنہ مرجانے میں کچھ بھید نہیں

مرزا صاحب نے جو کام کیا اُس میں پوری شجاعت اور بہادری دکھائی اُس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہر وقت جان ہتھیلی پر لیے گھومتے تھے اور جان دیدینا اُن کے نزدیک کوئی بڑی بات ہی نہ تھی لیکن عشق کرنے کے بعد یہ جان کی باگ ڈور ہاتھ میں لیے رہے اور اس وجہ سے جلدی مرنے کو تیار نہیں ہوئے کہ یہ اپنے دل میں معشوق کی محبت کا ایک راز آئرن سیف (Iron Safe) میں چھپائے بیٹھے تھے جس کا کسی گھر والے تک کو علم نہ تھا اور عشق میں گھلتے چلے جاتے تھے مگر مرنے سے اس وجہ سے ڈرتے تھے کہ اگر انتقال ہو گیا تو ان کی محبوبہ پر ۳۰۲ کا مقدمہ تو بعد میں قائم ہو گا سب سے پہلے تو محبوب کی رسوائی ہو گی اور پولیس اُن کی پکڑ دھکڑ کر کے نجانے اُن کے ساتھ کیا سلوک کرے کیونکہ اُس وقت مرزا صاحب بھی موجود نہ ہوں گے جو اُن کی خاطر تھوڑی بہت دوڑ دھوپ کریں۔ لہٰذا مرزا صاحب نے اپنے آپ کو غالباً آخری دم تک روکے رکھا اور اُس وقت تک زندہ رہے جب تک کہ وہ ڈومنی۔ جس سے وہ عشق کئے تھے، مر نہ لی

چنانچہ آپ نے مرزا صاحب کے خطوط میں پڑھا ہو گا کہ وہ "ڈومنی جس سے وہ عشق کیے ہوئے تھے" اُن کی زندگی ہی میں مر گئی تھی۔ اُن کے دیوان میں اُس کے مرنے پر جو مرثیہ ہے وہ اس شعر کے حقیقی معنوں کی سند میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

غزل نمبر ۱۲۳

تیرے سروِ قامت سے یک قدِ آدم قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

قیامت کے بارے میں عام لوگوں کا خیال ہے کہ وہ کوئی بھرپور چیز ہے حالانکہ مرزا صاحب نے یہ شعر لکھ کر اس خیال کی تردید کر دی کیونکہ جو قیامت آنے والی ہے۔ وہ انسان سے قامت بھر کم ہو گئی ہے۔ اور مرزا صاحب نے قیامت کی باقاعدہ پیمائش بھی بتائی ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ جب اُن کا محبوب بننے لگا تو فرشتوں نے عام انسانوں کی طرح اُس کا ڈھانچہ بھی تیار کیا لیکن مرزا صاحب نے فرشتوں کو حکم دیا کہ ارے صاحب آپ کیا غضب کر رہے ہیں آخر حفظ مراتب بھی کوئی چیز ہے۔ چنانچہ فرشتوں نے ہاتھ روک لیا اور مرزا صاحب سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ آپ کا مقصد کیا ہے؟ اس پہ مرزا صاحب نے عرض کی کہ وہ جو آپ کے یہاں کسی الماری میں قیامت رکھی ہوئی ہے اُس کو لے آیئے۔ ملائکہ نے الماری سے قیامت نکال کر پیش کر دی کہ حضور قیامت حاضر ہے۔ اِس پر مرزا صاحب نے کہا کہ اس میں سے ایک قدِ آدم ٹکڑا کاٹ کر نکال لیجئے اور اُس پر "قم باذن اللہ" دم کیجئے اُس کے بعد انھیں دنیا میں بھیج دیجئے کیونکہ مجھے اُن پر عاشق ہونا ہے۔ عاشق ہونے کے بعد مرزا صاحب نے اپنی محبوبہ کے بارے میں دنیا والوں میں مشہور کر دیا کہ حضور والا یہ ہماری محبوبہ تو بہر حال ہیں ہی، اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ قیامت کے فتنے سے بھی اپنی قامت بھر بڑھی ہوئی ہیں اور فرمایا کہ ان

کے وجود سے پہلے فتنۂ قیامت جس قدر دراز تھا اب اُس کی درازی میں ٹھیک ان کے قامت کے ناپ سے ایک قدآدم کمی ہو گئی ہے ۔ مرزا صاحب چونکہ گھما پھرا کر بات کہتے تھے اس لیے صرف کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ان کی محبوبہ کے سروقامت سے فتنۂ قیامت کم درجہ کی چیز ہے اور ان کی محبوبہ کا قد قیامت کا ایک ٹکڑا ہے اس لیے ان کے وجود میں آنے کے بعد قیامت ایک قد آدم بھر کم ہو گئی ہے ۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ ‏ ‏ ‏ ‏ تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

ایک مولوی صاحب کسی طوائف کے یہاں جا پہنچے ۔ اتفاق سے یارانِ طریقت نے اُن کو دیکھ لیا اور بالاخانہ پر پہنچ کر پوچھا "مولوی صاحب یہ کیا؟" مولوی صاحب آدمی ذہین تھے چنانچہ وسطِ حلق سے الفاظ نکالتے ہوئے فرمایا کہ حسنِ خداوندی کا نمونہ دیکھنے حاضر ہوا ہوں ۔ اس شعر میں غالباً مرزا صاحب اسی واقعہ سے متاثر ہیں ۔ چنانچہ "اہلِ کرم" سے روپیہ وصول کرنے کے سلسلہ میں فقیروں کا بھیس بدلکر پہنچے ہیں اور بھیک مانگ کر کچھ منفعت حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن جب مرزا صاحب کو ایک دوست نے اس حالت میں تحصیل وصول کرتے دیکھ لیا اور دریافت کیا کہ مرزا صاحب تمہیں پہ نہیں معلوم تھا کہ آپ کام بھی کرتے ہیں تو بولے بھئی میں بھیک مانگنے کی غرض سے تھوڑی آیا ہوں میں تو اہلِ کرم کا امتحان لینا چاہتا ہوں کہ واقعی وہ اہلِ کرم ہیں بھی یا نہیں اور اگر ہیں تو اُن کا کرم کس پایہ کا ہے ۔

غزل نمبر ۱۴

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں ‏ ‏ ‏ ‏ کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

التہاب = شعلہ کا بھڑکنا ۔ نار = آگ ۔

مرزا صاحب چونکہ ایک مذہب نشان تھے لہذا یہ پہلے سے سمجھے ہوئے تھے کہ اُستاد دنیا میں جو کچھ کر رہے ہو اُس کا نتیجہ اچھا نہیں اور مرنے کے بعد براہ راست دوزخ میں ڈالے جاؤ گے لہذا مرزا صاحب نے دوزخ میں مزے اڑانے کا بھی ایک پہلو نکال ہی لیا اور ایسا پہلو نکالا کہ دوسرے عشاق بھی بغلیں بجا کر دوزخ میں جانیکی آرزو کرنے لگے۔ مرزا صاحب کا محبوب جیسا کہ اس سے پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے بید سُرخ و سفید تھا جب اس کا منہ غصہ سے پھول جاتا تو اُس کے رُخساروں سے شعلے بلند ہونے لگتے اور شعلے آگ سے بھی نکلتے ہیں۔ لہذا اس اعتبار سے معشوق کے رخساروں اور آگ سے نکلے ہوئے شعلوں میں ایک طرح کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ مرزا صاحب اپنے معشوق کے غصہ ہونے میں بہت زیادہ لذت محسوس کرتے تھے اور انھیں اُس کی غصہ والی ادا سے راحت اور سکون ملتا تھا۔ اس لیے آپ اس نتیجہ پہ پہنچے کہ اگر مرنے کے بعد دوزخ میں ڈالے گئے تو وہاں بھی آگ سے شعلے بلند ہوں گے اور ہم کو چونکہ معشوق کے رخساروں سے نکلے ہوئے شعلوں سے لذت حاصل ہوتی رہی ہے اس لیے ہم دوزخ کے شعلوں سے بھی لطف حاصل کریں گے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ یقین مانئے کہ اگر دوزخ میں مجھے راحت نہ ملی تو میں مُنکرِ وفا ہو جاؤں گا۔

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں

مرزا صاحب کی محبوبہ کی زندگی کا مقصد صرف مرزا صاحب کو تپانا اور تڑپانا تھا چنانچہ وہ ہمیشہ اُن سے دُور دُور بھاگتی رہی اور اُنھیں ہجر میں تڑپاتی رہی۔ اگر اتفاق سے کبھی بھولے بھٹکے مرزا صاحب کی خیریت دریافت کرنے آئی بھی تو وہ بھی خواب میں۔ پھر خواب میں بھی اگر آئی تو چاہیے تھا کہ گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر بات کرتی اور مرزا صاحب کی

دلجوئی کرتی مگر وہ خواب میں بھی ہوا کے گھوڑے پر سوار آئی اور بیٹھتے ہی مرزا صاحب سے
بولی اچھا تو مرزا صاحب اب اجازت دیجئے انشاء اللہ بندی پھر حاضر ہوگی۔ اس کے
جانے کے بعد مرزا صاحب کی نیند ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُچاٹ ہوگئی اور وہ اس طرح میں
دوبارہ نہ سوئے کہ نہ جانے کس وقت وہ پھر آدھمکے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مرزا صاحب کو
ایک سیکنڈ آرام سے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ سونے سے چونکہ مرزا صاحب کو تھوڑا بہت
سکون مل جاتا تھا سو وہ بھی اُس کے خواب میں آنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا اور
مرزا صاحب کو اُس کے بعد سے کبھی نیند نہ آئی۔

قاصد کے آتے آتے خط ایک اور لکھ رکھوں　　میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

"جو لکھیں گے" اس ٹکڑے سے دو خیال پیدا ہوتے ہیں اول یہ کہ میرزا صاحب
کے خط کا کوئی جواب ہی نہ دیں گے یا یہ کہ جو درخواست مرزا صاحب نے اُن کی خدمت
میں گذاری ہے وہ منظور نہ ہوگی اور ردی کی ٹوکری کے نذر کردی جائے گی اس لیے
ایک دوسرا خط قاصد کے واپس آنے سے پہلے مرزا صاحب لکھنے بیٹھ گئے ہیں تاکہ قاصد
آتے ہی اُسے الٹے پیروں ایک دوسرے خط کے ہمراہ دوانہ کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ
مرزا صاحب نے عشق کیا کیا تھا اچھی خاصی ڈاک [illegible] لی تھی گیری [illegible]
لے رکھی تھی اور دن رات محبوبہ کو خط لکھا کرتے تھے اور سب آدمی کے ذریعہ اُن کی
خدمت میں خط روانہ کیا کرتے تھے اس کی ٹانگیں سویرے سے شام تک
دوڑاتے دوڑاتے توڑ ڈالتے تھے۔ اُن کے خط کا جواب جیسا کہ اس شعر سے
ظاہر ہوتا ہے آتا ہی نہ تھا بلکہ ان کا خط آتے ہی وہ [illegible] کی ٹوکری میں ڈال دیتی
تھی پھر ستم یہ کہ اگرچہ ان کو بارہا اس کا تجربہ ہو چکا تھا کہ جب بھی الخطوط نے

محبوب کو خط لکھا اس نے انھیں رسید تک نہ بھیجی مگر اس کے بعد ہی وہ فوراً آدمی کے جواب لانے سے پہلے ایک دوسرا خط لکھ کر رکھ لیا کرتے تھے جس میں غالباً یہ لکھا ہوتا ہوگا کہ حضرت اگر خدا نا جواب نہیں دیتے تو خط پہنچنے کی رسید ہی ارسال فرما دیتے تاکہ تابعدار کو انتظار کی زحمت سے تو گوارہ کرنا پڑے۔

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں　　شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

خراب = ویران یا نکما

عاشقوں کی جدائی کی راتیں ہماری آپ کی عام راتوں کی طرح بارہ بارہ گھنٹوں کی نہیں ہوتیں بلکہ ان کی ایک ایک رات ہزاروں اور لاکھوں برس کے برابر ہوتی ہے یہ تو ہوا راتوں کا حساب۔ اب اگر ان راتوں کے ساتھ عام دنوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو مدت کا حساب لگانا دشوار ہے کیونکہ عاشقوں کے رات اور دن شمار کرنے والا پہاڑا ابھی تک کوئی حساب داں ایجاد نہیں کر پایا۔

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام　　ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

عشاق ہمیشہ محبوب کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں اور چونکہ رقیب کو اُس سے ہمیشہ قرابت قریبیہ حاصل رہتی ہے۔ لہذا رقیب کی موجودگی میں اگر کوئی چیز محبوب یا ساقی مرزا صاحب کو دیتا ہو تو لامحالہ مرزا صاحب کو فطری طور پر شبہہ ہونا ہی چاہئے کہ کہیں اُس میں زہر یا کچلا تو نہیں ہے۔ مرزا صاحب اس شعر میں فرماتے ہیں کہ ایک دن شراب کا دور اُن کی بزم میں چل رہا تھا اور تمام مجمع کو وہ شراب پلا رہے تھے۔ اتنے میں مرزا صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ مرزا صاحب اس سے قبل بھی بارہا ایسی محفلوں میں شرکت فرما چکے تھے مگر ان کے محبوب کو کبھی اس کی توفیق نہ ہوئی کہ وہ ان کی طرف بھی کوئی جام بڑھا دیتا مگر

آج خلاف توقع اور خلاف معمول ایک جام اِن کے محبوب نے اِن کو بھی پیش کیا اب ان کا شک ملاحظہ ہو کہ جام تو انھوں نے لے لیا مگر اب اُسے بیٹھے سونگھ رہے ہیں اور چکھ چکھ کر دیکھ رہے ہیں اور یہ خطرہ محسوس کر رہے ہیں کہ اس میں رقیب کی سازش سے محبوب نے کچھ تو نہیں ملا دیا ہے جس سے وہ انتقال پُر ملال فرما جائیں ورنہ اُنھیں جام دینے کے معنی کیا؟

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے ہے ایک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

طرفِ نقاب معنی گوشۂ نقاب۔

ہمارے دوستوں میں ایک صاحب تھے جو بیحد دل پھینک واقع ہوتے تھے شادی نہیں ہوئی تھی اور شادی ہونے کے امکانات ہی تھے کیونکہ بیکاری کی زندگی بسر کر رہے تھے اور پڑھے لکھے بھی واجبی تھے مگر دل کے ہاتھوں اس درجہ پریشان تھے کہ سویرے سے شام تک ہر برقعہ پوشں عورت پر مسمریزم کی مشق فرمایا کرتے تھے اور اس کام میں اتنی مشق ہو گئی تھی کہ پنجوں کو دیکھ کر برقعہ پوش کی عمر کا اندازہ فرما لیتے تھے۔ مقصد یہ کہ اگر انھوں نے برقعہ پوشں عورت کے پیروں پہ جھریاں دیکھیں تو جانے دیا ورنہ بغیر جھریوں والی عورت کا دور تک پیچھا کرتے تھے یہی کیفیت عشق میں مرزا صاحب نے خود عاشق بن کر پیش کی ہے اور فرماتے ہیں کہ معشوق نقاب ڈالے چلا جا رہا ہے اور یہ بیچارے ہمارے دوست کی طرح اُس کی نقاب پر نظر جمائے جائے دوسری طرف فٹ پاتھ پر چل رہے ہیں اتفاق سے نقاب کے ایک گوشہ میں ان کو کوئی چیز ابھری ابھری دکھائی پڑتی ہے اس سے یہ برقعہ پوش کی نوک پلک کا اندازہ فرما لیتے ہیں اور سمجھ جاتے ہیں کہ وہ بیحد نالاں ہیں اس کی تیوریاں چڑھی ہوئی ہیں ماتھے پہ شکنیں پڑی ہوتی ہیں اور اس کا

اثر نقاب پر پڑ رہا ہے جس کی وجہ سے اُس میں جھریاں دکھائی پڑ رہی ہیں گویا یہ لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون پڑھنے والوں میں ہیں اور اپنے تجربات کی بنا پر اڑتی چڑیا کو پہچان لیتے ہیں۔

غزل نمبر ۱۵

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے　　نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

رخش = گھوڑا۔ رو میں ہے = تیزی سے رواں ہے۔

مرزا صاحب نے اس شعر میں پولیس ٹریننگ کالج کے اُمیدواروں کا ایک منظر پیش کیا ہے۔ پولیس ٹریننگ کالج میں اگر کسی اُمیدوار سے غلطی ہو جاتی ہے تو اسے ایک بے لگام گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بٹھا کر گھوڑے کو پوری رفتار سے دوڑا دیتے ہیں ایسی حالت میں گھوڑ سوار پر جو کچھ گذرتی ہوگی اُس کا اندازہ پولیس ٹریننگ کالج کے پرنسپل صاحب ہی کر سکتے ہیں مرزا صاحب اس شعر میں فرماتے ہیں کہ دنیا میں انسان کی عمر کا حساب کتاب بھی پولس ٹریننگ کالج کے ننگی پیٹھ والے گھوڑ سوار کے مانند ہے جس کے نہ کوئی زین ہے اور نہ لگام اور انسان کو اُس گھوڑے پر بٹھا کر دوڑا دیا گیا ہے۔ نہ اس گھوڑے کی منزل متعین ہے اور نہ کوئی ٹھکانہ۔ سوار اس پر ان معنوں میں بے اختیاری کے عالم میں بیٹھا ہے کہ نہ تو اس گھوڑے کو روک سکتا ہے اور نہ اُس کی رفتار میں کوئی کمی پیدا کر سکتا ہے۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے　　حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

شہود معنی حاضر و موجود　　شاہد معنی مشاہدہ کرنے والا۔ مشہود معنی جس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ مشاہدہ معنی دیکھنا۔

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وجودی ما غیر حق کی نفی کرتے
ہیں اور شہودی کائنات کے وجود کا اثبات کرتے ہیں مگر اس تصریح کے ساتھ کہ کائنات
کا وجود ظلی ہے یعنی یہ کائنات یا حادث، حادث، قدیم کا سایہ یا پرتو ہیں چونکہ یہ
وجود جس کی حقیقت کچھ بھی نہیں تجلیات سے جلا پاتا ہے اس لیے انھیں بھی حق کا
مشاہدہ ہوتا ہے

ایک صاحب نے اپنے دوست سے کہا کہ کوئی ایسا لطیفہ سناؤ جس میں "ش"
کی تکرار ہو چنانچہ انھوں نے برجستہ ایک لطیفہ سنایا اور بولے ملاحظہ ہو "شمس خاں
کے شکرے نے شفتالو کی شاخ پر شاما کی ماری شفتا آ اور شیخ نے کہا شاباش شاباش"
اس شعر میں "ش" کی تکرار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب سے بھی کسی صاحب
نے اسی قسم کی فرمائش کی ہوگی چنانچہ انھوں نے تصوف کے ایک مسئلہ کو "ش" کی تکرار
کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مرزا صاحب چونکہ وجودی مسلک کے حامی تھے اس لیے وہ
اعتراض کرتے ہیں کہ جب شہود شاہد و مشہود اصل میں ایک ہی ہیں تو پھر مشاہدہ
بے معنی ہے ہاں ناظر اور منظور میں غیریت ہو تو مشاہدہ کا مفہوم سمجھ میں آ سکتا ہے،

غزل نمبر ۱۶

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں — مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

رونا پیٹنا یعنی ماتم کرنا۔ نوحہ گر معنی بسوریہ

گھر میں دو میتیں پڑی ہوئی ہیں اور ان دونوں کو رونے والا صرف ایک
ہے اب رونے والے کی جان عجیب الجھن میں ہے کہ رونے کے اوقات کی تقسیم کس
طرح کی جائے جو دونوں مرنے والوں کو شکایت نہ ہو۔ صاحب ہمارے لیے آپ نے

رونے میں بخل فرمایا حالانکہ آپ کے عشق میں ہم دونوں برابر کے شریک رہے پھر بھی فریق مخالف کی جان کو رونے میں آپ نے بخل سے کام لیا اور زیادہ مقدار میں آنسو بہائے مرزا صاحب چونکہ زندگی بھر روتے رہے تھے اس لیے اب ان کے پاس گریہ و زاری کا سرمایہ بہت تھوڑی مقدار میں رہ گیا تھا مگر وہ دل و جگر دونوں کو جن کا عشق نے جنازہ نکال دیا تھا مساوی طور پر رونا چاہتے ہیں لہذا سخت پریشان تھے کہ کیا صورت اختیار کی جائے اور کس طرح ایک جانِ ناتواں دو دو مرنے والوں کو بیک وقت ایک لے اور ایک دھن میں روئے لہذا ان کے لیے صرف یہی ایک صورت رہ گئی کہ وہ کچھ رونے والوں کو کرائے پر بلوالیں اور ان سے کہیں کہ وہ مساوی طور پر چھاتیاں کوٹ کوٹ کر رو دیں تاکہ مرنے والوں کی ارواح کو سکون کلی حاصل ہو اور کمی بیشی کی شکایت بھی نہ ہو۔

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

چھوڑا رشک نے اجازت نہیں دی۔ کدھر جاؤں، کیا تدبیر کروں بحالت تحیر [illegible]۔

مرزا صاحب نے اپنے محبوب کے گھر کا پتا اور نمبر نوٹ کر لیے ہیں اور ان کا نام بھی معلوم کر لیا ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ یہ اپنے عشق کا اظہار کسی کے سامنے کرنا نہیں چاہتے۔ اتفاق سے ایک دن ان کو شیطان نے جو انگلی دکھائی اور رات کی تاریکی میں یہ محبوبہ کے گھر کی طرف روانہ ہوئے تو چونکہ رات زیادہ آگئی تھی لہذا وہ گلی کوچوں میں روشنی کا کوئی انتظام نہ ہونے کے سبب راستہ بھول گئے اور ادھر ادھر بھٹکنے لگے اب سخت مصیبت میں مبتلا ہوئے کہ کسی

صورت سے محبوب کے مکان تک پہنچا جائے ایک طرف یہ خیال کہ کہیں عشق کا راز فاش نہ ہو جائے دوسری طرف یہ خیال کہ اگر لوگوں سے نام اور گھر کا پتہ بتا کر پوچھتا ہوں تو ہر گلی کوچے میں غنڈے گھوم رہے ہیں کہیں نام و پتا سن کر وہ ان کے محبوب پر عاشق نہ ہو جائیں جو بیٹھے بٹھائے اچھی بھلی چوٹ ہو جائے دوسرے معنی اس شعر کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مرزا صاحب دوست کے گھر جا رہے ہیں راستہ میں ان کے دوست احباب دریافت کرتے ہیں کہ کہئیے مرزا صاحب کہاں چلے؟ اب مرزا صاحب کو رشک اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ دوست کے گھر کا ذکر کریں لہٰذا بحالت حیرانی ہر شخص سے جو مرزا صاحب سے پوچھتا ہے کہ آج ادھر کیسے آنا ہوا خود ہی دریافت کرتے ہیں کہ بھائی بتاؤ کدھر کو جاؤں ۔

جاتا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار   اے کاش جانتا نہ تری رہگذار کو میں

اے کاش ۔ تمنا ۔ رقیب کے در پر جانے کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ معشوق کی آمد و رفت رقیب کے ہاں ہے اس لیے یہ اس شوق میں جا رہے ہیں کہ رقیب محبوب سے کیا باتیں کرتا ہے ۔ کوئی جھوٹی سچی لگائی بجھائی کی بات تو نہیں کرتا ۔ دوسرے یہ سوچ کر بھی جاتے ہیں کہ محبوب سے اگر ملاقات نہ ہو سکے گی تو کم از کم کسی قریب کی دکان کے چبوترے پر کھڑے ہو کر راستہ تکیں گے گھر آباد کھڑکیوں ہی کو دیکھ کر بس کریں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ مرزا صاحب کا محبوب اور رقیب دونوں ایک ہی مکان کی اوپر اور نیچے کی منزل میں رہتے ہوں اور دونوں مکانوں میں آمد و رفت کی ڈیوڑھی ایک ہی ہو بہر حال مرزا صاحب کو دل کے ہاتھوں مجبوراً اس مشترکہ ڈیوڑھی پر جانا پڑا ڈیوڑھی پر پہنچ کر مرزا صاحب سوچتے ہیں کہ ہائے کیا اچھا ہوتا کہ میں اس راستہ سے

واقف ہی نہ ہوتا کہ نہ اس ڈیوڑھی پر جاتا اور نہ رقیب کا دروازہ دیکھ کر رشک و حسد سے جلنا پڑتا۔ اس ذلت سے ہزار گنا بہتر یہ تھا کہ مجھے یہی نہ معلوم ہوتا کہ وہ محلہ رسی بٹاں میں رہتے ہیں یا محلہ قبرستان میں۔

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں

مرزا صاحب اپنے محبوب کے رگ پٹھوں سے بخوبی واقف تھے ان کو اس کا بھی بخوبی علم تھا کہ محبوب کی کمر کا یا تو سرے سے وجود ہی نہیں اور اگر بالغرض ہے بھی تو وہ اس درجہ پتلی ہے کہ خوردبین سے بھی نظر نہیں آسکتی۔ لہٰذا ادبر اور نیچے کا دھڑ دونوں ہوا میں معلق ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی چیز معدوم ہو تو اس کا باندھنا اور کسنا کیا معنے؟ کمر کسنا کے معنی مصمم ارادہ کرنا یا قتل کرنے کے ارادے سے مراد ہے۔

ایک دن مرزا صاحب کے محبوب نے فیصلہ کیا کہ چلو اس روز کی جھک جھک سے بہتر یہ ہے کہ مرزا صاحب کو قتل کر دیا جائے تاکہ آئے روز کے ہنگاموں سے نجات ملے چنانچہ انھوں نے مرنے کی تیاری شروع کر دی بازار سے کافور منگوایا قریب کے باغ سے بیری کے پتے منگوائے۔ حجاموں کو غسل کرائی کی پیشگی رقم ادا کر دی قبرستان میں زمین کا بیعانہ دیدیا اور بولے کہ . . . .

. . . . بسم اللہ قتل کرنے کے لیے کمر کس لیجئے۔ مرزا صاحب کے اس اطمینان پر اس کو حیرت ہوئی۔ اس کے بعد اس نے مرزا صاحب سے کہا کہ میں نے آپ کو قتل کرنے کا مصمم ارادہ تو کر لیا ہے لہٰذا تیار ہو جائیے مگر قتل کرنے سے پہلے میں آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ آپ اس قدر مطمئن کیوں

ہیں اس پہ مرزا صاحب نے مسکرا کر فرمایا کہ ارے بھئی میں پہلے سے واقف ہوں کہ آپ کے گھر ہی نہیں ہے آپ قتل کرنے کے لیے کہیں گے گیا

تو وہ مجھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ ونام ہے یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

بے ننگ ونام = بے عزت : بے حرمت ۔ یعنی سوسائٹی میں جس کا کوئی مقام نہ ہو۔

مرزا صاحب عشق میں اپنا سارا اثاثہ بیچ چکے ہیں اور اب ان کے پاس ایک پائی کھانے کو نہیں ہے اور یہ سب انھوں نے اس وجہ سے کیا کہ عشاق راہ وفا میں ہر چیز کو لٹا دینا عین عزت سمجھتے ہیں انھوں نے سارا روپیہ پیسہ اس امید پہ لٹایا تھا کہ شاید اس ایثار و قربانی سے متاثر ہو کر محبوب کی نگاہ میں اُن کی عزت بڑھ جائے مگر محبوب نے جب ان کو خستہ حال اور مفلس دیکھا تو اس نے ان کی طرف سے نگاہیں بالکل پھیر لیں اور نہ صرف یہ بلکہ جگہ جگہ مرزا صاحب کو بدنام کرنے کے لیے کہنا شروع کیا کہ مرزا صاحب کے پاس کوڑی کفن کو تو ہے نہیں چلے ہیں عشق کرنے ۔ مرزا صاحب کے بارے میں رقیب پہلے ہی سے یہ مشہور کئے ہوئے تھا کہ وہ بے ننگ ونام ہیں مگر مرزا صاحب اُس کی اِن باتوں پہ اس وجہ سے خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے تھے کہ ظاہر ہے وہ تو دشمن اور رقیب پہلے ہی سے ہے وہ اگر بدنام نہ کرے گا تو کیا اپنی ولدیت کے خانے میں مرزا صاحب کا نام لکھائے گا ۔ البتہ جب محبوب نے مرزا صاحب کے اتنے ایثار و قربانی کے بعد بھی اُن کو حقیر اور مفلس قرار دیا تو مرزا صاحب کا کلیجہ پھٹ گیا اور انھوں نے دل میں کہا کہ اگر پہلے سے یہ معلوم ہوتا کہ محبوب اس طرح گھر بار لٹانے کے بعد بھی ان کو قلاش اور مفلس تصور کرے گا تو وہ سارا روپیہ جمع رکھتے اور نہایت شان و شوکت کی زندگی بسر کرتے مگر مرزا صاحب کی حالت

یہ تھی کہ وہ پیسہ پیسہ بھی گیا اور ان کے ہاتھ بھی کچھ نہ لگا گویا نہ مایا ملی نہ رام۔

غزل نمبر ۱۷۰

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

منظور نہیں معنی پسند نہیں۔ بات بگڑنا = مطلب براری کا دھونا

خدا جانے مرزا صاحب نے اپنے محبوب کا کونسا باپ مارا تھا جو اُسے ان کی صورت اور ان کے نام سے نفرت تھی اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ اگر مرزا صاحب کا نام لے کر کوئی صاحب ان کو برا بھلا کہتے دکھائی دیتے تو وہ اُس مقام سے یہ سوچ کر ہٹ جاتا یا اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیتا کہ بار بار مرزا صاحب کا نام لیکر اُسے نہ سنائی دے۔

غرض مرزا صاحب کا اُس کی محفل میں نام لینا تک جرم قرار دیدیا گیا تھا۔ مرزا صاحب اب یہ دعائیں مانگ رہے ہیں کہ خدا کرے شکایتاً ہی رقیب اُن کی محفل میں میرا نام لے بیٹھے اور اس پر ان کا محبوب رقیب سے بگڑ کر اس پر برس پڑے۔ اور ان کو کچھ ہی کام حاصل ہو جائیں۔

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

رعونت معنی غرور نخوت۔

مرزا صاحب نے اپنے محبوب سے لاکھ لاکھ ہاتھ جوڑے کہ حضرت! کبھی عید بقر عید ہی گھڑی دو گھڑی ہمارے پاس تشریف لے آیا کیجئے لیکن ہمیشہ اِن غریب کو نفی میں جواب ملا۔ اس سے تنگ آکر مرزا صاحب نے ایک دن کہا کہ اچھا جایئے آپ بھی کیا یاد کریں گے کہ کسی رئیس سے سابقہ پڑا تھا۔ بہر حال یہاں تو ہم بالکل مایوس ہو چکے ہیں مگر اللہ میاں کے یہاں اگر ہم سے پوچھا گیا کہ انگور

کھائیے گا؟ ہم کہیں گے نہیں۔ حکم ہو گا کہ آموں سے شوق ہے؟ ہم کہہ دیں گے بالکل نہیں۔ اس کے بعد جب ہم سے بہت اصرار سے پوچھا جائے گا کہ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ تو ہم کہہ دیں گے کہ آپ ہمارے لیے کوئی چیز نہ منگوائیے۔ صرف جنت سے تھوڑی دیر کے لیے ان کو بلوا دیجئے جب مرزا صاحب کی ان باتوں کی اطلاع محبوب کو ملی تو وہ مارے غصہ کے کانپنے لگا اور نہایت لاپروائی اور حقارت سے اپنے نخروں میں گرم مسالہ ڈالتے ہوئے بولا اچھا اب مرزا صاحب ہم کو حور جیسی حقیر چیز سمجھنے لگے ہیں۔ مگر مرزا صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ دنیا زیادہ سے زیادہ مبلغ ایک عدد حور ان کے حوالے کر دی جائے جس کی ہمارے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں

غزل نمبر ۱۸

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

مرزا صاحب کو یہ تو معلوم ہی تھا کہ ان کا محبوب اُن سے نفرت کرتا ہے چنانچہ آپ نے دیکھا ہو گا کہ ہر معاملہ میں اگر ہم کہتے ہیں تو وہ الٹی کہتا ہے اس لیے مرزا صاحب نے جن کو اس کے جور و تشدد سے لذت حاصل ہوتی تھی یہ طریقہ اختیار کیا کہ رات دن نالے کرتے اور آہیں بھرتے تھے اور اس صورت سے گویا محبوب کو ظلم و تشدد پر آمادہ رکھتے تھے اگر مرزا صاحب کہیں اُس کو یہ بتا دیتے کہ اس کے جور و تشدد سے ان کو مزا آتا ہے اور لذت حاصل ہوتی ہے تو شاید وہ اُس دن سے جور و تشدد سے محض اس بنا پر دست کشی اختیار کر لیتا کہ مرزا صاحب اُس لطف لیتے ہیں۔ ایک دن جب ان کا محبوب بہت خوش مزگیوں میں تھا تو انھوں نے باتوں باتوں میں اُس سے کہا کہ حضرت یہ جو ہم رات دن آہ و زاری کرتے ہیں اور اسے ہم نے ہمیشہ بنا رکھا ہے

اس کا مفہوم شاید آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو آپ کے جور و تشدد سے تکلیف ہوتی ہے یقین مانیئے کہ اب ہم اس منزل سے کوسوں آگے نکل گئے ہیں آپ تو جس دن ہمارے اوپر تشدد نہیں ہوتا اس دن ہم کو سخت اذیت محسوس ہوتی ہے چنانچہ ہم نے جو آہ و زاری اور نالہ و فریاد کو پیشہ کے طور پر اختیار کیا ہے یہ ہمارا حسن طلب ہے نہ کہ شکوۂ بیداد ۔

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم　　دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

وسعت معلوم : وسعت میں بہت کم ہے ۔

جو لوگ آوارہ گردی کی زندگی بسر کرتے ہیں اُن کا گھر میں ایک منٹ کو دل نہیں لگتا عشاق چونکہ عشق کے اختلاج میں مبتلا رہتے ہیں اور اُن کو دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی اس لیے کہ گھر میں رہنے کی حالت میں بھی اُن کا گھر دشت کے مانند ویران نظر آتا ہے ۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ گھر میں جگہ تھوڑی ہوتی ہے اور ویرانہ میلوں تک چلا جاتا ہے اس لیے ویرانہ میں گھر کے مقابلے میں گھومنے پھرنے کی آسانی رہتی ہے عاشق چونکہ محبت کی بدہضمی کا شکار رہتے ہیں اس لیے اُن کو محبت ہضم کرنے کے لیے لمبے چوڑے میدانوں اور بیابانوں کی ضرورت پڑتی ہے چونکہ گھر میں بمقابلے ویرانے کے ٹہلنے کے لیے کم زمین ہوتی ہے اس لیے فرماتے ہیں کہ جنون و وحشت میں جو مسرت بیابان میں ٹہلنے سے حاصل ہوتی ہے وہ گھر میں کیسے نصیب ہو سکتی ہے ان حالات میں بیابان میں پہنچنے کے بعد شاید ہی کوئی احمق عاشق ہوگا جو گھر کو یاد کرتا ہو ۔

سبد گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں　　مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں

سبد گل : پھولوں کی ٹوکری

گلچیں جب چڑیاں پکڑنے نکلتا ہے تو بلبلوں کو پکڑ پکڑ کر پھولوں کی ٹوکری میں بند کرتا رہتا ہے۔ چونکہ بلبل پھول پر عاشق ہوتا ہے اس لئے اس کی دلی آرزو یہ ہوتی ہے کہ اسے اپنے محبوب یعنی گل کی قربت حاصل ہو جائے اور گلچیں اسے پکڑ کر پھولوں کی ٹوکری کے نیچے بند کر دے۔ ایک صاحب تھے جو خود بھی جرائم پیشہ تھے اور ان کی محبوبہ بھی مگر نہ جانے پولیس والوں کو ان سے کونسی رقیبانہ کد تھی یا قدرت ان دونوں کے ملنے کے خلاف تھی کہ جس زمانہ میں معشوقہ جیل کا کندہ ہوتیں عاشق صاحب آزادی کے میدان میں بلبلوں کے کندے پر رکھ کر دہ اپنی آرزو کی اس حقیقت کو چھیڑا ہے ہیں اور فرماتے ہیں کہ مرغ ہائے چمن خوش ہو کر آج باغ میں گلچیں ان کو گرفتار کرنے کے چکر میں گھوم رہا ہے لہذا آؤ اور اس کے ہاتھوں گرفتار ہو کر سب گل یعنی پھولوں کی ٹوکری کے نیچے بند ہو جاؤ کیونکہ آج سوائے گلچیں کے باغ میں کوئی چڑی مار دکھائی نہیں پڑ رہا ہے جس سے یہ خطرہ محسوس ہو کہ وہ تم کو پکڑ کر بازار میں بیچ دے گا یا گلزار سے باہر لے جائے گا۔

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

مرزا صاحب کا خیال ہے کہ جنت اگرچہ محبوب کے کوچہ کے لگ بھگ حسین اور دلکش ہوگی مگر اس میں . . . . کوچۂ محبوب کے مقابلہ میں بہت تھوڑی سی آبادی ہوگی اس وجہ سے کہ وہاں صرف وہی لوگ جائیں گے جنہوں نے دنیا میں نیک اعمال کی زندگی گذاری ہوگی اور دنیا میں چونکہ گناہ گاروں کی تعداد نناوے فیصدی ہے لہذا جنت میں زیادہ سے زیادہ کچھ یا سو پچاس درویشوں اور خدا پرستوں کے بنگلے ہوں گے مولویوں اور خدا پرستوں کے دو چار مکان ہوں گے مگر اس کے مقابلہ میں کوچۂ محبوب میں اول تو عشاق

کی ایک بھیڑ یا دھسان ہو گی۔ دوسری عشاق کی ریل پیل کے سبب سیکڑوں بیڑی سگریٹ کی دوکانیں ہوں گی اور چلائے خانوں کا تو کوئی حساب ہی نہیں کیونکہ عشاق کوچہ محبوب میں پڑے پڑے یا تو خون جگر پیتے ہیں یا شب بھر نیند سے بچنے کے لیے چائے پیتے ہیں لہذا عشاق کی نظر میں ان ساری چیزوں کے پیش نظر کوچہ محبوب کو جنت پر افضلیت حاصل ہے۔

غزل نمبر ۱۹

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کا محبوب امریکی وضع کی کسی سو منزلہ عمارت کی آخری منزل میں مقیم تھا جہاں پہنچنے کے لیے عاشقوں کی ایک جم غفیر روانہ ہوئی ہے جس میں مرزا صاحب بھی شامل ہیں۔ اتفاق سے ہوٹل والوں کو بھی پتہ نہیں کہ وہ کس نمبر کے کمرے میں مقیم ہیں لہذا سخت پریشان ہیں کہ کیا صورت اختیار کی جائے۔ یہ تمام عشاق پتہ پوچھتے پوچھتے اُس عمارت کے نیچے پہنچے۔ مرزا صاحب کے زمانے میں لفٹ کا رواج نہ تھا جس کے ذریعہ اوپر پہنچا جائے لہذا یہ تمام عشاق زینے کے ذریعے اوپر چڑھنا شروع ہوئے چونکہ یہ سب کے سب عشق و محبت اور ہجر و فراق کے مصائب برداشت کرتے کرتے اپنی ساری توانائی کھو چکے تھے اس لیے کچھ عشاق کا تو پہلی ہی منزل میں چڑھتے چڑھتے دم پھول گیا اور وہ وہیں رہ گئے کچھ جو اُن سے ذرا جیالے تھے دوسری منزل سے آگے نہ بڑھ سکے بعض جو مقابلتاً دوسروں کے ہاتھ پیروں کے اچھے اور تگڑے تھے وہ تیسری منزل تک جا سکے غرض کوئی صاحب آخری منزل تک نہ پہنچ پائے اب مرزا صاحب اس کا شکوہ کرتے ہیں کہ صاحب آپ تک پہنچنا تو عشاق کے بس سے باہر ہے کیونکہ آپ نے اتنے اونچے پر گھر لے رکھا ہے کہ وہاں تک عشاق کی رسائی ناممکن ہے۔

غزل نمبر ۲۰

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر عشق کا اُس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

اِس شعر میں مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ رقیب نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے معشوق کو خوب اچھی طرح پٹا لیا ہے اور مرزا صاحب کے معشوق کو اُس کی محبت کا پورا پورا یقین ہو گیا ہے حالانکہ وہ معشوق سے خاک محبت نہیں کرتا بلکہ محض اپنی چرب زبانی سے اُس نے محبوب کو اپنا لیا ہے مثلاً وہ محبوب سے کہتا ہے ارے صاحب آپ کو دیکھنے کے بعد چودھویں رات کے چاند کی صورت سے نفرت ہو گئی بھلا کہاں چاند اور کہاں آپ۔ کہاں گنگوا تیلی اور کہاں راجہ بھوج۔ اس کے برخلاف مرزا صاحب چونکہ نہایت کم سخن اور خاموش قسم کے انسان تھے اور اُنھیں ٹریٹ زبٹ اڑانا نہیں آتی تھی لہذا جب محبوب سے ملتے سلام علیکم وعلیکم السلام کر کے بیٹھ جاتے اور زیادہ سے زیادہ پوچھتے کہ کہئیے بال بچے خیریت سے ہیں۔ والدہ محترمہ کا مزاج بخیر ہے وغیرہ وغیرہ، مرزا صاحب کے اس شریفانہ رویہ سے محبوب ان کو صدرجہ بھوندوں قسم کا انسان سمجھے ہوئے ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ اپنا عشق لیے بیٹھے ہیں اور ان کا رقیب اپنی چرب زبانی اور عیاری سے مزے اڑا رہا ہے۔

غزل نمبر ۲۱

قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دستِ قیس میں آنا تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

قیامت ہے ۔ غضب ہے ۔ فریاد ہے ۔

مرزا صاحب اپنے محبوب کو لیلیٰ اور مجنوں شیریں اور فرہاد کے عشق و محبت کے افسانے سنا سنا کر پٹانے کی کوشش کرتے ہیں مگر اُن کا محبوب چونکہ سیکڑوں برسات دیکھے ہوئے ہے اس لیے وہ ان چرکے بازیوں سے بخوبی واقف ہے ایک دن مرزا صاحب

نے محبوب سے بیان کیا کہ ارے صاحب! یہ جو آپ ہم عاشقوں پہ جور و تشدد فرماتے ہیں اور ہمارے غریب خانے پر کبھی بھولے سے تشریف نہیں لاتے تو ایسا واقعہ تو بڑے بڑے عشاق کی داستانوں میں نظر نہیں آتا۔ لیلیٰ ہی کو لے لیجئے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک دن مجنوں صحرا میں زمین کا گز بنا ہوا تھا کہ اُس کو مجنوں کے حال زار پر ترس آ گیا اور از راہِ مہربانی وہ خود مجنوں سے ملنے صحرا پہنچ گئی۔ اس تاریخی واقعے کو سُننے کے بعد ان کے محبوب صاحب ہنسے اور یہ سمجھ کر ہنسے کہ یہ واقعہ تو تاریخ میں موجود ہے اس لیے غلط نہیں ہو سکتا لیکن یہ سب ہم کو پٹانے کے لیے کہا جا رہا ہے چنانچہ اس کے سننے کے بعد تجاہل عارفانہ کے انداز میں مرزا صاحب سے پوچھا کہ اچھا یہ آج آپ کی زبانی نئی بات معلوم ہوئی کہ دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے یہ ساری کتھا بیان کر کے اپنا وقت بھی ضائع کیا اور نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوا کہ یہ بیچارے یہ سوچ کر خاموش ہو گئے کہ غضب ہے وہ اس تاریخی واقعے کو بھی باور کرنے کو تیار نہیں۔

غزل نمبر ۲۲

دل لگا کر لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا   بارے اپنی بے کسی کی ہم نے پائی داد یاں

دل لگانا = عاشق ہونا ۔ بیکسی = مجبوری ۔ لاچاری ۔ تنہائی ۔

مرزا صاحب ہمیشہ اس بات کے خواہش مند رہے کہ ان کے محبوب کو بھی کوئی ایسا واقعہ پیش آئے جس کے سبب اُسے بھی اُن تمام مدارج سے گذرنا پڑے جن مدارج سے یہ خود گذرے ہیں چنانچہ انھوں نے بارگاہ ایزدی میں دعا کی کہ اے پاک بے نیاز تو اُن کو بھی ایسی محبت میں مبتلا کر کہ یہ بھی میری طرح تماشے بنانے پھریں

اور دن رات ہماری طرح آہ و زاری میں مبتلا ہوں چنانچہ ان کی دعا ہوئی اور ایک دن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ان کا محبوب بھی کسی کا تیر نظر کھا کر مجروح ہوا اور اٹا ر کھٹارے کر ایک کوٹھری میں تنہا پڑا دکھائی پڑا۔ مرزا صاحب یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ چلو اچھا ہوا اب اُن کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔

اور یہ بھی بقول شخصے۔

دھرے گئے دل خانہ خراب کے بدلے

چنانچہ مرزا صاحب ایک دن جبکہ یہ اٹا کھٹار لیے پڑے تھے ان کی مزاج پرسی کے لیے حاضر ہوئے اور کہا کہیئے مزاج کیسے ہیں؟ اس پر اُنھوں نے انگڑائی لے کر اور دوسری کروٹ بدلتے ہوئے کہا: ہم سے نہ بولئے بس ہم کو تنہا پڑا رہنے دیجئے۔ اس پر مرزا صاحب تو جلے بیٹھے ہی تھے بولے ارے یہ ہمارا صبر ہے جو آپ کی جان پر پڑا ہے اب آپ کو پتہ چلے گا کہ ہم پر کیسا کیسا وقت آپ کی محبت میں گذر گیا۔ مگر آپ نے ہم سے یہ تک نہ پوچھا کہ ہم پہ کیا ہیں؟

غزل نمبر ۲۲

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

عشق میں مبتلا ہونے کے بعد مرزا صاحب کو صرف یہ کام رہ گیا تھا کہ باہر دروازے پر پلتھی مارے بیٹھے ڈاکیہ کا انتظار کرتے رہتے تھے کہ شاید کوئی محبوب کا خط ان کے نام ہو کبھی ہوا سے کواڑ ہلے اور کھٹ سے آواز آئی اور یہ سمجھے کہ محبوب نے ہوا کی معرفت ان کی خدمت میں کوئی پیام بھیجا ہے غرض سویرے سے شام تک

ان کا بھی دھندارہ گیا تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی اور یہ سوالیہ جملہ کا نشان بنے پہنچ گئے۔

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست بازو کو — یہ لوگ کیوں میرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

ہر محبوب اپنے عاشقوں کے حق میں ہلاکو اور چنگیز خاں ثابت ہوتا ہے اور ان کی نہایت کس کے پٹائی کرتا ہے۔ اس شعر میں مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ عاشق صاحب پٹ پٹا کر اور فارغ التحصیل ہو کر تشریف لائے ہیں۔ اُن کے جسم پر جو زخم آئے ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ پیٹنے والا اپنے کام میں کس درجہ مشاق ہے۔ عاشق صاحب مرہم پٹی کر کے باہر نکلے ان کو خطرہ ہے کہ کہیں مرہم پٹی نہ ہونے کی صورت میں لوگ یہ نہ پوچھیں کہ کیسے حضرت یہ کیا اُفتاد پڑی اور یہ کون صاحب ہیں جنھوں نے اس خوبی کے ساتھ مرمت کی ہے۔ لہٰذا انھوں نے مرہم پٹی کے بعد اوپر سے ایک عدد پرانا امریکن کوٹ پہن لیا تاکہ محبوب کے کس بل اور پیٹنے کے فن پر لوگوں کی نظر نہ لگ جائے تاکہ وہ ہاتھ جو کس کس کر پڑے ہیں، وہ نگاہ بد سے محفوظ رہیں۔

غزل نمبر ۲۴

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں — کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

محبوب نے مرزا صاحب کے بارے میں نہ جانے کیا رائے قائم کر رکھی تھی اور ان کو خدا جانے وہ کس قسم کا بلوائی سمجھے ہوئے تھا کہ اگر کبھی اُس کی بزم میں کوئی دھینگا مشتی یا ہنگامہ ہوتا تو اُس وقت اُسے مرزا صاحب کا خیال آتا اور وہ کہتا کہ معلوم ہوتا ہے کہ آج یہاں مرزا صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں تب ہی یہ بلوہ مچا ہوا ہے گویا مرزا صاحب کو وہ بہت بڑا بلوائی اور فسادی سمجھے ہوئے تھا ورنہ یوں کبھی بھولے سے اُس کے دماغ میں

اِن کا خیال نہیں پیدا ہوا۔

تم اُن کے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

مرزا صاحب کا محبوب ہمیشہ اُن سے جھوٹے وعدے کیا کرتا تھا اور یہ بیچارے ایسے سادہ لوح قسم کے انسان تھے کہ اُس کے ہر وعدے کا یقین کر لیا کرتے تھے لیکن اُس نے زندگی بھر کوئی وعدہ پورا نہ کیا اور جب کبھی راستے، گلی وہ مرزا صاحب کو مل جاتا اور یہ اُسے اُس کا وعدہ یاد دلاتے تو وہ حد درجہ غبی بنکر کہتا کہ صاحب ہم کو تو یاد نہیں کہ ہم نے کبھی اس قسم کا کوئی وعدہ کیا تھا۔ جب اس کی وعدہ خلافیوں نے مرزا صاحب کو چھک کر دیا تو آخر میں مرزا صاحب اس نتیجہ پر پہنچے کہ اب اُس کا وعدہ یاد دلانا حماقت ہے کیونکہ وہ پھر یہی کہہ دے گا کہ حضرت معاف کیجئے گا مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اس قسم کا کوئی وعدہ آپ سے کیا تھا۔

غزل نمبر ۲۵

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے ہم بھی ایک اپنی ہوا باندھتے ہیں

کس نے اثر دیکھا ہے ؟ یعنی آہ میں اثر ہوتا ہی نہیں

مرزا صاحب کو اس کا بخوبی علم ہے کہ اُن کی ساری آہیں جو وہ محبوب کی جُدائی میں بھرتے ہیں

وہ سب کی سب حد درجہ

سیلی ہوئی ہیں جس کی وجہ سے اُن کا کوئی اثر محبوب قبول نہیں کرتا دوسرے یہ کہ آہ کا اثر معلوم کرنے کے لیے ابھی آلات ایجاد نہیں ہوئے ہیں اس لئے ہم اور شوق

دونوں اس معاملہ میں بالکل تاریکی میں ہیں مگر مرزا صاحب چونکہ دُھن کے پکے ہیں اس لیے برابر آنکھوں کو محبوب کی محبت میں نشتر کیا کرتے ہیں کہ شاید کوئی نشانہ ٹھیک بیٹھے اور کار آمد ثابت ہو ۔ ایک دوست نے جب مرزا صاحب سے پوچھا کہ حضور والا اس آہ بازی سے فائدہ ؟ بولے ارے بھائی یہی کیا کم ہے کہ سارے جہاں میں یہ ہوا تو بندھ گئی ہے کہ ہماری ہر آہ نشانہ پر ٹھیک بیٹھتی ہے مقصد یہ کہ جھوٹ موٹ اعتبار جمانا چاہتے ہیں ۔

سادہ پرکار ہیں خوباں غالب ہم سے پیمان وفا باندھتے ہیں

سادہ = کم سمجھ یا سادہ لوح = پُرکار = فریبی ۔ چالاک ۔ خوباں = حسین اور خوبصورت لوگ ۔

مرزا صاحب جو عشق و محبت میں بدر و حنین کے معرکے سر کئے ہوئے ہیں اور جن کے عشق و محبت کے کوچے میں سارے رستے ناخون گھس گئے ہیں اُن کو لونڈے لاڑی قسم کے معشوق چرکہ دینے پر اتر آئے ہیں اور وہ مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر محض چرکہ دینے کے خیال سے فرماتے ہیں کہ مرزا صاحب آپ ہم سے محبت فرمائیے پھر دیکھئے کہ ہم وفاداری میں کون سی کسر باقی رکھتے ہیں مگر مرزا صاحب جو اُن کے ہر داؤں سے واقف ہیں ہم کو آپ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ خدا ان لونڈے لاڑیوں کو سمجھے کہ اب وہ ہمیں چرکہ دینے چلے ہیں اور ہم جیسے گرگ باراں دیدہ کو اپنی وفاداری کا یقین دلا رہے ہیں جب کہ ہم ان کے رگ و ریشہ سے بخوبی واقف ہیں ۔

غزل نمبر ۳۶

زمانہ سخت کم آزار ہے بجان اسد ورنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

سخت کم آزار = بہت ہی کم آزار ۔ بجان = قسم ہے جان کی اے اسد

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ہم معمولی مصائب کو تو نظر ہی میں نہیں لاتے ہم نے جب عشق کیا تھا تو ہم یہ سمجھے ہوئے تھے کہ نہایت اہل ڈبل قسم کے مصائب سے ہمیں دو چار ہونا پڑے گا اور رنگ رنگ کے تشدد ہم پہ ہوں گے اور ہم اُس کے لیے پہلے سے تیار تھے مگر معلوم ہوا کہ زمانے میں اپنا رسائی کی کوئی صلاحیت ہی نہیں ورنہ قسم ہے جان اسد کی کہ بندہ تو اس کوچہ میں دو دہ دو دہ بخشو اگر اد رکفن باندھ کر حاضر ہوا تھا مگر معلوم ہوا کہ زمانے میں مصائب اور آلام بہت ہی معمولی درجے کے ہیں۔ لہٰذا ہماری ساری تیاری اُن مصائب کو برداشت کرنے کی بیکار ثابت ہوئی۔ اور ہم نے جو ڈریں اور رنٹیھکیں اُن سے مقابلہ کے لیے لگائی تھیں وہ سب بیکار ثابت ہوئیں۔

غزل نمبر ۲۷

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

دائم = ہمیشہ ۔ خاک اور پتھر کی لفظی رعایت اس شعر میں ایک خاص لطف دے رہی ہے۔

جب مرزا صاحب کو اس کا پورا پورا احساس ہو گیا کہ محبوب کی نظر میں ان کی وقعت اتنی بھی نہیں جتنی کہ اُس کے کوچے میں پڑے ہوئے پتھروں کے ڈھیر کی ہے تو مرزا صاحب نے اپنے دل میں کہا کہ ایسی زندگی پر خاک پڑے۔ اب ذرا محبوب کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ وہ اپنے عاشقوں کی اتنی بھی وقعت نہیں کرتے جتنی وقعت کہ اُن پتھروں کی ہوتی ہے۔

ملاحظہ ہو شوق کی ستم ظریفی اور طوطا چشمی کہ اُن کی نظر میں اُن کی کوئی وقعت اور عزت نہیں در آنحالیکہ اُن کے احسانات ملاحظہ ہوں کہ

اُن کو ایک پہرہ دار کے مصارف بچ رہے اور ڈھیلے جو سویرے سے شام تک عشاق کھاتے رہے وہ مفت حصے میں آئے جس سے وہ اپنے کوچہ کی سڑک بہ آسانی پختہ کرا سکتے تھے۔ ظاہر ہے اس موقعہ پر اگر کوئی اور ہوتا تو اُن کے کوچے میں تھوکنے تک نہ جاتا

غزل نمبر ۲۸

ان پریزادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

پریزاد = حسین ۔ خلد = جنت

چونکہ مرزا صاحب نے دنیا میں عشق کر کے اتنے مصائب برداشت کئے تھے کہ اُن کو یقین کامل تھا کہ مرنے کے بعد اس کے معاوضے میں اُن کو کم از کم جنت میں تو ضرور جگہ دی جائے گی چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ اگر جنت میں جاتا ہوا اور دنیا کے حسینوں نے جنھوں نے اُن کی زندگی یہاں تلخ کر رکھی تھی اُنھیں بھی وہاں بھیجا گیا تو اسد اللہ خاں نام نہیں جو آٹھ آٹھ دس دس شادیاں کر کے اُن سے وہاں انتقام نہ لیا ہو عورت کو اس سے زیادہ سخت کوئی سزا نہیں دی جا سکتی کہ اس کی موجودگی میں دو چار سوتوں کو اُس پر مسلط کر دیا جائے۔

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو میری کوتاہی قسمت سے مژگاں ہو گئیں

مرزا صاحب سے اُن کے محبوب کو اس درجہ نفرت تھی کہ وہ اِن کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی پسند کرتا تھا۔ چنانچہ اگر وہ مرزا صاحب کو سامنے آتے دیکھ لیتا تو یا تو

زمین کی طرف دیکھتا ہوا ۔۔۔ نکل جاتا یا کسی اور جانب دیکھنے لگتا حالانکہ اگر وہ مرزا صاحب کی طرف دیکھتا تو اُسی کا فائدہ تھا اور وہ یوں کہ اِس طرح دیکھنے سے اُس کی نگاہیں بجائے چھوٹی رہنے کے دراز ہو جاتیں لیکن اس نے بھی قسم کھا رکھی تھی کہ بد تر سے بد تر چیز پر نظر ڈال لیں گے مگر نہیں دیکھیں گے تو مرزا صاحب کی طرف ۔ مرزا صاحب بھی بڑے صاحب کمال اور ماہر نگاہیات تھے کہ انھوں نے اُس کی پلکیں اور بھنویں دیکھ کر یہ اندازہ کر لیا تھا کہ اگرچہ اُن کی نگاہ کوتاہ قد ہیں مگر مِنیا مرچ سے کم تیز نہیں یا جو کہ وہ دل کے پار ہو جاتی ہیں ۔ نگاہوں کے مژگاں ہونے سے یہ مراد ہے کہ کم سنی اور شرم و حیا کے سبب اوپر نہیں اُٹھتیں بلکہ پلکوں کی طرح ہر وقت نیچے کی طرف ۔

واں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کو کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

مرزا صاحب محبوب سے ملنے تشریف لے گئے تھے اور اپنے ہمراہ دعاؤں کے دس پانچ گٹھرے کر گئے تھے کہ جاتے ہی اُن کو ہزاروں دعائیں دینا شروع کر دینگے اور اس طرح خوشامد درآمد سے محبوب کو اپنا ہمدرد بنالیں گے مگر وہاں پہنچ کر پہلی ہی منزل پر اُن کو یہ مصیبت پیش آئی کہ بھوٹیا بَلَم لیے کھڑا اُن کے گھر کی رکھوالی کر رہا تھا چنانچہ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ان کے پاس جتنی دعاؤں کا اسٹاک تھا انھوں نے اُس پر لڑھکا دیا اور دربان کی مدح سرائی میں اُسے ختم کر دیا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب یہ خالی ہاتھ رہ گئے اور دعاؤں کا سارا ذخیرہ ختم ہو گیا اور محبوب کے لیے کوئی دعا باقی نہ بچی تو اب یہ محبوب کی خدمت میں کیا منہ لے کر جاتے اور با عزت طریقے پر واپس آئے گھر سے یہ سوچ کر چلے تھے کہ حسبِ دستورِ قدیم جب یہ محبوب کی خدمت میں پہنچیں گے وہ ان کو

دیکھتے ہی گالیاں دینا شروع کر دے گا اور یہ اُن گالیوں کو اپنی دعاؤں کی ڈھال پر روکیں گے مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ اب دعائیں تو ...... لہ بان کے نذر ہو گئیں اُن کی گالیوں کے وار کس چیز پر روکیں۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

موحد: صرف ایک وجود کو ماننے والا۔ کیش: طریقہ۔ ترکِ رسوم: ظاہری عبادتوں کو ترک کرنا۔ ملت: مذہب، مخصوص عقاید و رسوم کی پابندی۔

اس شعر میں انسان کے حقیقی ایمان کے اجزائے ترکیبی جمع کئے گئے ہیں۔ غالب چونکہ ایک رند مشرب انسان تھے اور ان کے تعلقات ہر فرقہ اور ہر مذہب کے لوگوں سے تھے اس لیے وہ مذہبی لپاڈگی کو برا سمجھتے تھے اُس زمانے میں بھی اور موجودہ زمانے میں بھی ہر شخص غالب کا مذہبی نمبر دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے چنانچہ انھوں نے ہر شخص کے استفسار کا جواب اس طرح پر دیا ہے اور فرماتے ہیں کہ صاحب ہم خدا کو واحد مانتے ہیں اور یہ دنیا کے رسم و رواج اور فرقہ پرستی کو انسانیت کے لیے معزت رساں سمجھتے ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ دنیا میں جتنے مذاہب اور فرقے ہیں اُن کا عرق نکال لیا جائے اور جب اس قسم کا عرق کشید کر لیا جائے گا تو اس کے بعد تمام فرقوں اور مذاہب کے لوگوں کو اس کی شکایت باقی نہ رہے گی کہ صاحب ہمارے اجزا یوں ہی رہے اور اُن کو استعمال میں نہیں لایا گیا۔ اُس صورت میں جب رواسم کی قید ہٹ جائے گی تو جو چیز بھٹی سے تپ کر نکلے گی وہی حقیقی مذہب ہوگا۔ چنانچہ فرماتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ جب ملت پرستی مٹ جاتی ہے تو وہی چیز ایمان کا جزو بن کر سامنے آجاتی ہے اور اسی چیز کو انسان کا اصل مذہب قرار دینا چاہیے۔ اس شعر سے غالب کے

مذہبی انبسے پر روشنی پڑتی ہے اور ہم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ صرف خدا کے قائل تھے۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

خوگر : عادی ہونا۔

یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں حیادار انسان کا زندہ رہنا بہت دشوار ہے بے حیا کی دور بلا۔ وہ نہایت آرام و سکون کی زندگی بسر کرتا رہا ہے کہ اور بسر کرتا رہے گا کیونکہ اُس کی حالت ایک چکنے گھڑے کے مانند ہو جاتی ہے اور اُس پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا۔ جب گوشت مردہ ہو جاتا ہے اور اُس میں کوئی صلاحیت احساس قبول کرنے کی باقی نہیں رہتی تو اُس کے لیے کوئی اذیت، اذیت نہیں رہتی۔ ایک افیونی جس کی زندگی افیون کھاتے گذری ہو اُس پر افیون کے زہر کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہی حالت انسانی مشکلات و مصائب کی ہے کہ اگر انسان اُن کا عادی ہو جاتا ہے تو پھر ایک نہیں، دس ہزار مشکلات بھی اس پر پڑیں وہ ڈٹا رہتا ہے۔ گرہ کٹ کو ایک بار نہیں دس بار آپ جیل بھیجدیں اُس پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ کیونکہ جیل کے چیتھڑے کا ساگ اُس کے منہ کو لگ جاتا ہے۔ اور اگر زیادہ عرصہ اس کو جیل نہیں بھیجا جاتا اور اُس پر پولیس کی مار نہیں پڑتی اُس کی کھال چرّایا کرتی ہے۔

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہل جہاں دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

آپ نے اپنے محلے میں دیکھا ہوگا کہ جہاں بلیوں یا کتوں نے رونا شروع کیا لوگ اُن کے پیچھے ڈنڈے لے لے کر دوڑتے ہیں حالانکہ جس طرح انسان کو رونے کا پیدائشی

حق حاصل ہے اسی طرح ہر مخلوق کو خواہ وہ کتا بلی جو بھی ہو اسے رونے کا حق ملنا چاہیے مگر جانے کس احمق نے یہ مشہور کر دیا ہے کہ زیادہ رونے سے گھر ویران ہو جاتا ہے اور اگر کسی شہر، قصبہ یا بستی میں آپ جاکر مسلسل یہی کام دکھانا شروع کردیں تو ایک دو روز تو بہر حال لوگ آپ کے ساتھ ہمدردی فرمائیں گے لیکن اگر آپ روزانہ چراغ جلے سے رونا شروع کر دیں تو لوگ دوسرے ہی دن آپ کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اپنے محلے یا شہر سے نکال باہر کر دیں گے۔ غالب کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ معلوم نہیں عشق کی چوٹ ان کے جسم کے کس جوڑ پر پڑی تھی کہ انھوں نے پیشہ کے طور پر سر شام سے رونا اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا اور عجب نہیں کہ دلی میں آنے کے بعد وہ شروع شروع جس محلے میں مقیم رہے ہوں وہاں سے اسی سبب سے انھیں نکالا گیا ہو اور انھیں احاطہ کالے صاحب میں منتقل ہونا پڑا ہو کیونکہ مسلسل رونے سے لوگوں نے گھبرا کر کہا ہوگا جاکر رو کو کہ روزانہ سرِ شام یہ کیا نحوست پھیلا رکھی ہے کہ محلہ بھر کے لوگوں کی نیند حرام ہے اگر ان کو اسی طرح رونے دیا گیا تو یہ اپنی نحوست سے پورے کا بستی تباہ و برباد کر دیں گے۔ عجب نہیں سن ۵۷ء میں دلی کی تباہی و بربادی کے ذمہ دار یہی ہوں اور ان کے رونے کی نحوست نے دلی والوں کو یہ دن دکھائے ہوں۔

غزل نمبر ۲۹

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے   دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

یہ شعر غالباً کسی انگریز افسر کی ملاقات سے متاثر ہو کر کہا گیا ہے مرزا صاحب کسی انگریز افسر سے ملنے گئے ہیں۔ مگر چونکہ ہر شخص کو ملنے کی عام اجازت ہے اور ایک بھیڑ یا دھان منڈی سے ایک پر ایک ٹوٹا پڑ رہا ہے چنانچہ اس بھیڑ کو دیکھ کر مرزا صاحب نے کہا ان

سے کہا کہ فینس واپس لے چلو اور لکھ کر بھیجا کہ صاحب آپ سے ملنے آئے تھے مگر ملاقات نہیں ہوسکی بات یہ ہے کہ اگر آپ سے ملنے میں اتنی آسانیاں نہ ہوتیں جتنی عام لوگوں کو دے رکھی گئی ہیں تو میرے لئے آپ سے ملنا آسان تھا یعنی آپ خاص خاص لوگوں سے اگر ملتے ہوتے تو میں بھی آپ سے وقت لے کر مل لیتا مگر دشواری یہ ہے کہ آپ نے ہر ایک کو ملنے کی اجازت دے رکھی ہے اس وجہ سے میری آپ کی ملاقات دشوار ہو گئی ہے۔

ایک اور مطلب اس شعر کا یہ بھی نکلتا ہے جو براہ راست اُن کے محبوب سے متعلق ہے اور وہ یہ کہ اگر محبوب نے ہر شخص سے ملنے کی قسم کھائی ہوتی تو کوئی حرج نہ تھا اور یہ اطمینان ہو جاتا کہ بہر حال اگر وہ ہم سے نہیں ملتے تو رقیبوں اور دشمنوں سے بھی نہیں ملتے مگر مصیبت یہ آن پڑی ہے کہ جس سے محبوب ملنا چاہتا ہے، مل بھی لیتا ہے لہٰذا ہم عشاق ہجر کو تو سہل سمجھتے ہیں مگر رشک کو اپنے لیے آسان نہیں سمجھتے۔

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

شوریدگی = جنون۔ وبالِ دوش = دوش کے لیے دوبھر

مرزا صاحب اپنے محبوب کے عشق میں اپنے ہوش و حواس کھو چکے ہیں اور جنون کے عالم میں صحراؤں اور ریگستانوں میں زمین کا گز بنے ہوئے ہیں۔ جنونِ عشق نے ان کو اس درجہ عاجز کر دیا ہے کہ وہ جان سے بیزار ہیں سوچتے ہیں کہ اگر کوئی دیوار نظر آجائے تو اپنا سر ٹکرا کر جان دے دیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض ڈھکوسلہ ہی ڈھکوسلہ ہے کیونکہ یہ خیال صحرا پہنچ کر اُن کے دل میں ہوا ہے جہاں دور دور تک کوئی دیوار نظر نہیں آتی ظاہر ہے کہ جب کوئی دیوار ہی نہ ہوگی تو پھر سر کس چیز سے ٹکرا کر پھوڑیں گے ورنہ اگر جنون کی وجہ سے حقیقتاً وہ جان سے عاجز تھے اور یہ سر وبالِ جان تھا تو جس وقت وہ جنون کے

عالم میں گھر سے چلے تھے تو رستہ میں ایک نہیں درجنوں مکانات تھے جس دیوار سے چاہتے سر پھوڑ کر جنون کی کشمکش سے نجات حاصل کر لیتے لیکن مرزا صاحب بکار خویش ہوشیار تھے

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

دل میں ہے = دل میں آرزو ہے۔ روکشی = مقابلہ

مرزا صاحب عشق میں گھلتے گھلتے بالکل گھالو کا تنکا ہو گئے ہیں جسم کا سارا رس نکل چکا ہے اور اتنی طاقت بھی نہیں کہ ایک کانٹے کی چبھن بھی برداشت کر سکیں مگر باوجود اس ناتوانی کے محبوب کے قطار در قطار تیروں کا مقابلہ کرنے کی ہوس دل میں موجود ہے بعض لوگ زبان کے بڑے تمرے ہوتے ہیں اور بڑے بڑے ایسی ڈینگیں لیتے ہیں کہ کیا رستم ہند گاماں پہلوان ایسی بات سوچتے ہوں گے ہمارے دوستوں میں ایک صاحب جو نہایت ادر زادقسم کے بزدل واقع ہوئے تھے ایک دن مکان میں تنہا سو رہے تھے۔ جاڑوں کا زمانہ تھا۔ اتفاق سے سوائے عورتوں کے گھر میں کوئی دوسرا مرد موجود نہ تھا۔ رات میں کہیں چوروں نے سیندھ لگائی اور گھر میں داخل ہو گئے۔ چوروں کو دیکھ کر اُن کی دادی جو باوجود ضعیفی کے نہایت جری تھیں چوروں کو پکڑنے دوڑیں۔ جناب نے لحاف کے چاروں کونوں کو مضبوطی سے اپنے نیچے دبا کر چلانا شروع کیا " دادی جان سبھوں کو پکڑ لائیے میں ابھی نلی لگا کر خون چوسوں دوں" یہی حال اس شعر میں کچھ مرزا صاحب کا معلوم ہوتا ہے کہ پیری میں فلک سے میدان بدر رہے ہیں حالانکہ طاقت کا یہ عالم ہے کہ تیر تو تیر اگر تیر کی ہوا بھی لگ جائے تو شاید کئی دن تک بیہوشی کا عالم طاری رہے۔

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

خلوت : تنہائی ۔ جلوت : سب کے سامنے ہونا ۔

مرزا صاحب کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ تھا ۔ محبوب کے عشق و محبت میں جب ضربیں مارتے دکھائی دیتے تھے تو اچھے بھلے دیوانہ معلوم ہوتے مگر جب اس کام سے فارغ ہوتے اور بیوی بچوں میں یا اپنے دوست احباب کی صحبت میں نظر آتے یا اپنی پنشن کے کاغذات لے کر کچہری میں دکھائی دیتے تھے تو اچھے بھلے ہمارے آپ جیسے چاق و چوبند نظر آتے ۔ مرزا صاحب کی یہ حالت دیکھ کر ان کے دوست کہتے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ مرزا صاحب کو دیوانہ کہا جائے یا ہشیار کیونکہ کہیں تو یہ اچھے بھلے عام انسانوں جیسے دکھائی دیتے ہیں اور کہیں مجنوں اور دیوانہ کی شکل بنا کر محبوب کو ڈھب میں لانے کی کوشش کرتے ہیں ۔

غزل نمبر ۲

نہیں ہے زخم کوئی بخیہ کے درخور میرے تن میں ہوا ہے تار اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں

بخیہ کے درخور : رفو کے لائق ، ٹانکے دینے کے قابل

خدا جانے مرزا صاحب کو ان کے محبوب نے کس زہریلے آلے سے زخمی کیا تھا کہ ان کے زخم بھرنے نہیں آتے تھے اور ہر وقت رستے رہتے تھے کوئی مرہم ان پر کارگر نہیں ہوتا تھا ۔ چنانچہ مرزا صاحب نے دوا علاج سے قطعاً انکار کر دیا تھا مگر محلے والے ان کو لے کر ٹانکے لگوانے کسی رفو گر کے پاس پہنچے ۔ رفوگر نے ان کے زخم دیکھتے ہی کہا کہ جناب سارا جسم تو چھلنی چھلنی ہے زخموں کی حالت یہ ہے کہ ہم آپ تو بہر حال ان کی اس تکلیف کو

دیکھ کر رو رہی ہیں، سوئی کا یہ عالم ہے کہ وہ اُن زخموں کو دیکھ کر مایوسی کے آنسو بہا رہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم سوئی کے آنسوؤں کی لڑی سوئی کے ناکے میں پرو کر ان کا زخم سی لیتے اور سلائی کے دام وصول کر لیتے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا صاحب کو اُسی حالت میں گھر واپس آنا پڑا اور یہ ساری زندگی مجروح بنے رہے نگاہ ناز کے۔

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی کفِ سیلاب باقی ہے برنگ پنبہ روزن میں

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ مرزا صاحب کی آنکھوں میں اشکوں کے تازہ دم طوفان ہر وقت تیار رہتے تھے اور وہ اس کے منتظر رہتے کہ مرزا صاحب حکم دیں کہ "ہاں بٹیا" اور یہ گھروں کو ویران کرنا شروع کر دیں۔ ایک دن جب مرزا صاحب کی طبیعت ذرا مزے پر آئی تو اُنھوں نے آنکھوں سے ایک دم سیلاب کا دھارا چھوڑ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس سیلاب گریانے گھر کو تو ویران کر دیا مگر دیواریں بچ گئے سریس کی بنی ہوئی تھیں یا کوئی خاص قسم کے شاہی زمانے کے مرکبات کی بنی تھیں کہ اپنی جگہ ٹس سے مس نہیں ہوئیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت مرزا صاحب نے اپنا گر یا چھوڑا اُس وقت تک گھر میں جھاڑو نہیں دی گئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کا آنسوؤں کا دھارا یعنی کف سیلاب تیزی سے چلا تو گھر کا سارا کوڑا کرکٹ دیواروں میں جو سوراخ یا جھروکے تھے اُن میں بھر گیا اور بجائے اُن سوراخوں سے پانی نکل جانے کے، ہوا کی آمد و رفت بھی بند ہو گئی جس کی وجہ سے سیلاب ختم ہونے کے بعد مرزا صاحب جو کبھی کبھار اِن جھروکوں اور دیواروں کے روزن سے باہر کے مناظر دیکھ لیا کرتے تھے اُن سے بھی محروم ہو گئے۔

ودیعت خانۂ بے دادِ کاوش ہائے مژگاں ہوں نگینہ نام شاید ہے میرے ہر قطرہ خوں تن میں

مرزا صاحب کا عشق و محبت میں سارا جسم اس طرح گدا ہوا تھا جس طرح اکثر لوگ اپنے ہاتھوں پر اپنا نام گدوا لیتے ہیں۔ عام گدوانے والے دس پانچ آنے کسی گودنے والے کو دے کر خود اپنا نام جسم پر گدوا لیے ہیں تاکہ پہچان رہے اور وہ بدلنے نہ پائیں مگر مرزا صاحب کی انفرادیت ملاحظہ ہو کہ آپ کے جسم کے ہر قطرۂ خون میں ان کے محبوب کے مژگاں نے اپنا نام گود رکھا تھا جس طرح بعض لوگ یاقوت اور لعل کے دانے پر نام کھدا تے ہیں اُسی طرح مرزا صاحب نے جن کو یاقوت اور لعل تو میسر نہ تھے اپنے خون کے قطروں پر محبوب کا نام کھدوا کر اپنی ریاست کا سکہ دنیا والوں کے دلوں پر جمانے کی کوشش کی۔ چنانچہ آپ اس بات پر خوش ہیں کہ یہ قطرہ ہائے خوں جو ایک نگینہ کی حیثیت رکھتے ہیں ان کا محبوب ان کے جسم میں بطور امانت رکھ گیا ہے اور یہ خود مژگان یار کی بیداد کاوش کا ودیعت خانہ بنے ہوئے ہیں۔

نکوہش معنی بے ربطیٔ شورِ جنوں آئی ہوا ہے خندہ احباب بخیہ جیب و دامن میں

نکوہش = ملامت ۔ مانع آنا ۔ روکنا ۔ شورِ جنوں = جنون کا ولولہ۔
خندہ = ہنسی میں سفید سفید دانت، رفو کے ٹانکوں کی طرح نظر آتے ہیں اس خندہ کو بخیہ سے تشبیہ دی ہے۔ جب شروع شروع مرزا صاحب عشق میں مبتلا ہوئے تو ان کے دوست احباب نے ان پر لعن طعن شروع کی۔ مرزا صاحب چونکہ نہایت ضدی مزاج واقع ہوئے تھے اس لیے بجائے ان کی لعن طعن کا اچھا اثر قبول کرنے کے اور زیادہ مجنوں ہو گئے۔ پہلے اگر دو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سڑکوں پر دوڑتے تھے تو اب چار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے لگے۔ دوستوں نے جب تک ان پر آوازے توازے نہیں کسے تھے اور ان کو دیکھ کر مضحک انداز میں قہقہے

نہیں لگائے تھے۔ اس وقت تک جیب و گریبان ایک دوسرے سے متصل تھے اور اُن کا دامن بھی بعافیت تمام اپنی جگہ پر قائم تھا۔ لیکن دوستوں کی اِس ملامت آمیز ہنسی کا اثر یہ ہوا کہ غصہ میں آ کر اُنھوں نے جیب و دامن کا سلسلہ ملا دیا۔ اِس طرح جیب و دامن میں جو بے ربطی تھی وہ باقی نہ رہی۔ خلاصہ یہ کہ ان کے دوست احباب نے ان کے جسم کے کپڑے بھی ثابت و سالم نہیں رہنے دیئے اور انھوں نے اس طرح کپڑوں کو چیتھی چیتھی کر دیا کہ جیب و دامن میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا اور دونوں...... ایک نظر آنے لگے اور آخر میں لوگوں کو کھینچ تان کر دونوں کو ایک دوسرے سے ملانا پڑا۔

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

نہ جانوں : میں اس سے واقف نہیں یا میں تمیز نہیں کر سکتا۔

جنونِ عشق میں مرزا صاحب کو اتنا ہوش باقی نہ رہا تھا کہ وہ اچھے بُرے میں تمیز کر سکیں مگر اس کا احساس انہیں ضرور تھا کہ ماحول مخالف ہے اور یہ واقعہ ہے کہ جو کام ان کی سات پشتوں میں کسی نے نہیں کیا تھا وہ اُنھیں کرنا پڑا یعنی محبوبہ سے عشق کر کے انھوں نے اپنے اوپر جنون کو مسلط کر لیا تھا۔ چنانچہ اب ان کا عالم یہ تھا کہ جس نے جو کہا خواہ وہ ان کے لیے مفید ہی کیوں نہ ہو انھوں نے اُس کی مخالفت اپنا پیدائشی فریضہ سمجھا یعنی اگر لوگوں نے کہا کہ آپ جو کام دکھا رہے ہیں وہ اچھا ہے تو آپ نے اُس کا الٹا مطلب یہ لیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ ماحول خراب ہے تب ہی یہ لوگ اُسے اچھا کہہ رہے ہیں اور اگر کسی نے کہا کہ حضت یہ آپ کیا حرکت فرما رہے ہیں تو اُس کا مفہوم یہ سمجھتے تھے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ اچھا کر رہا ہوں اور محض میری مخالفت میں لوگ اُسے خراب بتا رہے ہیں۔

غزل نمبر ۳۱

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں   سوائے خون جگر سو جگر میں خاک نہیں

مرزا صاحب جب محبت میں گھلتے گھلتے بیحد نحیف ہو گئے تو دنیا کی ہر چیز ان کو ہیچ نظر آنے لگی حقیقت یہ ہے کہ بیماری کے عالم میں انسان کو کوئی چیز بھلی نہیں لگتی کیونکہ عشق و محبت میں عشاق کی غذا صرف خون جگر ہوتی ہے اس لیے حکیموں اور ڈاکٹروں نے مرزا صاحب کو کلیجی کا عرق تجویز کیا تو بہت خوش ہوئے مگر چونکہ مرزا صاحب پیسوں سے ٹوٹے ہوئے تھے اس لیے بازار سے روزمرہ کلیجی منگوانا بھی ایک اقتصادی مسئلہ بنا ہوا تھا لہٰذا دو ایک روز انھوں نے بازار سے کلیجی منگانے کے بعد خود اپنے ہی جگر کا خون پی پی کر زندگی بسر کرنا شروع کر دی اور گھر کے اخراجات اپنی بیماری کے سلسلے میں بڑھنے نہ دیئے لیکن جب دو ایک روز بعد جگر کا خون ختم ہو گیا تو بیچارے اس کے مزے سے بھی محروم ہو گئے۔ اس شعر میں اسی چیز کا ذکر ہے کہ صاحب عشق کی بیماری نے ہم کو دنیا میں کسی قابل نہیں رکھا اور جگر میں اتنا خون بھی باقی نہیں رہا ہے جسے پی کر زندہ رہ سکیں۔

مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے چلے   وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

مگر معنی شاید

عشق میں جب مرزا صاحب کے جسم میں سیٹھا ستلی باقی نہیں رہی اور وہ اس درجہ نحیف کمزور ہو گئے کہ ان کو بستر تک سے نیچے اترنا دوبھر ہو گیا ان حالات میں محبوب کے کوچہ تک لٹھیا پکڑ کر چلنا بھی ان کے لیے دشوار ہو گیا اور ان کے بال و پر یعنی اعضا میں اتنی توانائی بھی باقی نہ رہی کہ وہ کوچۂ محبوب میں جا کر ایک چکر لگا

لگا آتے اور اپنی محبت کا کھانا ہضم کر لیتے چنانچہ قہر درویش بر جان درویش سوچے یہ کہ یار اب بہتر صورت یہ ہے کہ جلد سے جلد مر جاؤ شاید مرنے کے بعد خاک لحد کو ہوا کوچہ محبوب تک پہنچا دے اور یہ سعادت حاصل ہو جائے ورنہ اس ضعیفی میں جب کہ اٹھنا بیٹھنا دشوار ہے کوئے محبوب تک رسائی کیسے ہو سکتی ہے۔

ہوا ہوں عشق کی غارتگری میں شرمندہ سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

شرمندہ معنی ممنون احسان

عشق میں مرزا صاحب نے گھر بھی تباہ کیا اور اپنی صحت بھی چوپٹ کر لی۔ جب تک گھر کا اثاثہ تباہ نہ ہوا تھا اس وقت تک مرزا صاحب کو اس اثاثہ کی فکر رہی تھی اور اس کے تحفظ کے لیے فکرمند رہتے تھے مگر اب یہ سوچ کر بہت خوش ہیں کہ اچھا ہوا کہ اس عشق نے کوئی چیز نہیں چھوڑی ورنہ اس کی فکر لگی رہتی کہ گھر میں جو چیز تباہی سے بچ رہی ہے وہ تباہ ہو لے تو گھر کو چھوڑ کر صحرا نوردی کی جائے۔ اب گھر میں لے دے کر اگر کوئی چیز باقی رہ گئی ہے تو وہ حسرت تعمیر ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اگر تعمیر کی آرزو بر آئے تو عشق کے احسان کا کچھ بدل ہو یعنی تیار شدہ گھر اس کے نذر کر دیا جائے تاکہ وہ اسے دوبارہ تباہ کرے مرزا صاحب باوجود اس تباہی اور بربادی کے عشق سے ا حقیقی اولاد کی طرح محبت فرماتے تھے چنانچہ وہ اس کی تمام حرکتوں کو سراہتے تھے اور اس کی ہر تباہی پر خوش ہوتے تھے اور اس کی ہر تباہی پر خوش ہوتے تھے اور اس بات کے آرزو رہتے تھے کہ کچھ اور ہو تو عشق کی خاطر لٹا دیں۔

غزل نمبر ۳۲

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دل بھر آنا معنی رونے کو جی چاہنا۔

عشق و محبت کی دنیا میں ایک عجیب بات ہے کہ معشوقہ کا دل عام طور پر پتھر جیسا سخت ہوتا ہے۔ عجب نہیں کہ فرشتوں کی فرو گذاشت سے یہ صورت پیدا ہوئی ہو اور جب دنیا کے حسین لوگوں کے ڈھالنے تیار ہوئے ہوں تو دل کم پڑ گئے ہوں اور فرشتوں نے جن کو حسینوں کی بناوٹ کا ٹھیکہ دیا گیا تھا انھوں نے یہ سوچ کر دلوں کی جگہ اینٹ پتھر بھر دیئے ہوں کہ اندر کا بھرتو مال کون دیکھے گا۔ اکثر جوتے بنانے والے کاریگر بھی ایسا ہی کرتے ہیں کہ اوپر سے چمڑا لگا کر اندر تلے میں دفتی اور کاٹ کباڑ بھر دیتے ہیں جس کے سبب جوتا اوپر سے حسین معلوم ہوتا ہے مگر اندر سے بالکل سڑا ہوا ہوتا ہے لیکن عجب نہیں جو جنسی تعصب کی بنا پر فرشتوں نے ایسا کیا ہو کہ عشاق کے دل تو گوشت پوست کے لگائے ہوں اور جنس مخالف کے یہاں کاٹ کباڑ بھر دیا ہو۔ بہر حال مرزا صاحب اُن خوش نصیبوں میں تھے جن کو ہمارا آپ جیسا حساس اور تندرست دل ودیعت ہوا تھا۔ لہٰذا فرماتے ہیں کہ صاحب ہمارا دل کوئی اینٹ پتھر نہیں ہے جو محبوبوں کی طرح بے حس ہو ہم کو تو بہر حال جب کوئی ستائے گا ہم اُس کی تکلیف محسوس کریں گے اور ہمارے دل میں عام دلوں کی طرح درد اُٹھے گا۔ انسانی فطرت ہے کہ جب درد اٹھتا ہے تو انسان رونا شروع کر دیتا ہے اگر لوگ درد کی حالت میں کسی کو رونے سے روکیں تو یہ رونے

والے پر بڑا ظلم ہوگا یا گویا ماریں اور رونے نہ دیں یعنی تکلیف ہو اور تکلیف کی حالت میں روکا جائے کہ پڑے رہو اگر ہلنا چاہا تو نکال باہر کئے جاؤ گے چنانچہ مرزا صاحب جو صدر جہ آہ و بکا کرنے والا دل لے کر آئے تھے انھوں نے بھی بات بات پر رونا شروع کر دیا اور جب لوگوں نے مرزا صاحب کو روکا کہ حضت ذرا تو قوت برداشت پیدا کیجئے تو اور ضد یا گئے اور بولے کہ اگر ہم کو ستایا گیا تو ایک نہیں ہم ہزار بار رو دیں گے جس کو جو بنانا ہو بنالے۔

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں بیٹھے ہیں رہ گذر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

مرزا صاحب آدمی نہایت ذہین تھے چنانچہ جب انھوں نے محبت فرمانا شروع کی اور کوچۂ محبوب میں ان کی آمد و رفت پر بندشیں عاید کردی گئیں تو آپ اک دم ستیہ گرہ پر اُتر آئے اور محبوب کے دروازہ والی سڑک کے سامنے پلتھی مار کر بیٹھ گئے اور تہیہ کر لیا کہ اب یہاں سے اٹھنے کا نام نہ لیں گے جب محبوب نے رقیب کو حکم دیا کہ جاؤ اور مرزا سے کوچہ خالی کرا دو اور وہ زبردستی ان کو اٹھانے لگا تو انھوں نے سخت احتجاج کیا اور ایک اچھا خاصہ مجمع اکٹھا کر لیا اور فرمانے لگے کہ صاحب یہ سرکاری زمین ہے کسی کے باپ کی ملکیت نہیں جو ہم کو یہاں سے اٹھا سکے اگر ہم ان کی دہلیز پہ بیٹھے ہوتے تو بہر حال اُنھیں جائز طور پر اٹھوانے کا حق حاصل تھا یا اگر ہم دیر و حرم کے سامنے جا کر ستیہ گرہ کرتے تو وہاں کے مجاور یا دربان یا پجاری ہم کو یہ کہکر وہاں سے ہٹا سکتے تھے کہ آپ کے بیٹھنے سے آمد و رفت میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے لہٰذا آپ فوراً یہاں سے تشریف لے جائیے مگر رقیب کی اور دشمن کی شرارت اور بدنفسی ملاحظہ ہو کہ اب جب ہم سرکاری زمین پہ بیٹھے ہیں تو وہاں سے بھی ہم کو اٹھا

رہا ہے ہم جان دیدیں گے مگر اس رہ گذر کو جیتے جی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں کیونکہ یہ زمین میونسپلٹی کی ہے اس لیے عام شہریوں کی طرح یہاں ہمیں اٹھنے بیٹھنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔

جب وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ نیم روز آپ ہی ہو نظارہ سوز پردہ میں منہ چھپائے کیوں

جمالِ دل فروز معنی محبوب یا مولوی صاحبان کے نقطۂ نظر سے ذاتِ باری تعالیٰ۔

صورتِ مہرِ نیم روز = دوپہر کے سورج کی طرح جس کو کوئی نہیں دیکھ سکتا۔

مرزا صاحب کا محبوب کچھ اتنا زیادہ حسین اور خوبصورت تھا کہ اچھا بھلا بقعۂ نور معلوم ہوتا تھا اور اس کے چہرہ سے حسن کی جو کرنیں پھوٹتی تھیں ان کو دیکھ کر دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ محترمہ برقعہ پہنتی تھیں مگر برقعہ کی نقاب سے جو ان کے حسن کا نور چھن چھن کر باہر نکلتا تھا وہ بھی اچھا بھلا گیس کا ہنڈا معلوم ہوتا تھا مرزا صاحب کو ان کا نقاب ڈالنا حد درجہ ناگوار تھا اس وجہ سے کہ ان کا نور اور حسن اس قدر دلکش اور دلنواز تھا کہ وہ اگر سات پردوں میں بھی چھپا کر رکھی جاتیں تو بھی ان کا چھپنا مشکل تھا مرزا صاحب کہتے ہیں کہ جب جناب کا چہرہ کئی کینڈل پاور کا بلب ہے تو اس پر نقاب ڈالنا اور نہ ڈالنا سب برابر ہے کیونکہ جس کی آپ پردہ پوشی فرما رہی ہیں وہ چھپ ہی نہیں سکتا نقاب کیا اُس پر اگر لحاف اور کمبل بھی ڈال دیا جاتا۔ تب بھی اُن کا حسن پھوٹ نکلتا۔

دشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوکِ ناز بے پناہ تیرا ہی عکسِ رُخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

دشنہ معنی خنجر۔ جاں ستاں معنی جان لیوا۔ ناوک معنی تیر۔ بے پناہ

معنی جس سے کوئی نہ بچ سکے۔ غمزہ معنی آنکھوں یا ابرو سے اشارہ کرنا۔
تیز نگاہی معنی ناز یا حرکاتِ معشوقانہ یعنی غمزہ یا عشوہ۔

معشوق ہر وقت ناز و غمزہ سے مسلح ہو کر باہر نکلتا تھا اور اس کا ہر غمزہ جان لیوا تھا جو بھی اس کے سامنے آتا گھائل ہو جاتا گویا اچھی بھلی ایک اسٹیم گن یا مشین گن قسم کی کوئی چیز تھی جس کے سامنے سے بچکر نکلنا محال تھا ظاہر ہے ایسا آتشگیر مادہ جس کے پاس ہو اُس کی مار سے کیا ذی روح اور کیا غیر ذی روح کوئی چیز بچ نہیں سکتی حتیٰ کہ خود محبوب صاحب کے رخساروں کا عکس بھی اُس سے گھائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ صاحب! جب وہ اتنے مار تو خاں قسم کے واقع ہوئے ہیں تو اس کی ضرورت ہے کہ ان کے رخساروں کا عکس بھی اُن کے سامنے نہ آئے ورنہ وہ بھی گھائل ہو کر رہ جائے گا۔ مرزا صاحب کے بارے میں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ رشک و حسد کے مریض تھے اور انھوں نے محبوب سے عشق کیا فرمایا تھا اُس کے جملہ حقوق اپنے نام اس طرح محفوظ کرا لئے تھے کہ اب ان کو ہر چرند و پرند اور ہر زندہ اور مردہ چیز کی طرف یہ خطرہ لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ ان کے محبوب کو اغوا نہ کر لے آپ کا کہنا ہے کہ صاحب ہم نے چونکہ ان کے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کر لئے ہیں لہذا اُن کے غمزہ و ناز سے گھائل ہونے کا حق اگر کسی کو پہنچتا ہے تو وہ صرف ہماری ذات ہے۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں ‌ ‌ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

عشق و محبت میں کچھ اس نوعیت کی ورگت بنتی ہے کہ انسان کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے اور اس درجہ تلخ ہو جاتی ہے کہ وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ "زندگی نام ہے پٹ پٹ کے جیئے جانے کا" مرزا صاحب پر اُن کے محبوب نے ایسے مظالم کئے تھے

کہ ان کو سانس لینا دشوار تھا اور ان کو رنج و غم سے ایک منٹ کے لئے سکون حاصل نہ تھا
اس لئے آخر میں آپ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ قید حیات جس کو عرف عام میں زندگی
کہتے ہیں۔ بند غم کا دوسرا نام ہے اور اس کا سلسلہ صرف اسی وقت ختم ہو سکتا ہے
جب انسان چار کندھوں پر ہٹو بچو کہتا دکھائی دیتا ہے۔ مرزا صاحب کو عشق کرنے
سے پہلے شاید اس بات کی خبر نہیں تھی کہ عاشق ہونے کے بعد انسان چکر گھنی کا نفرنس میں کھو
کر رہ جاتا ہے اور اس کی قیمت سیب لگے بنگلے سے بھی کم ہو جاتی ہے۔ اور اس پر رات
دن ایسی موسلا دھار مار پڑتی ہے کہ وہ زندگی کو اپنے لئے ایک مستقل مصیبت سمجھنے لگتا ہے۔

حسن اور اس پہ حسن ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

مرزا صاحب جن محترمہ پر عاشق ہوئے تھے ان کی صورت بہر حال جیسی بھی ہو
ہم کو کیا مگر ایک مصیبت ان کے ساتھ یہ لگی ہوئی تھی کہ ان کو اپنے حسن کے بارے میں سخت
غلط فہمی تھی اور ہونا بھی چاہئے کیونکہ غالباً کسی مشہور عاشق کا قول ہے کہ

• گر گدھی کے کان میں کہہ دوں کہ عاشق ہوں ترا
ہے یقیں اس دن سے وہ بھی گھاس کھانا چھوڑ دے

بہر حال اس غلط فہمی کے تحت ان کو اس بات کا بھی پورا پورا یقین تھا کہ جو بھی
ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ لے گا وہ ان پر لٹو ہو جائے گا اور دن رات ان کے
نام کی ضربیں مارا کرے گا۔ اس حسن ظن کی وجہ سے غیر یعنی رقیب کو اصل منہ سود کے
فائدہ پہنچ گیا اور اس کی عزت رہ گئی وہ یوں کہ اس نے عشق کا اعلان کرتے ہی محبوب کی
جوتوں کی ڈوریاں باندھ باندھ اور ان کے بیٹی کوٹ میں ازار بند ڈال کر اس کا

اس قدر اعتماد حاصل کرلیا کہ محبوب کو اس کی وفاداری پر اس درجہ بھروسہ ہو گیا کہ اُسے کبھی اُس کی آزمائش کا خیال تک نہ آیا اور وہ تھا بھی بڑا نکرم باز وہ جو بیوتوں گھنٹے ان کے آگے با ادب با ملاحظہ ہوشیار کے نعرے لگاتا دکھائی پڑتا تھا چنانچہ محبوب نے اُس کو گھر ہی کی مرغی کا بچہ سمجھ کر چھوڑ رکھا تھا۔ ورنہ اگر رقیب صاحب قبلہ محبت کے امتحان میں بٹھا دیے جاتے اور اُنھیں محبوب کے حسن و غمزہ اور چشم و ابرو کے پرچے حل کرنے کو دیدیے جاتے تو یقین مانئے کہ صفر پاتے صفر اور انھیں حد درجہ ذلیل و رسوا ہونا پڑتا۔

واں وہ غرورِ عز و نازِ یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں؟

جو شخص حسن اور دلکشی کا سرمایہ دار ہوتا ہے وہ جب راستہ میں چلتا ہے تو دائیں بائیں لوگوں کی نگاہیں اسی کی طرف اٹھتی ہیں اور ہر شخص بلا سبب اُس کو سر پہنچوا سلام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ انگریزوں کے ابتدائی دورِ حکومت میں جب کوئی ٹامی کسی گلی کوچہ سے نکل جاتا تھا تو لوگ اُس کے کتے تک کو سلام کرنا اپنی عزت سمجھتے تھے اور ہر طرف سے آوازیں آنا شروع ہو جاتی تھیں " صاحب سلام۔ حضور! کورنش۔ مجرا قبول ہو "۔ یہی حال مرزا صاحب کے محبوب کا تھا کہ اپنے حسن کے باعث وہ جدھر سے نکل جاتے تھے لوگ سلام کرتے کرتے دُہرے ہو جاتے۔ یہ دیکھ کر وہ غرور سے اور زیادہ اکڑ جاتے اور گردن سیدھی کرکے چلنا شروع کر دیتے۔ جب تک مرزا صاحب اُن سے عشق فرماتے رہے اُن میں یہ اکڑ باقی رہی اور انھوں نے ساری خلقت کو اپنی محفل میں آنے کی اجازت دی مگر مرزا صاحب کے پیچھے اُنھوں نے

آدمی لگا دیئے کہ یہ ان کی محفل میں قدم نہ رکھنے پائیں۔ دنیا کے میلاد شریف اور فاتحہ نذر ہوجاتے مگر مرزا صاحب کی خدمت میں دعوت نامہ بھیجنا ان کے لیے گناہ تھا۔ مرزا صاحب بھی چونکہ نہایت معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس لئے یہ بھی اپنی جگہ وضعدار بنے رہے اور بغیر بلائے جانا اپنے لئے کسرِ شان سمجھتے رہے اگر راستہ گلی مرزا صاحب سے اور اُن سے مُٹھ بھیڑ ہوجاتی تو مرزا صاحب شرم و حیا کے سبب ان سے مخاطب نہ ہوتے اور راستے گلی کھڑے ہو کر بات کرنا وضعداری کے خلاف سمجھتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا صاحب کی ساری زندگی اس حسرت میں گذر گئی کہ اُن سے ملاقات ہوجائے مگر کوئی صورت نہ نکلی یہاں تک کہ مرزا صاحب جان سے گذر گئے اور ملنے کی حسرت دل ہی میں لئے چلے گئے۔

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بیوفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اُسکی گلی میں جائے کیوں

چونکہ رقیب مرزا صاحب کو برابر دھوکے دیتا رہتا تھا۔ اس لئے ایک مرتبہ مرزا صاحب کے دل میں بھی خیال پیدا ہوا کہ یہ اُسے بھی کوئی لمبا چرکا دیں مگر اس میں مرزا صاحب کی نیت میں کہیں سے کھوٹ نہیں پیدا ہوئی رقیب جب کبھی ان سے ملتا تو مرزا صاحب کے خیالات معلوم کرنے کے لئے ان کا دوست بنکر اُن سے کہتا کہ "اجی مرزا صاحب! آپ نے بھی کس مصیبت میں اپنے آپ کو ڈال رکھا ہے۔ جن صاحبہ سے آپ عشق فرماتے ہیں وہ نہ نماز پڑھتی ہیں اور نہ روزہ سے انھیں سروکار ہے پھر حسن کشتی کا یہ عالم ہے کہ خود اُن کے ماں باپ اُن سے عاجز ہیں اور اس فکر میں ہیں کہ کوئی سستے داموں لڑکا مل جائے تو اُس کے سر تھوپ کر اُن سے

اپنا پیچھا چھڑا ایں۔ مرزا صاحب سمجھ گئے کہ یہ شخص دوست بنکر اُن کے منھ سے کچھ کہلوانا چاہتا ہے تاکہ اگر کوئی الٹی سیدھی بات منھ سے نکل جائے تو یہ نمک مرچ لگا کر محبوب سے اِن کی چغلی کھائے۔ اور اُنھیں اور زیادہ متنفر کر دے چنانچہ فوراً بھانپ گئے اور اگرچہ دل پر معشوق کی بیوفائی کے بہت سے چرکے کھائے ہوئے تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ وہ حد درجہ بیوفا اور محسن کش ہے مگر ان تمام باتوں کو خون کا گھونٹ سمجھ کر پی گئے اور رقیب سے ناراض ہو کر فرمانے لگے کہ ارے صاحب! اگر وہ نمازیں نہیں پڑھتیں قرآن مجید کی تلاوت نہیں کرتیں۔ روزے نہیں رکھتیں یا رمضان شریف میں سحری کھا کر گھر والوں کو چرکا دے جاتی ہیں تو ایسے لوگوں کو جن کو اپنا دل اور ایمان پیارا ہے اُن سے ملنا جلنا ترک کر دینا چاہئے مگر ہمارا معاملہ تو ایسا ہے کہ جس کے پیچھے لگ لیے، لگ لیے۔ اور ہم نے تو اُسی دن سے دین و ایمان دونوں کی طرف سے پیٹھ موڑ لی تھی جس دن سے اُن سے محبت شروع کی تھی اب اگر آپ کو ان کی یہ باتیں ناگوار ہیں تو آپ کل ہی سے ان کے کوچے میں جانا بند کر دیں۔ بندہ تو جان و ایمان کے بدلے معاوضہ لئے بغیر ٹلنے سے رہا۔

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں؟

مرزا صاحب نے انتقال ہونے کے بعد جب یہ دیکھا کہ شہر میں نہ تو دکانیں بند ہوئیں اور نہ اسکولوں اور کالجوں میں چھٹیاں ہوئیں تو یہ دیکھ کر وہ حد درجہ مغموم ہوئے۔ اسی درمیان میں مرزا صاحب کے پاس ایک صاحب پہنچے اور انھوں نے عرض کی کہ واللہ مرزا صاحب آپ کے مرنے کا ہمارے شہر کو حد درجہ

غم ہے اور لوگ بے حد سوگوار اور غمگین نظر آ رہے ہیں اس پر مرزا صاحب مارے غصہ
کے آپے سے باہر ہو گئے اور فرمانے لگے ارے صاحب! آپ کہاں کی اڑا رہے
ہیں ہم خستہ حالوں اور بدنصیبوں کے مرنے کا کس کو غم ہے چاہے جامع مسجد پر جاکر
دیکھئے تمام ہوٹل اور دوکانیں اسی طرح کھلی ہوئی ہیں یا نہیں۔ کہیں نہاری کھائی
جارہی ہے کہیں کباب اڑ رہے ہیں اردو بازار تک کھلا ہوا ہے چنانچہ سمیع اللہ صاحب
ہی کے یہاں دیکھ آیئے شعراء کا مجمع ہے اور شعروشاعری ہو رہی ہے اور وہ واہ واہ اور
سبحان اللہ مچی ہوئی ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں پڑتی اس کے علاوہ اسی طرح
جس طرح روز مرغیاں کٹتی تھیں، آج بھی کٹ رہی ہیں۔ بالائی کے برف بیچنے والے اسی
طرح سونڈھے دھرے بالائی کے قلفوں پر تھلے کھول کھول کر لوگوں کو دے رہے ہیں
اور اپنا اپنا دل ٹھنڈا کر رہے ہیں۔ آپ بھی کہاں رونے دھونے کے چکر میں پڑے ہیں
اور ماتم پرسی کرنے تشریف لائے ہیں۔ آپ بھی جائیے اور مزے اڑائیے صاحب! دنیا
میں کس کے مرنے پر کوئی غم کرتا ہے۔

غزل نمبر ۳۳

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں — بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

غنچۂ ناشگفتہ: کلی - مراد دہن معشوق - پوچھنا - سوال کرنا استفسار کرنا۔
مرزا صاحب کا محبوب مرزا صاحب سے چھڑکا چھٹکا رہتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ مرزا صاحب
نہایت حملہ آور قسم کے انسان تھے۔ چنانچہ ایک دن مرزا صاحب نے جب دیکھا کہ وہ ان کے
قریب آتے گھبرا رہا ہے تو آپ نے دور ہی سے ایک بوسہ کی فرمائش کی۔ اس نے منہ ٹیڑھا

کر کے پوچھا کہ حضور کیا طلب فرماتے ہیں؟ اور جب اُسے معلوم ہوا کہ بوسہ کا مطالبہ کرتے ہیں تو اُس نے اپنے بازو کا بوسہ لے کر کہا کہ کیا اس طرح کا بوسہ آپ چاہتے ہیں اُس پر آپ نے کہا کہ میں امریکی یا انگریزی وضع کا بوسہ چاہتا ہوں چونکہ یہ چیز دور سے نہیں بتائی جاتی اس لئے اگر آپ ذرا قریب تشریف لے آئیں تو میں خود عملی طور پر بتلاؤں کہ سچ مچ کا بوسہ کسے کہتے ہیں اور بوسے کے آداب کیا ہیں یہ ذرا آپ دور ہی سے بوسہ لینے کا طریقہ بتا رہی ہیں یہ طریقہ بوسہ بازوں میں مستعمل نہیں ہے ممکن ہے کہ کسی زمانے میں رہا ہو مگر اب یہ طریقہ متروک ہو چکا ہے دوسرا مفہوم اس شعر کا یہ بھی ہو سکتا ہے اگر پوچھنے کے معنی استفسار کے لئے جائیں یعنی یہ کہ مرزا صاحب دریافت کر رہے ہیں کہ حضور! بوسہ دینے کے جو آداب مقرر ہیں وہ تابعدار بتا سکتا ہے مگر قریب آنے پر۔ اس کے جواب میں محبوب بغیر منہ کھولے منہ کو ٹیڑھا کر کے اور چھاتی میں بوسہ لے کر بتاتا ہے کہ بوسہ تو یوں دیا جاتا ہے گویا وہ ادا میں بوسہ دینے اور دلانے کے کرتب دکھا رہا ہے اس پر مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت میرے پوچھنے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ دور ہی دور سے بوسہ دینے کا ریہرسل فرمائیں۔ ذرا قریب تشریف لاکر اور بوسہ بازی کا اصلی فلم لگا کر بتائیے کہ اس طرح بوسہ دیا جاتا ہے۔

پرسشِ طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے
اُس کے ہر ایک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

پرسش = پوچھنا۔ طرزِ دلبری = دل لینے کا طریقہ۔ ادا = بیان

مرزا صاحب نے اپنی شاعری میں جس محبوب کا نقشہ پیش کیا ہے وہ حد درجہ گرگٹ قسم کا انسان معلوم ہوتا ہے اور اُس نے دل چرانے اور دل چھیننے کی تربیت کسی مستند

ٹریننگ اسکول سے حاصل کی ہے چنانچہ زبان سے کچھ کہے بغیر اشاروں اشاروں میں وہ دل غائب کر دیتا ہے۔ کبھی داہنی آنکھ دبا کر دل پر حملے کرتا ہے اور کبھی بائیں آنکھ اس طرح پھڑکاتا ہے کہ خود بخود دل شکار ہو جاتا ہے۔ عشاق میں محبوب کیا آتا ہے گویا بندروں میں بھیڑیا آتا ہے اور اپنی ہر ہر ادا اور ہر ہر غمزے سے دلوں پر دائیں بائیں حملے کرتا ہے۔

رات کے وقت مئے پیئے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں

اس شعر میں صنعت لف و نشر مرتب ہے پہلے مصرع میں معشوق کی دو حالتوں کا ذکر ہے پہلی حالت تو یہ دکھائی ہے کہ وہ رات کو کسی تاڑی خانے سے بدمست جھومتا جھامتا پٹیوں میں تیل ڈالے اور غازہ اور لپ اسٹک لگائے دیکھنے والوں کو پامال رسم سپاس کرتا چلا آرہا ہے اور اس کے آگے آگے رقیب باادب با ملاحظہ ہوشیار کے نعرے بلند کر رہا ہے۔ دوسرے مصرع میں مرزا صاحب اس بات کی آرزو کرتے ہیں کہ وہ اگر آئے تو شراب پیئے ہو مگر رقیب صاحب اُس کے ساتھ نہ ہوں چونکہ رقیب سے مرزا صاحب بے حد خائف ہیں اسی لئے جگہ جگہ جہاں اُنھوں نے رقیب کا ذکر کیا ہے اُس سے بہت زیادہ دھونس کھائے معلوم ہوتے ہیں نہ جانے ان کا رقیب کس قسم کا انسان ہے کہ مرزا صاحب اُس کا نام سنتے ہی کانپنے لگتے ہیں کیا عجب ہے جو وہ کوئی پولیس کا آدمی ہو۔ اس شعر کے دوسرے مصرع میں جب مرزا صاحب کو یہ خیال آتا ہے کہ رقیب بھی ساتھ ہوگا تو مرزا صاحب اپنے الفاظ واپس لیتے ہیں اور دوبارہ دعا کرتے ہیں کہ اے پاک بے نیاز پہلی دعا میں واپس لیتا ہوں وہ غلطی

ہے میرے منہ سے نکل گئی تھی اب تازہ ترین درخواست یہ ہے کہ اگر وہ نہ آئے تو اچھا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر رقیب اس کے ہمراہ ہوا تو اس کے آنے کا سارا مزا کرکرا ہو جائے گا اور اس کی موجودگی میں میں اپنا حرف مدعا زبان پر نہ لا سکوں گا حالانکہ مرزا صاحب کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ خدا کرے رات میں وہ اپنے پاس سے شراب پی کر اُن کے گھر آ کر پکارے کہ مرزا صاحب "میں حاضر ہوں" اور یہ فوراً دروازے کھول کر کہیں کہ آپ نے تشریف لائیے چشم ما روشن دل ما شاد۔ میں تو آپ کا گھنٹوں سے انتظار ہی کر رہا تھا مگر مرزا صاحب اوپری دل سے یہ کہہ رہے ہیں مگر دل ہی دل میں یہ دعا بھی مانگتے جاتے ہیں کہ خدا کرے کہ وہ رقیب کو اپنے گھر پہرہ دینے کے بہانے چھوڑ آئے اور تنہا آئے تاکہ مزے رہیں۔

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا کہ دیکھئے
سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

یہ دیکھنا: اس طرح قہر آلود نگاہوں سے دیکھنا۔

اس طرح: استفسار کرتے ہو۔

اس شعر میں مرزا صاحب نے فلم میں جو شوٹنگ ہوتی ہے اُس کا نقشہ کھینچا ہے چنانچہ محبوبہ کو شوٹنگ والے کمرے میں لاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ کہئے رات رقیب کے ساتھ تو خوب ہی خوب مزے رہے ہوں گے۔ اتنا پوچھنا تھا کہ وہ بالکل آپے سے باہر ہو گئی اور غصہ میں آ کر پٹختی مار کر سامنے آ بیٹھی اور قہر آلود نگاہوں سے مرزا صاحب کو دیکھنے لگی اس طرح دیکھنے سے اس کا منشا یہ تھا کہ اچھا اب آپ کی جرأت اتنی بڑھ گئی کہ ساری نقل و حرکت پر آپ پہرے بٹھائے ہوئے ہیں اور ہم سے اس طرح سوال کرنے کی

جرأت کرتے ہیں یاد رکھئے اگر آپ نے آئندہ سے اس قسم کی جرأت کی تو پولس کے حوالے کر دیے جائیے گا۔ اور چھٹے کا ساگ اور بجرے کی روٹیاں کھاتے کھاتے آپ کا ناطقہ بند کر دیا جائے گا۔

بزم میں اُس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھیے اُس کی تو خاموشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

مرزا صاحب کو عشق کے جرم میں اُن کا محبوب طرح طرح کی سزائیں دیتا تھا کبھی مرزا صاحب سے کہتا کہ "دم باش مثال کلہ بارے" یعنی بس چپ چاپ بیٹھے رہیے خیریت اسی میں ہے۔ اور کبھی دوسرے طریقے پر ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے۔ اس قسم کے مظالم کا اظہار کیا ہے اور فرماتے ہیں کہ خدا ہم کو تو اُس عورت نے عاجز کر رکھا ہے اور اگر کبھی ہم اس کی محفل میں پہنچ جاتے ہیں تو بالکل خاموش ہو جاتا ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سب لوگ دم ساد ھے اُسی کی طرح بیٹھے رہیں مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ دوسروں کے ساتھ ہر قسم کے الطاف و کرم کرتا ہے تو ہم سے نچلے نہیں بیٹھا جاتا اور ہم میں دم مارنے کی تاب باقی نہیں رہتی بھلا آپ ہی انصاف فرمایئے کہ ہم اُس کی بزم میں اُس سے بات کرنے کے لئے گئے ہیں اور ہم ہی کو حکم ہوتا ہے کہ آپ چپ ساد ھے بیٹھے رہیے۔

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی سُن کے ستم ظریف نے مجھکو اٹھا دیا کہ یوں

مرزا صاحب تو رقیب سے حد درجہ جلے ہوئے تھے ہی جب یہ اُس کی بزم میں تشریف لے گئے تو اُنھوں نے دیکھا کہ جناب رقیب صاحب قبلہ بھی تشریف فرما ہیں اور محبوب کے بغل میں بندر کا بچہ بنے بیٹھے ہیں اس پر مرزا صاحب سے نہیں رہا گیا۔ اور انھوں نے اُس سے درخواست کی کہ حضور اور لوگوں کی موجودگی پر تو خیر مجھے کوئی اعتراض نہیں البتہ اعتراض ہے تو یہ کہ کیسے کیسے لوفروں کو آپ نے اپنی محفل میں بیٹھنے کی اجازت

دے رکھی ہے مثلاً رقیب صاحب جو نہایت پرانے ہسٹری شیٹر ہیں اور پولیس
میں ان کی رات کو پکار ہوتی ہے ایسے لوگوں کو تو کم از کم آپ کی اس سنجیدہ اور مہذب محفل
میں جگہ نہ ملنا چاہیئے تھی یہ سُنکر اُن کا محبوب ہنسا اور اُس نے ہنسکر اُن کا ہاتھ پکڑ کر کہا
کہ ذرا کھڑے تو ہو جایئے اور جب مرزا صاحب کھڑے ہو گئے تو دھکا دے کر بولا
کہ کیا آپ کا مقصد یہ ہے کہ اُسے اس طرح ذلیل کر کے بزم سے نکال باہر کیا جائے۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سُنا کہ یوں

ریختہ = اردو شاعری ۔ گفتۂ غالب = کلام غالب

مرزا صاحب کو اپنے اشعار پر بے حد ناز تھا اور اُن کا خیال تھا کہ اُردو میں
اُن کے جیسے اشعار بڑے بڑے فارسی شعراء بھی نہیں کہہ سکتے مگر اُس زمانے میں
عام رواج یہ تھا کہ لوگ زیادہ تر شعر فارسی میں کہتے تھے اور اردو میں شعر کہنا
کسرِ شان سمجھتے ہیں چنانچہ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اگر کسی صاحب کو اردو میں شعر سننا
گراں گزرتا ہو تو اُن سے کہئے کہ آپ کی تین پشتوں میں بھی کوئی اردو سمجھنے والا پیدا ہوا
تھا جو آپ اُردو کو اتنا حقیر اور ذلیل سمجھے ہوئے ہیں اس کے بعد اگر وہ اپنی ضد پر قائم
ہیں تو مرزا صاحب کے دو چار شعر اُردو کے اُسے پڑھ کر سنا دیجئے گا تو سہی جو وہ جھک
نہ جائیں اور کہیں کہ حضرت ! معاف کیجئے گا۔ واللہ مرزا صاحب کے اشعار سننے کے
بعد حافظ شیرازی اور امیر خسرو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آلا اودل سے آگے کچھ
نہیں جانتے تھے۔

ردیف "و"

غزل نمبر ۱

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

چشمِ تنگ = حاسد کی آنکھ ۔ شعراء حاسد کی آنکھ کو تنگ باندھا کرتے ہیں ۔ کثرتِ نظارہ = مشاہدات یا تجربہ کی زیادتی ۔ وا ہونا = کھلنا یہاں مُراد حاسد کی تنگ آنکھ کا کشادہ ہونا یعنی حسد کا باقی نہ رہنا ۔

وہ لوگ جو زندگی بھر کنوئیں کا مینڈک بنے رہتے ہیں اور دنیا و مافیہا سے بے خبر رہتے ہیں وہ اگر اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو اچھی حالت میں یا ترقی کرتے دیکھ لیتے ہیں تو حسد کی آگ میں جلا کرتے ہیں لیکن اگر اُن کا دائرۂ تعارف وسیع ہوتا ہے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کنوئیں کا مینڈک بنے رہنے سے انسان ترقی نہیں کرتا جب تک کہ وہ محنت اور تدبیر سے کام نہ لے اور یہ چیز اُس میں انصاف اور کشادہ دلی کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور وہ خود بھی کوشش کی طرف مائل ہوتا ہے اور یہی شخص جو کنوئیں کا مینڈک بنا دوسروں کی ترقی پر دانت پیسا کرتا تھا خود اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ وہ بھی ایسے طریقے اختیار کرے جس سے وہ بھی بامِ ترقی پر پہنچ جائے صرف مرزا صاحب کو اتنا کہنا تھا جس کے لئے مرزا صاحب کی تخیل کو جگہ جگہ سے الفاظ اور محاورات تلاش کرنا پڑے چنانچہ وہ پہلے چشمِ تنگ

فراہم کرتے ہیں اُس کے بعد اُس میں دو مٹھی کثرتِ نظارہ ڈالتے ہیں پھر حاسد کی تلاش میں گھومتے ہیں اور افسردہ گرمِ تماشا کے الفاظ کو جوش دے کر اور گھا پھرا کر اپنے مافی الضمیر کا اظہار اس طرح شعر میں کرتے ہیں کہ پکا پکایا شعر آپ کے ادبی دسترخوان پر گرم گرم بھاپ ہیں مارتا دکھائی دینے لگتا ہے۔

بقدرِ حسرتِ دل چاہئے ذوقِ معاصی بھی
بھروں اک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

ذوق: لذت۔ مزا۔ معاصی: جمع معاصیت بمعنی گناہ۔ ہفت: دریا۔ ہفت دریا معنے: گناہ کو تر دامنی بھی کہتے ہیں۔ ذوق معاصی اُسی وقت حاصل ہوگا جب کہ معاصی کا ارتکاب ہو۔

مرزا صاحب نے یہ شعر کسی بہت بڑے جرائم پیشہ سے متاثر ہو کر کہا ہے جو صرف دس پانچ جرائم کر پایا تھا کہ پولیس نے اُسے دھر لیا ہے۔ مثلاً معمولی طریقے پر کسی کی بہو بیٹی کو اغوا کر لیا یا جیب سے کسی کا پرس گھما دیا۔ یہ تو گویا مشتے از خروارے گناہ تھے ورنہ جو گناہ اُس کے سرزد نہیں ہوئے تھے اور جن جرائم کا وہ مرتکب نہیں ہو پایا تھا اُس کے سامنے ہفت دریا کے معاصی ہیچ تھے اور اگر مرزا صاحب کے قول کے مطابق اُسے سارے جرائم کے ارتکاب کی اجازت دیدی جاتی تو ہفت دریا کے معاصی سے بھی کامل تر دامن نہیں ہوتی بلکہ اُس دامن کا ایک گوشہ تر ہو جاتا مگر چونکہ تمام گناہ وہ اس تھوڑی سی عمر میں کرنے پر قدرت نہیں رکھتا تھا اس لئے اُس کو جس قدر گناہوں کی لذت حاصل ہونا چاہئے

اتنی حاصل نہیں ہوئی۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ گناہوں کے صد بادریا آمیں
کی تر دامنی کی وجہ سے خشک ہو جاتے تاکہ اُسے دل بھر کر حسرت نکالنے
کا موقع ملتا اور عمل محسود کے آسے مزہ حاصل ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ مرزا صاحب ایسے ماحول میں پیدا ہوئے تھے جہاں اُن کی تمام نقل و حرکت
پر شروع ہی سے پہرے بیٹھے ہوئے تھے اور ان بندشوں کی وجہ سے اُن
کے دل میں گناہ کرنے کی جو حسرتیں تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں چنانچہ وہ صرف
مٹھی بھر گناہ کر پائے مثلاً شادی ہونے کے باوجود ڈومنی سے معاشقہ فرمالیا
شراب پینے کی عادت ڈال لی قرض لینا اور نہ دینا سیکھ لیا اگر اُن پہ اتنی بندشیں
نہ ہوتیں تو شاید وہ کھل کھیلتے اور دل بھر کر گناہ کر کے بھرپور لذت حاصل کرتے۔

اگر وہ سروِ قد گرمِ خرامِ ناز آجائے کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

سروِ قد بہ معشوق کے کفِ پا کے نشان پڑے ہوں؛ شکلِ قمری بہ شکلِ قمری
نالہ فرسا ہو = نالہ کرنے لگے۔ قمری بہ لحاظِ رنگ و مقدار ایک مشتِ خاک ہے
اور شعرا اس کو سرو کا عاشق مانتے ہیں۔

مرزا صاحب نے جو بے حد گھما پھرا کے بات کہنے کے عادی ہیں صرف اتنا
کہنا چاہتے ہیں کہ اگر اُن کا محبوب جس کا قد سرو جیسا ہے باغ میں سیر کرنے کو نکل
آئے تو جہاں جہاں اُس کا قدم پڑے نقشِ قدم کی مٹی قمری کی طرح نالہ کرنا
شروع کر دے۔ گویا خاک کا ذرہ ذرہ اُن کے محبوب کی محبت میں تڑپ اٹھتا ہے
مرزا صاحب کی انھیں حرکتوں سے اُن کا محبوب اُن سے سخت ناراض رہتا تھا
اور ان سے نفرت کرتا تھا۔ کیونکہ جب یہ اُس کی تعریف کرتے تو اُس کو ایسی

غلط فہمی میں مبتلا کر دیتے کہ اس کی نظر میں کوئی چیز اس کے مقابلے کی نظر نہ آتی اب اس شعر ہی میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کہاں خاک کے ذرّے اور کہاں ان کا محبوب جس کی محبت میں وہ دن رات نالوں اور فریادوں کا آتش گیر مادہ خارج کرتے رہتے ہیں۔

غزل نمبر ۲

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں　　بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

کنشت = بت خانہ ۔ مندر ۔ اہلِ کنشت = بت کدے کے رہنے والے

یہ شعر غالباً ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم سے متاثر ہو کر مرزا صاحب نے کہا ہے اور اس میں ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو حالات سے مجبور ہو کر ہندوستان سے پاکستان بحیثیت مہاجر چلے گئے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ بت خانہ کو چھوڑ کر یعنی ہندوستان کو چھوڑ کر میں کعبہ یعنی پاکستان جا رہا ہوں مگر میرے پاکستان جانے کا مقصد ہندوستان والے یہ نہ سمجھیں کہ میں اپنے وطن سے بے وفائی کر رہا ہوں اور مجھ پہ بے وفا ہونے کا طعنہ نہ دیں حقیقتاً روزگار سے تنگ آ کر میں ایسا کر رہا ہوں کیونکہ میاں روزی ملنے کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا اس لئے میں محض تلاشِ روزگار میں پاکستان جانے پر مجبور ہوا ہوں اور یقین مانئے کہ میرے دل میں ہندوستان کی یعنی بت خانہ کی وقعت اور عزت پاکستان جانے کے بعد بھی ویسی ہی باقی رہے گی جیسی کہ اس وقت ہے ورنہ انصاف فرمائیے کہ بھلا میں وطن کو پردیس میں رہ کر کسی طرح بھی بھول سکتا ہوں۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ　　دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

طاعت۔ عبادت بندگی :۔ انگبین ۔ شہد یہ لاگ ۔ محبت یا خواہش :۔

مرزا صاحب نے یہ شعر اُن لوگوں پر کہا ہے جو جبہ و دستار اور جھول ڈال کر ہاتھ میں امرودوں کے برابر دانوں کی تسبیح لئے ہوئے اپنی عبادت اور ریاضت کا سکہ دوسرے پر جاتے ہیں اور بظاہر بہت بڑے عابد اور زاہد بنتے ہیں اور لوگوں کو تمام مکروہاتِ زمانہ سے روکتے پھرتے ہیں ہمارے دوستوں میں ایک صاحب تھے جن کے اچھی خاصی گلہ پوش داڑھی تھی پیشانی کے بیچوں بیچ ایک سیاہ گٹھا پڑا تھا نہایت پابندی سے نماز پڑھتے تھے مگر جوا بھی کھیلتے تھے اور بغیر بیا مئو شراب بھی پی لیتے تھے، پیری مریدی بھی کرتے اور ذرا طوائفوں کے کوٹھوں پر بھی چلے جاتے تھے۔ ایک دن عصر کی نماز پڑھ کر جب کھیل شروع ہوا تو دو ایک صاحبان جو شرابی واقع ہوئے تھے انھوں نے کہا کہ حضرت کھیل بعد میں ہوگا پہلے تھوڑا سا پینے پلانے کا شغل ہو جائے اس کے بعد بازی شروع کی جائے چنانچہ ایک صاحب نے شراب کی بوتل نکال کر کہا کہ آپ بھی مولانا ایک جرعہ میں کیا مضائقہ ہے مولانا نے وسطِ حلق سے فرمایا معاذ اللہ و نعوذ باللہ مجھ سے اور اس معصیت کی توقع۔ مگر جب دوست احباب مصر ہوگئے کہ نہیں مولانا یہ کفرانِ نعمت جو آپ فرما رہے ہیں کچھ اچھا نہیں لگتا تو مولانا مسکرائے اور بولے اچھا پہلے یہ بتائیے کہ آپ پیتے کونسی شراب ہیں اگر شراب اتنی ہی زیادہ پسند ہے تو پھر اچھے قسم کی شراب پیا کیجئے اور۔ یہ کہہ کر مولانا نے جیب سے اپنی نئی خوشبو بوتل نکال کر پیش کی اور کہا کہ لیجئے پھر اس سے شغل فرمائیے۔ ایسے ہی ریاکار عبادت اور ریاضت

کو بھی محض مذاق سمجھتے ہیں مثلاً نماز پڑھنے کھڑے ہوئے اور سلام پھیرا ادھر سے
اگر کوئی حسین لڑکی گذرتی دکھائی دی تو بآواز بلند السلام علیکم یا رحمۃ اللہ
و برکاتہ کہہ کر اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر جما دیں یا نماز ختم ہونے کے بعد
دعا فرمائی کہ اے پاک بے نیاز مرنے کے بعد جنت الفردوس میں وہ مقام
عطا کیجیو جہاں حوروں کے جمگھٹے ہوں اگر ریس کے شوقین ہیں تو نہایت
عاجزی کے ساتھ دعا فرمائیں گے کہ اے رب العزت تیرے بھروسہ پر نو نمبر کے
گھوڑے پر ایک پر چار کا داؤں لگا کر آیا ہوں اب ہار جیت تیرے ہاتھ
ہے مجھے مایوس نہ کرنا غرض عبادت میں اگر لالچ اور حرص کا شائبہ بھی ہو
تو ایسی عبادت کس کام کی ایسی غرض اور لالچ والی عبادت کو تو آگ میں
جھونکنا ہی مناسب ہے کیونکہ عبادت میں انسان کو اپنی نیت صاف
رکھنا چاہئے جو لوگ بہشت کے تعیش یعنی شراب۔ شہد اور حور و غلماں کی
غرض سے عبادت کرتے ہیں اُن کو چاہئے کہ ایسی بہشت کو دوزخ میں ڈالدیں
تاکہ عبادت خالصتہً اللہ ہو جائے۔

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسم ثواب سے ٹیڑھا لگا تھا خط قلم سرنوشت کو

سرنوشت = قسمت کا لکھا ۔ رہ و رسم ثواب = نیک کام نیکی کا راستہ
منحرف ہونا = برگشتہ ہونا ۔ منہ موڑنا ۔

مرزا صاحب زندگی بھر نماز روزے سے بھاگے اور جب کبھی ان کے
دوستوں نے کہا کہ مرزا صاحب واللہ یہ باتیں آپ کو اس بڑھاپے میں
زیب نہیں دیتیں۔ ایک دن آپ کو بھی بہر حال خدا کے سامنے اپنے اعمال

کا جواب دہ ہونا پڑے گا۔ اس پر مرزا صاحب نے فرمایا کہ حضور اس میں میرا کیا قصور ہے اس کی ذمہ داری تمام تر کاتب تقدیر پر عائد ہوتی ہے جس نے نہ جانے کس سڑے قلم سے میری تقدیر لکھ دی اور اس کا بھی خیال نہ کیا کہ جس قلم سے تقدیر لکھی جا رہی ہے اس کا خط سیدھا ہے یا ٹیڑھا اسی لئے میں صحیح راستہ پر چلنے سے قاصر ہوں گویا ساری کی ساری غلطی کاتب تقدیر کی ہے۔ ایک مسجد میں نماز ہو رہی تھی اتفاق سے ایک کنجڑے (سبزی فروش) نے جو لوگوں کو نماز پڑھتے دیکھا تو اس کی بھی رگ حمیت پھڑکی اور اس کے دل میں بھی پہلی بار عبادت کا جذبہ پیدا ہوا چنانچہ لپک کر بغیر وضو کے جماعت میں شریک ہو کر آخری صف میں کھڑا ہو گیا اتفاق سے اس مسجد کے امام جو نماز ولایت تھے انھوں نے اپنی قرآت اور اپنے حافظہ کا رعب جمانے کے لیے ایک لمبی آیت پہلی ہی رکعت میں شروع کر دی یہ چونکہ تھکا ماندہ تھا اس لئے پہلی ہی رکعت میں کھڑے کھڑے بالکل پسینہ پسینہ ہو گیا اور اس میں کھڑے ہونے کی تاب باقی نہ رہی تو اس درجہ غصہ ہوا کہ اس نے اپنی اگلی صف والے کے ایک لات رسید کی اور مسجد چھوڑ کر چلتا ہوا اتفاق سے یہ پوری قطار جو امام تک گئی تھی ایسے ہی لوگوں کی تھی جو پہلی مرتبہ نماز پڑھنے آئے لہذا اگلی صف کا لات کھانے والا یہ سمجھا کہ شاید نماز کی پہلی رکعت میں ایسا ہی ہوتا ہے چنانچہ اس نے بڑھ کر اگلی صف والے کے ایک لات رسید کی اور اس لات بازی کا سلسلہ امام تک پہنچا اور ان کے پیچھے والے نے جوش عقیدت ۔ ۔ ۔ ۔ [illegible] کر امام کے ایک لات رسید کی اس پر امام نے بڑھ کر نہایت [illegible]

کہ ابے یہ کیا کیا؟ اس پر اُس نے نہایت عجز سے کہا کہ حضور یہ پیچھے سے ہوتا چلا آرہا ہے اور تابعدار معذور ہے اسی قسم کا عذر مرزا صاحب نے اس شعر میں اپنی صفائی پیش کی ہے اور اسی وجہ سے وہ رسم و ثواب سے منحرف نظر آتے ہیں۔

غالبؔ کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے　　خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

: فائدہ ۔ ملخ ۔ ٹڈی

ہر کاہل کے پاس کاہلی کا کوئی نہ کوئی جواز ہوتا ہے جس کے سہارے وہ دن رات بستر پر پڑے پڑے بیڑی کے ٹرے جلا جلا کر ہوائی گول گھپل بنایا کرتا ہے اور اس طرح اپنا وقت گزار دیتا ہے۔ مرزا صاحب اس شعر میں ایک کاہل کی طرف سے جواز پیش کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب کاہل سے کہا گیا کہ "ابے یہ جو تو رات دن حرام کی زندگی بسر کر رہا ہے اور دونوں وقت مفت کی کھاتا ہے تو کوئی کوشش اور محنت مزدوری کیوں نہیں کرتا جس سے فائدہ ہو۔ اس پر اس نے جواب دیا کہ مرزا صاحب آپ کا یہ فرمانا بالکل بجا ہے مگر ہم کیا کریں بار بار کھیتی باڑی کا خیال دل میں پیدا ہوا اور دل چاہا کہ چلو دن رات کھیتوں پر بیلوں کی دُم مروڑ مروڑ کر کچھ پیدا کریں اور اُس سے فائدہ اٹھائیں مگر اس کے بعد ہی دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اچھا اگر کھیتی باڑی کی اور فصل تیار ہوئی اور ٹڈیاں آ کے کھا گئیں تو کیا کروگے یا اگر ٹڈیوں نے بھی رحم کھا کر کھیت کو بخش دیا اور فصل کاٹ کر کھلیان لگایا تو وہ بھی بیکار ہے۔ کیونکہ اگر کھلیان پر بجلی گری اور ساری فصل تباہ ہو کر

رہ گئی تو سوائے اس کے اور کیا کہتے بن پڑے گا کہ فتح محمد ولد بدو دکان کرانا
نفع کتدو۔

غزل نمبر ۳

وارفتہ اس سے ہوں کہ محبت ہی کیوں نہو　　کیجئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہو

وارفتہ = آزاد :۔

مرزا صاحب کا معشوق اگر اُن سے محبت کرنے کو تیار نہ تھا تو مرزا صاحب بھی کشادہ دل واقع ہوئے تھے کہ وہ اس سے عداوت ہی پر توڑ کرنے کو تیار تھے اور جائز اور ناجائز ہر قسم کے تعلقات قائم کرنے پر تلے ہوئے تھے مگر اسی کے ساتھ مرزا صاحب کی ایک شرط اتنی سخت تھی جسے اُن کا محبوب کسی قیمت پر ملنے کو تیار نہ تھا اور وہ یہ کہ خواہ محبت ہو یا عداوت اُس کے جملہ حقوق مرزا صاحب کے نام محفوظ رہیں اور اگر وہ تشدد اور مظالم بھی کرے تو صرف ان ہی پر کسی دوسرے کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھے۔

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا　　ہے دل پہ بار نقش محبت ہی کیوں نہو

اختلاط = میل، ملاپ، پیار، نقش محبت = نقش حب = معشوق کو قابو میں لانے کی تعویذ۔ رنگ = مشغلہ، شغل، حالت۔

ضعیفی میں انسان اور بالخصوص عشاق دانا گھاس تک چھوڑ دیتے ہیں چہ جائیکہ پیار اور محبت کیونکہ محبت اور عشق بازی کے لئے اچھے رگ پٹھوں کی ضرورت ہوتی ہے اور جب بڑھاپے میں انسان فالودہ بن کر رہ جاتا ہے تو پہلوانوں کی اصطلاح میں اُسے لنگوٹ اتار دینا پڑتا ہے اور جو اکھ

کا سارا نشہ ہرن ہوجاتا ہے۔ مرزا صاحب نے جوانی میں اپنے ہاتھ پیروں کے بل بوتے پر عشق کیا تھا لیکن جب بڑھاپے نے اُن کے تمام اعضا پر تسلط حاصل کر لیا تو صحرانوردی باقی رہی اور نہ جوانی کی اچک پھاند۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ بعد مرزا صاحب گنڈے تعویذ پر اُتر آئے مگر اس کے بعد ایک منزل وہ آئی جب محبت کا تعویذ بھی ان کے سینے پر بار ہونے لگا یا یہ کہ تعویذ کی ضرورت ہی باقی نہ رہی کیونکہ یہ باعزت طریقہ پر محبت سے دست کش ہو گئے اور انھوں نے محبت کے تعویذ کو جو وہ محبوب کو قابو میں لانے کے لئے ہمہ وقت باندھے رہتے تھے بغیر ضروری کچھ کر اُتار پھینکا۔

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ　　ہر چند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو

مرزا صاحب کو رقیب کے نام سے اس درجہ نفرت تھی کہ اگر کسی کی زبان سے اُس کا نام بھی سُن پاتے تھے تو اُداسی ہوجاتے تھے خواہ اُس کا نام شکایت ہی کے سلسلہ میں کیوں نہ لیا گیا ہو۔ ایک دن ان کے رقیب سے نہ جانے کون سی حرکت سرزد ہو گئی جو ان کا محبوب رقیب سے حد درجہ ناراض ہو گیا اور جب مرزا صاحب نے رقیب کے بارے میں اُن سے پوچھا۔ کیئے وہ بھی آتے ہیں اس پر اس نے جل کر کہا "ہاں وہ مردہ آیا تو تھا لیکن میں نے کھڑے کھڑے اُسے نکال باہر کیا۔ مرزا صاحب کو یہ خبر بھی شاق گذری کیونکہ مرزا صاحب یہ کبھی نہیں چاہتے تھے کہ محبوب کی زبان پر اُس کا نام تک آئے۔ اس شعر میں مرزا صاحب کے رشک کو کئی بار پاور کا دکھایا گیا ہے۔

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا　　یوں ہو تو چارہ غم الفت ہی کیوں نہ ہو

اس شعر میں استفہام انکاری ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ہر مرض کی دوا ہے مگر غم عشق کی دوا کہیں بازار میں میسر نہیں ہوتی ورنہ حقیقت یہ ہے کہ خارش، داد، ہیضہ، طاعون، مرگی اور اسی قسم کے دوسرے امراض کی دوائیں اگر طب میں نہیں تو بہر حال ایلو پیتھی یا آیورویدک میں کسی نہ کسی عنوان سے جب چاہیں آپ خرید کر استعمال کر سکتے ہیں مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ ابتدائے آفرینش سے اب تک ہزاروں مریض غم عشق میں مبتلا ہو کر انتقال فرما گئے مگر کسی حکیم، ڈاکٹر یا سائنسداں کو اس کی توفیق نہ ہوئی کہ وہ درد عشق کی کوئی گولی یا معجون تیار کرتا جس سے عاشقوں کو شفا ہوتی اور مجنوں، لیلیٰ، فرہاد و شیریں، وامق عذرا، نل دمن جیسے کرم یل جوانا عشق کے مرض میں مبتلا ہو کر اپنی جان سے ہاتھ نہ دھوتے۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال　　ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

مرزا صاحب نے یا تو کوئی ایسا جلالی عمل پڑھ کر موکل کو اپنا تابع کر لیا تھا کہ وہ جس وقت جس کو چاہتے اپنے پاس بلا لیتے۔ بہر صورت . . . . .

. . . .

. . . اس کوچہ میں قدم رکھنے سے پہلے اچھی طرح معلوم تھا کہ محبوب کو قابو میں لانا بڑا مشکل کام ہے چنانچہ اس شعر میں وہ اپنے موکل کی تعریف کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ صاحب ہمارے پاس اگر لوگ نہ آئیں یا محبوب برضا و رغبت آنے سے انکار کر دے تو ہم فکر مند نہیں ہوتے کیونکہ ہم نے ایک ایسا جلالی عمل پڑھ کر موکل کو اپنا تابع کر لیا ہے کہ وہ ہر چیز ہمارے سامنے حاضر کر دیتا ہے ہمارے منہ

سے ادھر کوئی بات نکلی اور موکل نے ہمارے حکم کی تعمیل کی اور وہ چیز فراہم
کر دی ۔ ہم نے شیریں کا تصور کیا ۔ آواز آئی کہ حضور شیریں حاضر ہے ۔ ہم
نے لیلیٰ کو دیکھنا چاہا موکل نے آواز دی کہ حضور لیلیٰ اور مجنوں کی سواری
آرہی ہے ۔ غرض مرزا صاحب جب تنہائی میں اپنے بستر پہ لیٹے نظر آتے
تو لوگوں کو یہ شبہ ہوتا تھا کہ مرزا صاحب تنہا ہیں حالانکہ ان کے گرد وپیش
اچھا خاصا مجمع ہوتا تھا ۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ سب کی سب ہوں اور آپ
کو دکھائی نہ دیں ۔ چنانچہ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ یہی محبت اور تفریح
ہمارے لئے کافی ہے ۔ اس لئے ہم خلوت کو بھی انجمن سمجھتے ہیں ۔

"کھاتا ہے فوت فرصت ہستی کا غم کوئی — عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو

مرزا صاحب اگرچہ رہتے جھونپڑوں میں تھے مگر ہمیشہ خواب محلوں کے
دیکھتے تھے ۔ اس شعر میں آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہر انسان کی خواہش، طلب اور
ذوق یکساں نہیں ہوتا کیونکہ امزجہ مختلف ہوتے ہیں ۔ مجنوں لیلیٰ کو باوجود
کالی ہونے کے اس درجہ پسند کرتا تھا کہ آخر میں اس کی محبت میں بید مجنوں
ہو کر رہ گیا ۔ یہی حال شیریں اور فرہاد، نل اور دمن، وامق و عذرا کا ہوگا ۔
ممکن ہے ان تمام عشاق کی محبوبائیں حسین ہوں مگر حسن کا معاملہ کچھ ایسا ہے
کہ اس میں سب سے بڑی چیز پسند ہے ۔ ہم آپ افیون سے نفرت کرتے ہیں ۔
لیکن اگر افیونی کے سامنے ایک طرف آپ سونے کی ڈلی رکھ دیں اور دوسری
طرف افیون کی پڑیا اٹھالے گا ۔ اسی طرح بیڑی پینے والے کو اگر آپ کیپسٹن،
یا گولڈ فلیک سگریٹ پیش کریں تو وہ حد درجہ انکساری کے ساتھ کہے گا کہ معاف

جو مزہ اور جو لذت اس سات نمبر کی بیڑی کو اللہ تعالیٰ نے بخشی ہے وہ بات بھلا گولڈ فلیک اور کیپسٹن کو کہاں میسّر۔ اس شعر میں مرزا صاحب بات یہی کہنا چاہتے ہیں مگر انھوں نے زبان اور لب و لہجہ مولویوں والا اختیار کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ خواہ انسان اپنی ساری زندگی عبادت اور ریاضت میں کیوں نہ گذار دے لیکن جو عمر بغیر محبوب کی قربت میں گذری ہے اُس کا غم نہیں مٹتا۔ عبادت ہی کو لے لیجئے۔ اس کے معاوضے میں زیادہ سے زیادہ جنت ملے گی جو مطلوب نہیں اور جو چیز طلب جو عمل سے کم ہو وہ غم دور نہیں کر سکتی۔

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسد   اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

مرزا صاحب ماشرا کا آنا کا کہ محبوب کے در پر کچھ اس طرح دھنا دے کر اور گھر سے دودھ دودھ بخشوا کر بیٹھے ہیں کہ اب اٹھنے کا نام نہیں لیتے اور نہ اب ان کو محبوب کے جور و تشدد کی پرواہ ہے اور نہ رقیب کی ڈھیلے بازی کا غم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی موقعہ پر ان کی محبوبہ نے اُن کی وفاداری کو تبلیغ کیا تھا چنانچہ مرزا صاحب جو ترکی النسل تھے اور اپنا سلسلہ نسب سلجوقوں سے بتاتے تھے، اُن کی رگ حمیت کچھ ایسی پھڑکی کہ انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ صاحب! کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ہم تو تماشہ کھُس ہی کر دیکھیں گے۔ اس شعر میں فتنہ خو، قیامت اٹھانا۔ لفظی رعایات حسن شعر میں اضافہ کر رہی ہیں اس کے علاوہ قیامت ہونے پر بھی نہ اٹھنا لطف سے خالی نہیں

غزل نمبر ۲۸

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانے میرے شیون کو
میرا ہونا بُرا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن کو

شیون = نالہ، آہ وزاری ۔ نوا سنج = نغمہ سنج

مرزا صاحب نے جگہ جگہ اپنے کلام میں اُن لوگوں پر لعنت بھیجی ہے جو اُن کے کلام کو مہمل اور لچر کہتے تھے اور اُن کے کلام کی ہر دلعزیزی پر رشک کرتے اور معاصرانہ چشمک رکھتے تھے چنانچہ نواسنجانِ گلشن سے مراد، ہم عصر شعراء سے ہے اور شیون سے مراد مرزا صاحب کے وہ اشعار ہیں جو ان کے دل سے نکلے ہوئے ہیں۔ میرزا صاحب اس شعر میں فرماتے ہیں کہ بھئی میں عشق و محبت کے قفس میں گرفتار ہوں اور یہ عشق ہی کیا کم مصیبت تھی جس سے مجھے اس دنیا میں دوچار ہونا پڑ رہا ہے اب جو محبوب کی یاد میں رچے بسے اور غسل کئے ہوئے اشعار نظم کرتا ہوں اور لوگ اُن سے متاثر ہوتے ہیں تو اس میں دوسرے شعراء کو میرا زندہ رہنا کیوں بُرا لگتا ہے ۔ میں خود کسی کی ترقی یا کسی کی شادکامی پر رشک و حسد نہیں کرتا ۔ پھر مجھ سے رقابت رکھنا بینہم العقلی نہیں تو اور کیا ہے۔

نکلا آنکھ سے تیرے اِک آنسو اس جراحت پر
کیا سینہ میں جس نے خوں چکاں مژگانِ سوزن کو

مژگانِ سوزن = سوئی کا ناکا ۔ سینہ میں = ذو معنین ہیں، ایک تو سینہ کے اندر، دوسرے سیتے وقت مرزا صاحب کا عشق میں بُرا حال ہے ۔ دل و جگر میں زخموں کے گڈھے پڑ گئے ہیں مگر ان کے محبوب کی ستم ظریفی ملاحظہ

ہو کہ اس کے باوجود اُس کے کان پر جوں نہیں رینگتی اور وہ اِن کے زخموں سے ذرہ برابر متاثر نہیں ہے حالانکہ اِن کے زخموں کا یہ حال ہے کہ جب ایکبار مرزا صاحب اِن زخموں کو رفو کرانے کی غرض سے چاندنی چوک کے ایک رفوگر کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اُس نے اُن کے زخموں کو دیکھ کر کہا کہ حضور ہم تو خیر انسان ہیں۔ آپ کے زخموں کی تو یہ حالت ہے کہ اگر ان زخموں کو چرند پرند دیکھ لیں تو رونا شروع کر دیں اور حضور اگر مبالغہ نہ سمجھیں تو عرض کروں کہ سوئی کی کیا حقیقت ہے جو ایک بیجان شے ہے وہ تک آپ کے اِن زخموں کو دیکھ کر آنسو بہا رہی ہے۔ یعنی زخم سیتے وقت سوئی کا ناکا خون آلود ہو کر خون کے قطرے ٹپکا رہا ہے اور چلا رہا ہے۔ ہائے مار ڈالا۔

خدا شرمائے ہاتھوں کو جو رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو۔

کشاکش: کھینچا تانی یعنی بحالت تنہائی جب شدت جنوں کی سی زیادتی ہو جاتی ہے تو گریبان کو کھینچ کھینچ کر چاک کرتے ہیں اور اگر معشوق پاس ہوتا ہے تو اُس کے دامن کو کھینچتے ہیں۔ مرزا صاحب ایسے گستاخ ہاتھوں کو بد دعا دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ خدا ان کو شرمائے۔ یہ واقعہ ہے کہ مرزا صاحب پر عشق و محبت کا اس درجہ غلبہ تھا کہ وہ ہر وقت اُن کی گردن دبائے رہتے تھے اور ان کا کام دن بھر اپنے گریبان کو کھینچ کھینچ کر پھاڑ نا رہ گیا تھا جسکی وجہ سے اُن کے گھر والے بھی ان سے سخت عاجز تھے کیونکہ کس کی اتنی ہمت تھی جو روز روز ان کو کپڑے بنوا کر دیتا۔ بہرحال اگر یہ کھینچا تانی اُن کی اپنی

ذات تک محدود رہتی تو بھی کوئی ہرج نہ تھا لیکن اب اُن کے جنون کی حالت اُس منزل تک پہنچی ہوئی تھی کہ یہ محبوب کے دوپٹے، ساری، جمپر اور قمیص پر حملہ کرنے پر اتر آئے تھے لیکن عجیب بات تھی کہ جب مرزا صاحب کسی وقت میں آتے اور لوگ اُن سے کہتے کہ حضرت آپ کے محبوب کی والدہ محترمہ یعنی آپ کی ہونے والی خوش دامن آج گھر پر شکایت کرنے آئی تھیں کہ صاحب مرزا صاحب نے تو ہماری لڑکی کو بڑا دق کرنا شروع کر دیا ہے اور اب انھوں نے ہماری صاحبزادی کے کپڑوں پر حملہ کرنا شروع کر دیئے ہیں یہ سُنکر مرزا صاحب سخت خجل اور شرمندہ ہوئے اور خود اپنے آپ کو کوسنا شروع کر دیا کہ خدا غارت کرے ہمارے اِن ہاتھوں کو جنھوں نے اُن کی بیٹی کے دامن کو کھینچا یا چاک کیا ہے۔

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں   نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

شناور = تیرنے والا۔ جوئے خوں = خون کی ندی۔ توسن = گھوڑا۔

مرزا صاحب صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ صاحب ہم عشق کے میدان میں بالکل اناڑی کی حیثیت سے داخل ہوئے ہیں اور ہم کو عشق کی سختیوں اور معشوق کی بے اعتنائیوں کی اکھاڑ پچھاڑ کی کوئی خبر نہیں ہے۔ جب ہم تشدد برداشت کرتے کرتے عشق کی آخری سیڑھی پر پہنچیں گے تب ہم اندازہ کر سکیں گے کہ عشق دراصل علم دریا ہے اور اس میں پڑنا آسان کام نہیں۔ اس مطلب کو مرزا صاحب اس طرح گھما پھرا کر کہتے ہیں کہ گویا پانی پت کا میدان دیکھنے چلے آ رہے ہیں لیکن ان کی نظر ابھی اُس کشتِ خون پر نہیں پڑی ہے جو اُس میں

ہوتا ہے اور جہاں خون کے دریا بہتے ہیں اور محبوب گھوڑے پر سوار
قتل و غارت کرتا دکھائی پڑتا ہے۔

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آئے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈھے ہے ابھی سے برق خرمن کو

آپ نے دلّی ہی میں اس بات کا تجربہ کیا ہوگا کہ جب آسمان پر برسات
ہیں یا جاڑے اور گرمی کے موسم میں کبھی بادل گھر کر آتے ہیں اور بارش
ہوتی ہے تو اکثر نئی دلّی سے لوگ آکر بتاتے ہیں کہ آج تو بڑی موسلا دھار
بارش ہوئی۔ ہماری طرف تو جل تھل بھر گئے مگر پرانی دلی میں ایک بوند نہیں
گرتی اور لوگ حیرت کرتے ہیں کہ ایک ہی شہر میں ایک جگہ بارش ہو رہی ہے
اور دوسری جگہ ایک بوند نہیں برسی۔ چنانچہ مرزا صاحب جنھوں نے غالباً عشق
سے کنارہ کش ہو کر کھیتی باڑی کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور دلّی کے
مضافات ہی میں کھیتی باڑی کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس شعر میں فرماتے
ہیں کہ بھائی کھیتی باڑی بھی کر کے دیکھ لی اور اس میں بھی اپنے کو حد درجہ
بدنصیب پایا۔ بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ جہاں پر ہمارا کھیت واقع ہے وہاں بار بار
آسمان پر بادل گھر گھر کر آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ درآں حالیکہ دوسرے
کھیتوں میں جو نئی دلی سے زراعت کر رہے ہیں وہاں خاصی بارش ہوتی ہے اور
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری طرف جو ابر کے ٹکڑے معائنہ کرنے تشریف
لاتے ہیں ان کا مقصد بارش نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کے منتظر رہتے ہیں کہ
مرزا صاحب کی فصل تیار ہولے اور وہ اسے کاٹ کر کھلیان بنا لیں تو ان پر

بجلی گرا کر سارے کھلیان کو خاکستر کر دیا جائے اس شعر میں لفظ "میرے" سے مرزا صاحب نے ساری مصیبتوں کو اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے — مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

مرزا صاحب نے یہ شعر اسلامی عقائد کے تحت کہا ہے یعنی جب برہمن ساری عمر بت خانے میں کاٹ دے اور وہاں اخلاص اور وفاداری کے ساتھ بت پرستی میں اپنی زندگی گزار دے اور اسی مندر میں انتقال فرما جائے تو اُس کی وفاداری کو سراہنے کے لئے اور یہ سوچ کر کہ اُس نے وفاداری کا پورا پورا حق ادا کیا ہے جو ایمان کی اصل ہے تو اُسے کعبہ میں دفن کرنے کا موقعہ دیا جائے۔ مرزا صاحب ہر معاملے میں اخلاص کے قدر داں ہیں اور اسی کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں نہ وہ دھوتی اور پیجامے کے قائل ہیں اور نہ داڑھی اور چوٹی کی طرف نگاہ کرتے ہیں بلکہ وہ تو اس کے قائل ہیں کہ خواہ رام بھروسے ہوں یا محمد سلیم دونوں کو نیک اعمالی کا معاوضہ ملے گا اور اُن کے اعمال اور اخلاص کی قیمت مرنے کے بعد عالم بالا کا اکاؤنٹینٹ ادا کرے گا۔

نہ لٹتا دن کو کب گر رات کو یوں بے خبر سوتا — رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

ہر وہ انسان جس کی گرہ میں کفن کو پیسہ نہیں ہوتا وہ جب سوتا ہے تو گدھے بیچکر سوتا ہے اور اُسے وہ خراٹے دار نیند آتی ہے کہ بڑے بڑے افیونی اُس پر رشک کرتے ہیں۔ دوسرے معنی اس شعر کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مرزا صاحب کی جوانی جس میں ان کو خوشحال ہونا چاہئے تھا حد درجہ بے سروسامانی سے گذری اس وجہ سے کہ انھوں نے اپنے پیچھے بہت سی ہتیں لگا رکھی تھیں مثلاً شراب کی لت عشقبازی

کی لت، چوسر اور گنجیفہ کی لت، وغیرہ اس سے مرزا صاحب کو اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ بڑھاپے میں جب مفلسی کا سامنا کرنا پڑا تو انھیں مفلسی کی ذرہ برابر تکلیف نہ ہوئی کیونکہ وہ جوانی میں کون سے خوشحال رہے تھے جو بڑھاپے میں ان کو اپنی خوش حالی کا دور یاد آتا اور ان کو تکلیف ہوتی۔ لہٰذا مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ جوانی کی رنگ رلیوں میں ہمارا مال و دولت لٹانا ہمارے لئے موجب رحمت ہوا اس لئے ہم لوٹنے والے یعنی اُن بازیوں کو جو ہم نے جوانی میں اختیار کی تھیں، دل سے دعا دیتے ہیں۔

غزل نمبر ۵

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

سیم تن = حسین ‏ ‏ پاؤں دھو دھو کر پینا = خوشامد کرنا۔ عزیز رکھنا یعنی میں معشوق کے پاؤں دھو کر پینا چاہتا ہوں مگر وہ شرارت سے پاؤں دھونے نہیں دیتا۔

شادی بیاہوں میں ایک رسم ہوتی ہے کہ جب دلہن دولہا کے گھر سلام کرائی کے لئے جاتا ہے تو اس کی سالیاں اور میراثنیں دولہا کے ساتھ یہ مذاق کرتی ہیں کہ ایک لگن میں پانی بھر کر لاتی ہیں اور اس میں دولہن کے پیر دھلائے جاتے ہیں اور دولہا سے اصرار کیا جاتا ہے کہ وہ دلہن کے پاؤں کا دھوون پیئے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دولہا ہمیشہ دلہن کا فرمانبردار رہا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کی شادی ان کی مرضی کے خلاف کردی گئی تھی

چنانچہ جب مرزا صاحب اس رسم کو ادا کرنے کے لئے تشریف لائے اور ان سے یہ رسم ادا کرائی جانے لگی تو ان کی بیوی نے جو کسی قیمت پر مرزا صاحب کے عقد میں نہیں آنا چاہتی تھیں پاؤں لگن سے کھینچنا شروع کر دیئے حالانکہ مرزا صاحب نہایت فدوی قسم کے شوہر تھے اور اُس دھوون تک کو پینے کے لئے تیار تھے مگر مرزا صاحب سے بیوی کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ وہ برابر لگن سے پاؤں کھینچے لے رہی تھیں اور اس کا اظہار کر رہی تھیں کہ مرزا صاحب ان کو پھوٹی آنکھ نہیں بھاتے۔

بھاگے تھے ہم بہت سو اُسی کی سزا ہے یہ　　ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

مرزا صاحب اگرچہ اپنی شجاعت و بہادری کے بارے میں بڑی دون کی لیتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ بڑی سے بڑی مصیبت آجائے ہم ہر وقت اُس کا مقابلہ کرنے کو تیار رہیں۔ ایک دن مرزا صاحب رات کے وقت اپنی پنشن لئے گھر واپس آرہے تھے کہ ایک رہزن نے ان کا تعاقب کیا اور یہ نناوے میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگے ظاہر ہے کہ مرزا صاحب کی عمر ایسی نہ تھی کہ وہ زیادہ دور بھاگ سکتے نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بیدم ہو گئے اور رہزن نے ان کو پکڑ لیا رہزن بھی ان کے پیچھے دوڑتے دوڑتے چونکہ تھک گیا تھا لہذا بڑے تاؤ میں تھا وہ ان کو پکڑ کر گھر لے گیا اور اس نے پہلے تو ان کا سارا روپیہ پیسہ چھین لیا۔ اس کے بعد اس نے بطور سزا مرزا صاحب سے کہا کہ اچھا اب آپ کے بھاگنے کی سزا یہ ہے کہ آپ ہمارے پاؤں دابیے اس طرح مرزا صاحب رات بھر عاشق کے پاؤں دابتے رہے جب مرزا صاحب دوسرے روز گھر پہنچے تو انھوں نے

کل واقعہ بیان کیا اس پر اُن کی محترمہ نے فرمایا کہ میں دیکھتی ہوں کہ تم گھر ہی کے شیر ہو ، اے تم نے اُس نگوڑے کو کیوں نہیں دے مارا جبکہ گھر میں ہر شخص پر بات بات پر آستین چڑھائے رہتے ہو اس پر مرزا صاحب بولے کہ بھئی جو مقدر میں لکھا تھا وہ پورا ہو کر رہا۔

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور — تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پاؤں

سوا معنی زیادہ — فگار معنی زخمی — خستہ تن۔ بیمار۔ نحیف

مرزا صاحب کا سارا جسم اُن کے محبوب کے جور و تشدد کے سبب زخموں سے چور چور ہو گیا تھا چنانچہ یہ ہفتوں زخموں کا مرہم لینے کے لئے اسپتال پہنچتے تھے لیکن اسپتال اُن کی قیام گاہ سے خاصے فاصلہ پہ واقع تھا جس کی وجہ سے چلتے چلتے ان کے پاؤں میں آبلے پڑ گئے تھے اور اُن کے آبلوں نے زخموں کی شکل اختیار کر لی تھی ایک دن گھر والوں نے جب ان کے پیروں میں آبلے دیکھے تو پوچھا کہ یہ پیروں میں کیا ہوا اس پر مرزا صاحب نے کہا کہ کیا بتائیں اسپتال کی مرہم گھس گھس نے پیروں کی حالت جسم سے بھی زیادہ بدتر بنا دی ہے اور دوڑتے دوڑتے پیر اس درجہ مجروح ہو گئے ہیں کہ اب جسم سے زیادہ پیروں میں تکلیف ہے

اللہ ذوقِ دشت نوردی کہ بعد مرگ — ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

ذوقِ دشت نوردی = صحرا نوردی کا شوق

مرزا صاحب کا جب انتقال ہوا اور لوگ ان کو دفن کرنے کے لئے کاندھوں پر قبرستان لے چلے تو اُس زمانہ میں قبرستان کو جو سڑک گئی تھی وہ بالکل کچی تھی جس کے سبب اُن کی میت کو سخت ہچکولے پڑ رہے

تھے چونکہ راستے میں بڑے بڑے گڈھے تھے اور اُس کی وجہ سے ان کے پاؤں خود بخود ہل رہے تھے اس لئے مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ یہ جو پاؤں مرنے کے بعد ہل رہے ہیں اس کی وجہ شاید آپ حضرات کی سمجھ میں نہیں آرہی ہے اس کی وجہ حقیقتاً یہ ہے کہ میری ساری زندگی صحرا نوردی میں بیتی اور میں تمام عمر جنون محبت میں زمین کا گز بنا رہا ہوں اس لئے اب پیروں کو اس صحرانوردی کی ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ مرنے کے بعد بھی پیر کفن کے اندر سے ہل ہل کر اپنی دشت نوردی کے شوق کا اظہار کر رہے ہیں دوسرے یہ واقعہ ہے کہ اصلی سفر تو انسان مرنے کے بعد ہی کرتا ہے اور مرزا صاحب مرنے کے بعد حقیقتاً سرگرم سفر تھے۔ لہٰذا وہ کفن کے اندر سے جو ہل رہے تھے اس کا ایک مفہوم یہ بھی نکلتا ہے کہ مرزا صاحب چونکہ سفر آخرت فرما رہے تھے لہٰذا ان کے پاؤں کا ہلنا لازمی اور لابدی تھا۔

ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغِ چمن کے پاؤں

جوشِ گل معنی کثرتِ گل۔

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ بہار کے جوش کا یہ عالم ہے کہ سارے باغ میں پھول جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں اور ہر طرف اُن کے انبار لگے ہیں۔ بلبل جو پھولوں سے عشق کرتی ہے اور ان پر جان چھڑکتی ہے اس کا یہ عالم ہے کہ باغ میں اُسے چلنا دو بھر ہے اور وہ اڑنا بھول گئی ہے اور .... بہار دیکھ کر اس پر ویت طاری ہو گئی ہے یہ واقعہ ہے کہ آپ کتنے ہی خوش خوراک قسم کے انسان کیوں ہوں مگر جب دسترخوان پر ہزاروں قسم کی غذائیں رکھی ہوں تو اُس وقت آپ کا

معدہ اپنی ساری چوکڑی بھول جاتا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کون چیز کھائیں
اور کون سی چیز نہ کھاؤں یہی حال اُس بلبل کا ہے جو پھولوں پر عاشق ہے لیکن
بہار اپنے دسترخوان پر اس کثرت سے پھول لگائے بیٹھی ہے کہ بلبل اپنے ہوش و
حواس کھو بیٹھی ہے اور پھولوں کو دیکھ کر اُس پر ویسی ہی محویت طاری ہے جیسی
کہ ایک خوراک جیسے مولوی پر اچھا دسترخوان دیکھ کر طاری ہوتی ہے

غزل نمبر ۶

واں سکو ہول دل ہے تو یاں میں ہوش سر سارہ یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو
ہول دل معنی اختلاج قلب۔

مرزا صاحب کا سابقہ ایک ایسے محبوب سے پڑا تھا جو منجملہ دیگر امراض کے
اختلاج میں بھی مبتلا تھا۔ مرزا صاحب محبوب کے فراق میں کچھ اس درجہ نالہ و فریاد
کے عادی تھے کہ وہ انھیں روکنے پر بھی قادر نہ تھے اور محبوب کو حکیموں نے کامل
آرام کا مشورہ دیا تھا۔ اب مرزا صاحب کو سخت پریشانی لاحق ہے کہ وہ کیا
کریں کیونکہ اِدھر ان کو نالوں کے روکنے پر قدرت نہ تھی اور ادھر ان کے شور و غل
اور نالہ و فریاد سے محبوب کے اختلاج قلب کی ساری ذمہ داری ان کے نالہ و فریاد
پر عاید ہوتی ہے اور بہت ممکن ہے کہ مرزا صاحب کے نالہ و فریاد ہی کے سبب محبوب
اختلاج قلب کے مرض میں مبتلا ہو گیا ہو۔

غزل نمبر ۷

دل کو میں اور مجھے دل محو وفا رکھتا ہے کس قدر ذوق گرفتاری ہم ہے ہم کو
گرفتاری ہم یعنی ہم گرفتاری یعنی دونوں کا ملکر گرفتار رہنا جیسے

ہم قفسی ، ہمدردی وغیرہ

عشق و محبت میں مرزا صاحب سے اور ان کے دل سے سخت لاگ ڈانٹ چل رہی ہے اور دونوں ایک دوسروں کو چوٹ دینا چاہتے ہیں چونکہ دل کو مرزا صاحب نے دیدہ و دانستہ محبوب کے ہاتھوں گرفتار کرایا ہے لہذا دل بھی ان کو جیل بھجوانے پر آمادہ ہے۔ خواہ وہ مرزا صاحب کو وفا کی حوالات ہی کیوں نہ کرادے۔ اس شعر کا مقصد یہ ہے کہ دل اور جسم دونوں معشوق کے دام بلا میں پھنسے ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے لپکا ڈگی کر رہے ہیں۔

جان کر کیجئے تغافل کہ کچھ اُمید بھی ہو یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

تغافل معنی بے التفاتی۔ لاپروائی کچھ اُمید بھی ہو یعنی مہربانی کی کچھ توقع ہو تاکہ ہم زندہ رہ سکیں۔ نگاہِ غلط انداز: ایسی نظر بے التفاتی جس میں مہر و مروّت کا نشانہ نہ ہو۔ سم معنی زہر۔

مرزا صاحب بڑھاپے میں ایک کمسن اور ناتجربہ کار محبوبہ کے دام محبت میں گرفتار ہیں اور وہ اس درجہ الھڑ اور لاپروا ہے کہ اس کو مرزا صاحب کی ذرہ برابر فکر نہیں۔ مگر مرزا صاحب جانتے ہیں کہ اس کی لاپروائی اور بے التفاتی اس کے سن کا تقاضا ہے۔ چنانچہ یہ بار بار اس کو وارننگ دیتے رہتے ہیں کہ دیکھو جی اگر ہمارا تمہارے اس تغافل سے انتقال ہو گیا تو سوچ لو کہ اس کے بعد ہمارے کفن دفن کا انتظام اور تیجے اور چالیسویں کے اخراجات سب تم ہی کو برداشت کرنا پڑیں گے اُس وقت یہ نہ کہنا کہ ہائے بڑی چوک ہوئی لہذا مصلحت تم کو لازم ہے کہ جب تک ہم زندہ ہیں اُس وقت تک

زیادہ نہیں تو دو ایک میٹھی التفات ہماری طرف بھی کر لیا کرو تاکہ ہم مرنے سے بچے رہیں اور ہمیں کامل مایوسی نہ ہو ورنہ یاد رکھو کہ ہم تو بہر حال جان سے جا ہی گے مگر تم کو بھی سخت مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور اس کے بعد سر پکڑ کر رو دو گی کہ ہائے کیا چوک ہوئی ہے

رشک ہم طرحی و درد اثر بانگ حزیں　　نالۂ مرغِ سحر تیغِ دو دم ہے ہم کو

طرح معنی یہ لفظ کثیر المعنی ہے یہاں اس کے معنی انداز۔ طور طریق کے ہیں ہم طرحی معنی ایک ہی انداز کا ہونا۔ بانگ حزیں معنی ایک ہی انداز کا ہونا۔ بانگِ حزیں معنی غمگین آواز۔ تیغِ دودم معنی دو دھاری تلوار۔

مرزا صاحب کو منجملہ دنیا کی ساری چیزوں کے مرغِ سحر کے نالہ سے بھی تکلیف پہنچتی تھی گویا آپ نے عشق کیا فرمایا تھا۔ حاتم کی قبر کو لات ماری تھی اور سارے جہاں پر احسان عظیم فرمایا تھا اب مرزا صاحب چاہتے ہیں کہ آپ کی وجہ سے دنیا کے سارے مرغ تک اذان دینا بند کر دیں یا گل و بلبل کے درمیان جو عاشقی اور معشوقی کا سلسلہ ایک زمانہ سے جاری ہے وہ بھی ختم کر دیا جائے چنانچہ مرغِ سحر جو اپنے معشوق کی جدائی میں دلسوز نالے نشر کرتا ہے وہ مرزا صاحب کو اس وجہ سے ناگوار ہیں کہ اس نے مرزا صاحب کی طرح عشق کیوں کیا اُن سے پوچھ کر کیوں نہ کیا پھر اگر عشق کیا تھا تو مرزا صاحب سے زیادہ ہارس پاور کے نالے نشر کرنا کیوں شروع کر دیے دوسرے مرزا صاحب کو یہ بھی اندیشہ ہے کہ کہیں مرغانِ سحر نے عشق کی پٹری بدل کر ان کے محبوب سے عشق نہ کرنا شروع کر دیا ہو اور یہ شک اس وجہ سے ہوا

کہ ان کے نالے مرزا صاحب سے زیادہ پر اثر تھے۔

سر اڑانے کے جو وعدہ کو مکرر چاہا ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہی ہمکو

اس شعر میں تیرے سر کی قسم ہے کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ تیرے سر کی قسم ہم ضرور سر اڑائیں گے اور دوسرے یہ کہ ہم کو تیرے سر کی قسم ہے یعنی ہم کبھی تیرا سر نہ اڑائیں گے جیسے کہتے ہیں کہ آپ کو تو ہمارے ہاں کھانے کی قسم ہے یعنی کبھی آپ ہمارے ہاں کھانا نہیں کھاتے۔

مرزا صاحب سے تنگ آکر ایک دن کہیں بھولے سے اُن کے محبوب نے انھیں تڑپ دم کرنے یا اُن کے سر اڑانے کا وعدہ کر لیا ہے مگر مرزا صاحب کو اس وعدہ کی سچائی پر شبہ ہے اور وہ خیال کرتے ہیں کہ اُس نے رواروی میں کہہ دیا ہوگا کہ اچھا چلئے سر اڑا دیا جائے گا اور یہ محض اس نے اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے کیا تھا۔ چنانچہ اس شک کو دور کرنے کے لئے آپ نے ان کی خدمت میں خط لکھ کر بھیجا کہ حضرت وہ جو آپ نے اُس روز سر اڑانے کا وعدہ فرمایا تھا اس پر آپ اب بھی قائم ہیں یا نہیں اس کے جواب میں اُس نے جو لکھا وہ بھی کچھ اُسی قسم کی شک و شبہ والی بات تھی۔ یعنی یہ کہ "تیرے سر کی قسم ہے ہم کو" یعنی ہم نے جو وعدہ کیا ہے اُسے ہم ضرور پورا کریں گے یا ہم ہرگز سر نہیں اڑائیں گے لہٰذا پھر مرزا صاحب اس جواب کے بعد گھبرائے ہوئے ہیں کہ معلوم نہیں کہ وہ سر اڑائے گا یا نہیں اگر کوئی یکا وعدہ کر لیتا تو ہم دودھ وودھ بخشوا کر کفن دفن کا انتظام کرتے مگر خط کا لب و لہجہ ایسا ہے

جس سے اس کی نیت میں کھوٹ معلوم ہوتی ہے۔

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو　　ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہمکو

مرزا صاحب کا معشوق اس درجہ جھلا اور بدمزاج واقع ہوا تھا کہ بات بات پر اُلار ہو جاتا تھا اور مرزا صاحب بھی بڑے خوشامدی تھے کہ اتنے بڑے ہاتھی کو رام کئے تھے اگرچہ اُس کی محبت میں گھلتے گھلتے سوالیہ جملے کا نشان بن کر رہ گئے تھے پھر بقول شخصے مارے اور رونے نہ دے وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ مرزا صاحب خاموش رہیں کیونکہ مرزا صاحب خود خاموشی کے باوجود کچھ نہیں تو ہچکیاں ہی لیتے ہوں گے جو اُس کی طبع نازک پر بار ہوں گی ورنہ مکمل خاموشی کو کوئی احمق بھی فغاں نہیں کہہ سکتا۔ مگر مرزا صاحب ان بندشوں سے حد درجہ بیزار ہیں اور ان کو یہ بھی منظور نہیں کہ مرزا صاحب کی طرف سے وہ پیٹھ موڑ کر تھوڑی دیر کے لئے ادھر دیکھیں بھی دیکھے۔

غزل نمبر ۹

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو　　مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

مرزا صاحب کو محبوب کی ملاقاتوں اور دوستوں کی چنداں پرواہ نہ تھی چنانچہ انھوں نے ملنے جلنے کے معاملہ میں ان کے لئے ڈوری ڈھیلی کر رکھی تھی اور عام اجازت دے دی تھی کہ وہ جس کے ساتھ چاہیں ناچیں تھرکیں، گھومیں پھریں۔ سینما دیکھیں۔ پکنک پر جائیں غرض جو چاہیں کریں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اگر حرج نہ سمجھیں تو ہفتے عشرہ ان کی بھی خیریت دریافت کر لیا کریں ممکن ہے کہ آخیر عمر میں جب مرزا صاحب ہاتھ پیروں سے

بالکل لٹ گئے اُس وقت اُنھوں نے اس فراخ دلی کا ثبوت دیا ہو ورنہ جوانی کے عالم میں تو وہ ہر جگہ آنے جانے پر محبوب کی ڈوریے کسے دکھائی دیتے تھے،

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے   قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

مرزا صاحب زندگی بھر اپنے محبوب کو ڈراتے دھمکاتے رہے دیکھو! یہ جو تم ہم پر تشدد کر رہے ہو اس کا نتیجہ اچھا نہیں۔ دیکھنا روزِ قیامت تمھارا کیا حشر ہوتا ہے اور داورِ محشر کے سامنے تمھاری کیا درگت بنتی ہے کیونکہ وہاں تو تم مواخذہ سے بچ ہی نہیں سکتے اگر بالفرض تم نے دو ایک جھوٹے گواہ فراہم کر کے یہ ثابت بھی کر دیا کہ ہمارے قتل کی ذمہ داری تم پر عاید نہیں ہوتی اور ہم کو رقیب نے قتل کیا ہے تب بھی میں عذر داری پیش کر کے داورِ محشر کے سامنے پوچھوں گا کہ آپ ان سے قسم لے کر پوچھئے کہ میرا قتل اِن کے سامنے ہوا تھا یا نہیں بہر حال داورِ محشر کی عدالت میں مجرم کی حیثیت سے نہ سہی گواہ ہی کی حیثیت سے   تم کم از کم عدالت کے کٹہرے میں تو دکھائی ہی دو گی۔

ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار   مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

اس شعر سے خیال ہوتا ہے کہ مرزا صاحب رستے گلی ہر برقعہ پوش عورت کو دیکھتے چلتے تھے چنانچہ ان کی محبوبہ جو ان کی نظر کی ہر وقت کی لاگ لاؤں سے عاجز ہو کر اِن سے پردہ کرنے لگی تھیں ایک دن سڑک پر برقعہ پہنے اور منہ پر نقاب ڈالے گذر رہی تھی کہ اتنے میں مرزا صاحب کو ان کی نقاب میں ایک اُبھرا ہوا تار دکھائی دیا مرزا صاحب شکی مزاج تو تھے ہی یہ دیکھ کر

رشک وحسد کی آگ میں جلنے لگے اور سوچے کہ ہو نہ ہو یہ اُبھرا ہوا تار کسی محوِ جمال کا تارِ نگاہ ہے جو اس طرح نقاب میں اندر اندر نظر آرہا ہے اس کے معنے یہ ہوئے کہ مرزا صاحب کی ماشاء اللہ آنکھ کی بینائی خاصی زور دار تھی۔

جب مے کدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید مسجد ہو، مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو اس شعر میں مرزا صاحب نے ملک کی تقسیم کے بعد ناظم آباد کے ان تاڑی بازوں کی ایک محفل کا نقشہ کھینچا ہے۔ جن کا شمار ہندوستان کے مشہور تاڑی بازوں میں تھا اور جو ملک چھوڑ چھاڑ پاکستان بھاگ گئے ہیں چنانچہ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ایک دن اتفاق سے گھوڑوں کے ایک اصطبل کے قریب جہاں ہر قسم کی غلاظت پڑی ہوئی تھی چند تاڑی باز بیٹھے مارے اپنے اپنے کچے آگے رکھے بیٹھے تھے اتنے میں ایک تاڑی باز بولا بھئی! یہاں تو مارے سڑاہند کے ناک نہیں دی جا رہی ہے کسی دوسری جگہ چل کر پیو اس پر دوسرے کچے باز نے آہ سرد کھینچ کر کہا "ابے یہ کام ہی کون سا نیک ہے جس کے لئے اتنی نفاست کی تلاش ہے جب ہندوستان ہی چھٹا تو اب جہاں کہیں بھی ملے اس فریضہ کو ادا کر یو اب وہ تاڑی خانے یہاں ملنے سے رہے جہاں ہر سیل ملت کا آدمی بیٹھا دکھائی پڑتا تھا۔ کوئی تہمد زدہ ہے تو کوئی لنگوٹ پوش، کوئی انگوچھے میں ہے تو کوئی پیجامے میں۔ کوئی دستار اور عمامے میں کھڑا پی رہا ہے تو کوئی جٹا دھاری پنڈت بنا جپ جپ کر اپنی حلق تر کر رہا ہے کسی کے سر پر چوٹی ہے تو کسی کے منہ پر داڑھی۔ لہذا جب وطن عزیز

جیسی چیز چھٹ گئی تو اب چاہے قد مجے پر بیٹھ کر ملے اور چاہے وائے سرائیکل لاج میں عبرت شکر سے پی لو۔ اب تو بقول شخصے ہندوستان حریفوں کا ملک ہے اُن حریفوں کو بھول جاؤ اور مسجد مندر اور خانقاہ کی تخصیص چھوڑو۔

غزل نمبر ۹

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو — کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیوں کر ہو

جب مرزا صاحب کے محبوب نے اِن سے میل جول بالکل ترک کر دیا تھا تو مرزا صاحب رات دن پریشان نظر آتے تھے اور سوچا کرتے تھے کہ اب اُن سے ملنے کی کیا صورت اختیار کریں لیکن بخانے کیا ہوا کہ کسی مشاعرہ یا ادبی نشست میں اِن کو اتنا موقعہ مل گیا کہ انھوں نے اپنی ساری کتھا اس کے گوش گذار کر دی چنانچہ اُس نے اِن کے حالات بغور سُن کر بجائے اظہار ہمدردی کے اُن کو بے حد ڈانٹا ڈپٹا اور کہا اچھا تو اب آپ نے دوسروں کی بہو بیٹیوں پر نظر ڈالنا شروع کر دی آئندہ سے اگر آپ نے اس طرح کی کوئی بات کی تو میں اپنے ابا جان سے کہہ دوں گی یہ سُن کر مرزا صاحب دوسرے مصرعے میں سوچ رہے ہیں کہ یہ تو بُرا ہوا اس سے تو بہتر وہی زمانہ تھا جب محبوب سے ملاقات نہیں ہو پاتی تھی کیونکہ اُس وقت تک کم از کم یہ اُمید تھی کہ شاید وہ راضی ہو جائیں اور کوئی نباہ کی صورت نکل آئے مگر اس گفتگو کے بعد تو ساری اُمیدیں ہی ختم ہو گئیں اور جس گھوڑے پر ردیبہ لگایا تھا وہ بڑا اڑیل نکل گیا لہٰذا اب زندہ رہنے اور زندگی گذارنے کی کیا اُمید رہ گئی گئے تھے روزہ بخشوانے اور نماز گلے پڑی۔ نکاح کا خیال تو چھوڑیئے اب ملنے اور بات کرنے تک کا سوال نہیں رہا اب سوائے زہر کھا لینے

کے دوسری کوئی صورت نہیں۔

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو؟

مرزا صاحب کو جب کامل مایوسی ہوگئی کہ اُن کا محبوب اُن سے کسی قیمت پر ملنے کو تیار نہیں تو انھوں نے خیالی پلاؤ پکا کر اپنا مقصد حاصل کرنا شروع کردیا اور عالم تخیل میں اُس کے نام پر مسمریزم کی مشق شروع کردی چنانچہ اس کے بعد سے جب دیکھئے مرزا صاحب مراقبہ میں پڑے ہیں اور محبوب سے ذہنی وصال حاصل کررہے ہیں عالم خیال میں اُن کا خیال آیا اور وہ حاضر ہوگیا اور انھوں نے اُسے بٹھا کر اپنی محبت کی۔ داستان چھیڑ دی اگر کوئی مرزا صاحب سے ملنے آیا اپنی غزل پر اصلاح لینے حاضر ہوا تو کہلوا دیا کہ وہ اس وقت عالم وصال میں ہیں۔ مل نہیں سکتے، اور اس ذہنی ملاقات کا نام آپ نے وصال رکھ چھوڑا تھا جب کسی نے مرزا صاحب سے دریافت کیا کہ کہئے مرزا صاحب! اب آپ کے محبوب کا وصال کس منزل میں ہے؟ تو کہہ دیا کہ اماں! اب تو ماشاء اللہ تابڑ توڑ وصال پر وصال ہو رہا ہے سانس لینے کی مہلت نہیں ہے چنانچہ جب دیکھئے اِن کا محبوب ان کے تخیل میں حاضر ہے اور مرزا صاحب اس کو اپنا مجرا پیش کر رہے ہیں دوسرے مصرع میں مرزا صاحب اپنے غور و فکر کی وضاحت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ صاحب جب اُس نے وصال سے انکار کردیا تو اب ہم نے بھی اُن کو حاصل کئے بغیر اُن سے وصال حاصل کرنا شروع کردیا ہے اور اُس کی ایک خیالی تصویر بنا کر اپنے تخیل کے کمرے میں

ٹانگ دی ہے اور آج کل اسی غیر حقیقی وصال میں مبتلا ہیں۔ مختصر یہ کہ مرزا صاحب عشق کر کے اس ادھیڑ بن میں پڑے ہیں کہ وصال نہ ہو تو کیا کریں اور وصال ہو تو کیوں کر ہو؟

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجئے حیا ہے اور یہی گومگو تو کیوں کر ہو؟

کشمکش ۔ کشیدگی کھینچا تانی ۔ گومگو ۔ ششں و پنج ۔ تذبذب۔

مرزا صاحب عالم تخیل میں اپنے محبوب کو پکڑ لائے ہیں اور وہ ان کے قریب بیٹھا ہوا ہے اب مرزا صاحب کا عالم یہ ہے کہ ادھر ادب دست درازی و دامن گیری میں مانع ہے اور یہ اُتر دکھن منہ کئے بیٹھے ہیں اُدھر محبوب کا رُخ پورب پچھم ہے اور حیا اُن کو کچھ کہنے سے روک رہی ہے وہ حالت تذبذب میں خاموش ہیں کہ اچھا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ ان پر اداب مجلسی مسلط ہیں اور وہاں ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ بلائے کس مقصد سے گئے ہیں وہ دونوں کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا ہونے والا ہے کیونکہ فریقین پر ایک ہی طرح کی کیفیت طاری ہے اور سارا کام کھٹائی میں پڑا ہے۔

تم ہی کہو کہ گذارا صنم پرستوں کا بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو

صنم پرست ۔ عاشق :۔ بت ۔ معشوق :۔ گذرا کیوں ہو ۔ زندگی کیسے بسر ہو ۔ کیسے زندہ رہیں۔

مرزا صاحب کا بغیر محبوب کے زندہ رہنا مشکل ہو گیا ہے اور مرزا صاحب کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا ہے کہ بغیر اس کے زندگی کیسے گذاری جائے کیوں کہ اُس کی مہربانی اور رحم و کرم کی غذا پر اِن کی زندگی کا دارو مدار ہے

ایک دن نہ جانے کیسے یہ اُسے پکڑ لائے اور بولے کہ حضرت ایک بات اِس خاکسار کی بھی سُن لیجئے اُس کے بعد جو مناسب صورت سمجھ میں آئے کیجئے گا اُس نے کہا فرمایئے۔ بولے یہ تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہی ہے کہ ہم عشاق آپ ہی کی مہربانیوں کے بل بوتے پہ زندہ ہیں اور آپ ہی کے دیدار کی معجون استعمال کر کے اپنی گذر بسر کر رہے ہیں لہذا اگر آپ نے اپنی مہربانیوں کا راشن ہم پر بند کر دیا تو ہم اِس راشن کارڈ کو لئے کہاں جائیں اور ہماری زندگی کیوں کر بسر ہوگی اور اس تضیع اوقات کا ہرجہ خرچہ کون دے گا۔

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

مرزا صاحب کی قسمت تارکول کے قلم سے لکھی گئی تھی لہذا ساری زندگی سیاہ بختی میں بسر ہوئی چنانچہ فرماتے ہیں کہ اگر مجھ سا روز سیاہ کسی کو نصیب ہو تو اُس دن کی سیاہی کے مقابلے میں رات کی تاریکی شرما جائے اور وہ شخص رات کی تاریکی کو دن کی روشنی سمجھنے لگے بھلا غور تو فرمایئے کہ اُس دن کی سیاہی کیسی ہوگی جس کے آگے رات بھی دن معلوم ہو۔ یہ واقعہ ہے کہ مرزا صاحب پر اُن کے محبوب نے ایسے مظالم توڑ رکھے تھے کہ اِن کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہو گئی تھی اور ان کو دن میں تارے نظر آنے لگے تھے اِن کو اس کی خبر نہ رہتی تھی کہ رات کب آئی اور دن کب ختم ہوا یہ مُراقبہ میں پڑے آنکھیں بند کئے محبوب کے تصور میں غرق رہا کرتے تھے اور ان کے لئے رات اور دن سب برابر تھے۔ گویا محبت نے اُن کو ایک اندھے کنوئیں میں قید کر دیا تھا۔

ہمیں پھر اُن سے اُمید اور اُنھیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیوں کر ہو

بات پوچھنا: خبر لینا کسی کی طرف التفات کرنا۔ عزت سے پیش آنا۔

مرزا صاحب اپنے محبوب کی بے التفاتی سے حد درجہ دل برداشتہ تھے چنانچہ آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ بجائے محبوب سے عشق کرنے کے بہتر صورت یہ ہے کہ اُس سے مستقل طور پر نکاح کر لیا جائے کیونکہ صرف نکاح ہونے کے بعد ہی اِن کی وفاشعاری اور اُس کی بے التفاتی کی شکایت رفع ہو سکتی ہے لہذا فرماتے ہیں کہ حقوق سے ہم نے مہربانی کی اُمید کی ہے اور معشوق کو ہماری وفاداری اور محبت کی قدر صرف ایک ہی چیز سے ہو سکتی ہے وہ یہ کہ معشوق ہماری طرف التفات کر لے اُس کے التفات اور خبر گیری کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہم کو اُس کی ذات سے توقع وابستہ ہو گی اور وہ ہمارے حالات سے واقف ہو کر ہماری وفاشعاری اور جاں نثاری کی قدر کرے گا یہ صورت بہر حال اُسی وقت ممکن ہے جب مرزا صاحب کا نکاح اُن کے ساتھ پڑھوا دیا جائے تاکہ اُن کی ذات سے اُس کو توقع وابستہ رہے کہ یہ جو کچھ کما کر لائیں وہ مستقل طور پر ماہ بماہ اُس کے ہاتھ میں رکھ دیں اور اس کے جواب میں وہ مرزا صاحب کے کھانے پینے کا انتظام کرنے اور ناز برداشت کرنے کو تیار ہو جائیں گی۔

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا
نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو

دیدار جو : دیدار طلب ۔

قدرت نے جب عشاق کو پیدا کیا تھا تو یا تو اُن کو دل نہ دیا ہوتا یا آنکھیں نہ دی ہوتیں کیونکہ یہی دونوں چیزیں عشاق کو تمام عمر مصیبت میں مبتلا رکھتی ہیں اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کی مُراد پوری ہوجاتی اور دوسرے کی نہ پوری ہوتی تو آپس میں سخت دھینگا مشتی شروع ہو جاتی ۔ چنانچہ مرزا صاحب کے یہاں بھی ان دونوں چیزوں کی موجودگی سے تمام عمر دھینگا مشتی اور لڑائی ہوتی رہی جس کی وجہ سے مرزا صاحب کو سکون میسر نہ ہوا ۔ مرزا صاحب کو خیال تھا کہ اگر ان کا محبوب ایک آدھ خط دوسرے تیسرے مہینے ان کو بھجوا دیا کرے تو ان کے دل کو تسکین اور تشفی حاصل ہو جائے چنانچہ ایک دن محبوب نے ان کے نام خط لکھ دیا اور انھیں اطمینان ہوگیا مگر جب دل کی مراد پوری ہونے کی اطلاع ان کے دیدے کو پہنچی تو وہ اپنی جگہ پر مارے غصے کے آپے سے باہر ہوگیا اور اُس نے اپنی اگاڑی پچھاڑی تڑانا شروع کردی اور مرزا صاحب کو دھمکے دینا شروع کئے کہ صاحب آپ نے دل کی آرزو تو پوری کردی ۔ اب ہم بھی اپنے محبوب کی دید کے بغیر نہیں رہ سکتے ۔ مرزا صاحب دل اور دیدے کی اس لاگ ڈانٹ کے سبب سخت مصیبت میں پڑ گئے کہ اب کریں تو کیا کریں غرض اس شعر کا اصل مقصد یہ ہے کہ عاشق کو کسی طرح سکون میسر نہیں ہوتا ۔

مجھے جنوں میں غالبؔ دلے بقولِ حضور   فراق یار میں تسکین ہو تو کیوں کر ہو

مرزا صاحب کے بارے میں اِن کے محبوب کا خیال ہے کہ اُن کا دماغی توازن بگڑا ہوا ہے اور یہ پاگل ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے رات دن کھانا پینا چھوڑے ہوئے ہیں چنانچہ اُس نے ایک دن اُن کو بلا کر کہا کہ حضرت آپ اپنے دماغ کا علاج کیجئے ورنہ گھر بھر تباہ ہو کر رہ جائے گا اور اسی طرح آپ کی ساری زندگی آوارہ گردی میں بسر ہو گی، مگر مرزا صاحب نے عرض کی کہ حضورِ والا اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ یہ جو آپ میری حالت دیکھ رہے ہیں اُس کی وجہ آپ کی جُدائی ہے جس کے سبب ہم رات دن آہ و زاری کرتے ہیں اور پھیکے نالے اور سیٹھی آہیں براڈکاسٹ کرتے ہیں۔

غزل نمبر ۱

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

سُبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو؟

خو = عادت یا خصلت۔ وضع = طرز یا روش۔ سُبک سر = ذلیل۔
سرگراں = ناراض ہونا یا خفا ہونا۔

مرزا صاحب کہتے ہیں کہ جب تک وہ ہمیں دیکھ کر مارے غصّے کے لال بھبوکا ہو جانا نہیں چھوڑیں گے اُس وقت تک ہم نے بھی یہ طے کر لیا ہے کہ ہم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئیں گے مرزا صاحب کا یہ فرمانا حق بجانب ہے کیونکہ مرزا صاحب نے بھی تمام عمر اُن کے ہاتھوں ہر قسم کے جور و تشدد برداشت کئے تھے مگر زبان پر حرفِ شکوہ نہیں لائے تھے اور اُن کی

وفاؤں کا جہاں تک تعلق ہے وہ اپنے اصول پر قائم رہے تھے اب اُن کا بلاسبب مرزا صاحب سے ملنا جلنا ترک کر دینا اور مرزا صاحب کو حقیر و ذلیل سمجھنا حقیقتاً بڑی زیادتی تھی آخر پیر کی چیونٹی بھی ہوتی ہے تو جب اُس پر دباؤ پڑتا ہے تو کاٹ کھاتی ہے لہذا مرزا صاحب جو ترک النسل تھے وہ بھی محبوبہ کی اس حرکت پر بگڑ بیٹھے اور اُن کی رگ حمیت بھی بھڑک اٹھی۔

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو ۔ نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

مرزا صاحب کی شرافت ملاحظہ ہو کہ اُنھوں نے محبوب کا تیر نظر کھایا اور کلیجہ مسوس کر بیٹھ گئے۔ گھر والی تک سے اس کا ذکر نہ کیا اور برداشت کی حد ملاحظہ ہو کہ اس کے بعد بھی محبوب کے ہر زم و گرم کو سہتے رہے اس پر ان کے دوستوں میں ایک صاحب جو حد درجہ رقیق القلب واقع تھے ایک دن مرزا صاحب سے ملنے آئے۔ اُس وقت اتفاق سے مرزا صاحب اپنے گھاؤ کی گہرائی کا معائنہ کر رہے تھے ان کی نگاہ جو مرزا صاحب کے گھاؤ پر پڑی تو اُنھوں نے حلق پھاڑ کر چلانا شروع کر دیا کہ لوگو دوڑو مرزا صاحب کے یہ کیا ہو گیا اس پر اندر سے گھر والی ننگے پاؤں دوڑیں اور اُنھوں نے جو سینہ پر کا ایک پورا بوٹا کا بوٹا غائب دیکھا تو لگیں مرزا صاحب کی محبوبہ کو ہزاروں صلواتیں سُنانے اور اُنھوں نے محلہ والیوں کو جمع کر کے کہنا شروع کیا اے لوگو دیکھو کیا نگوڑی نے اچھے بھلے مردوے کو بھنبھوڑ لیا ہے۔ خدا سمجھے اس نگوڑی کو جو اس طرح دوسروں کے مردوؤں کو کاٹتی پھرتی ہے۔ جب اس واقعہ کی اطلاع مرزا صاحب کی محبوبہ کو ہوئی کہ خلقِ خدا ان کو کن الفاظ میں یاد کر رہی ہے تو وہ بالکل

آپے سے باہر ہوگئیں اور مرزا صاحب کو لگیں الٹی سیدھی صلوٰتیں سنانے حالانکہ اس میں مرزا صاحب کی کوئی خطا نہ تھی بلکہ ساری غلطی ان کے دوست کی تھی جو اس درجہ رقیق القلب واقع ہوئے تھے کہ انھوں نے ہلڑ مچا دیا مگر کوچۂ عشق میں تو ہمیشہ سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے کہ کرے داڑھی والا اور پکڑا جائے مونچھوں والا۔ اس شعر میں مرزا صاحب صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ جو مظالم اس عشق کے کوچہ میں ہم نے اٹھائے، ایسا وہ اللہ کسی دشمن سے نہ اٹھوائے حقیقت یہ ہے کہ مجنوں علیہ الرحمتہ بھی ہوتے تو وہ بھی چیخ کر بھاگ جاتے۔ پھر لطف یہ کہ اتنا بڑا گھاؤ کھانے کے بعد اُسے خاموشی سے برداشت کرنا اور چھپائے رکھنا یہ ہر بدھو تھو کے بس کی بات نہیں ورنہ کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا

تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

مرزا صاحب نے ان دو مصرعوں میں عشق و وفا جور و تشدد و بے التفاتی و بے اعتنائی محرومی اور مایوسی کی پوری داستان بیان کر دی ہے۔ چونکہ ان کی محبوبہ نے ان کی طرف سے مستقل طور پر بے اعتنائی برتنا شروع کر دی تھی اس لئے اُن کی بے مہری سے تنگ آکر مرزا صاحب بازار سے افیون خرید لائے ہیں اور انھوں نے طے کر لیا ہے کہ اب ہم دن دھاڑے خودکشی کر کے اپنی جان دے دیں گے لیکن پھر خیال آیا کہ یار اگر گھر پر خودکشی کی تو سالے گھر والوں کو پولیس والے دھر لیں گے۔ چنانچہ یہ سوچ کر کہ آخر ان محترمہ کو بھی تو اس بے اعتنائی کی سزا ملنا چاہئے، مرزا صاحب تجہیز و تکفین کا بکھیڑا

انتظام کر کے کوچۂ محبوب کو روانہ ہوئے اور ان کے پاس لکھ کر بھیجا کہ حضور! اگر زحمت نہ ہو تو اس تابعدار کو سنگ آستانہ سے سر پھوڑنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔

جب مغلانی نے یہ خط اُن محترمہ کو دیا اور ان کو معلوم ہوا کہ مرزا صاحب کا خط ہے تو ان کے مرچیں ہی تو لگ گئیں۔ اس پر مغلانی نے چلتے پر یہ کہہ کر اور تیل چھڑک دیا کہ سرکار مرزا صاحب کفن باندھ کر مرنے کی پوری تیاری کر کے آئے ہیں اگر خدانخواستہ کچھ کر بیٹھے تو گھر بھر کھنچا کھنچا پھرے گا۔ اس پر انھوں نے کہلوا بھیجا کہ مرزا صاحب سے کہہ دو کہ خیریت اسی میں ہے کہ فوراً یہاں سے چلے جائیں۔ ہمارا کوچہ کوئی مرگھٹ یا قبرستان نہیں ہے جہاں مرنے تشریف لائے ہیں۔ مرزا صاحب جن کی ساری زندگی وفاداری میں گذری تھی یہ سُن کر بالکل ہی آپے سے باہر ہو گئے۔ کپڑے وپڑے اتار کر دہیں پھینکے اور بولے کہ اجی جہنم میں جائے اُن کا حسن اور ان کے نخرے غمزے۔ اگر وہ اپنے اوپر مرنے کی اجازت نہیں دیتیں تو ہم کسی اور پر مریں گے۔ ان کی ایسی ایک نہیں ہزاروں اس دلّی جیسے شہر میں موجود ہیں لہٰذا جب مرنا ہی ہے تو یہ کہاں سے رنگا کر آئی ہیں جو انھیں پر جان دی جائے۔

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہو جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مرزا صاحب جس زمانے میں کلکتہ تشریف لے گئے تھے اور وہاں اپنے مقدمے کے سلسلے میں مقیم تھے کہ ایک دن ایک صاحب دلّی سے کلکتہ پہنچے

مرزا صاحب نے اُن سے دریافت کیا کہ کہیئے حضنت! دلّی کا کیا حال ہے؟
اُنھوں نے کہا کہ دلّی میں شدید بارش ہو رہی تھی جس سے لاکھوں مکانات منہدم
ہو گئے تھے اُس میں ایک مکان مرزا صاحب کا بھی تھا مگر یہ شخص جانتا تھا
کہ اگر مرزا صاحب کو فوراً یہ بتا دیا گیا کہ ان کا مکان بھی بارش سے منہدم
ہو گیا ہے تو نجانے ان کے دل پر کیا گزرے۔ چنانچہ انھوں نے کہا کہ حضنت!
ادھر کچھ دلّی میں تیز بارش ہوئی تھی جس سے دس پانچ مکان منہدم ہو گئے
اس پر مرزا صاحب بولے کہ احاطہ کالے صاحب کی طرف مکانوں کا کیا
حال ہے؟ اُس نے عرض کی کہ ہاں اُدھر بھی دس بیس مکانات گرے
ہیں مگر مرزا صاحب کو اس کے رک رک کر بیان کرنے پر شبہہ سا ہوا اور
وہ تاڑ گئے کہ ہمارا مکان بھی یقیناً لپیٹ میں آگیا ہے اور یقین نہ آنے کی
کوئی وجہ بھی نہ تھی کیونکہ جس مکان میں مرزا صاحب رہتے تھے اُس کے مالک
مکان نے اس وجہ سے اُس کی مرمت ایک عرصہ سے نہیں کرائی تھی کہ اُس
کا کرایہ ایک زمانے سے رُکا ہوا تھا۔ کیونکہ پنشن بند ہونے کے سبب
مرزا صاحب اس کا کرایہ ادا کرنے سے قاصر تھے۔ لہٰذا وہ مکان نہایت بوسیدہ
اور سڑا ہوا تھا اور اُس کے در و دیوار ہر وقت پکار پکار کر لوگوں سے
کہا کرتے تھے کہ کوئی اللہ کا بندہ ہم کو اتار لے۔ بہر حال دوست کی زبانی
حالات سُن کر مرزا صاحب پر اگرچہ یاس کا عالم طاری تھا مگر خبر بد سننے سے
حد درجہ گریز کر رہے تھے چنانچہ اور بار بار پوچھتے رہے کہ وہ مکانات
جو گرے ہیں ان کے بارے میں کچھ مزید اطلاع ہے؟

مرزا صاحب نے اُن سے دریافت کیا کہ کہئے حضرت! دلی کا کیا حال ہے؟ اُنھوں نے کہا کہ انہیں دنوں دلی میں شدید بارش ہو رہی تھی جس سے لاکھوں مکانات منہدم ہو گئے تھے اُس میں ایک مکان مرزا صاحب کا بھی تھا مگر یہ شخص جانتا تھا کہ اگر مرزا صاحب کو فوراً یہ بتا دیا گیا کہ ان کا مکان بھی بارش سے منہدم ہو گیا ہے تو نجانے ان کے دل پر کیا گزرے۔ چنانچہ انھوں نے کہا کہ حضرت! ادھر کچھ دلی میں تیز بارش ہوئی تھی جس سے دس پانچ مکان منہدم ہو گئے اس پر مرزا صاحب بولے کہ احاطہ کالے صاحب کی طرف مکانوں کا کیا حال ہے؟ اُس نے عرض کی کہ ہاں اُدھر بھی دس بیس مکانات گرے ہیں مگر مرزا صاحب کو اس کے رک رک کر بیان کرنے پر شبہہ سا ہوا اور وہ تاڑ گئے کہ ہمارا مکان بھی یقیناً لپیٹ میں آ گیا ہے اور یقین نہ آنے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی کیونکہ جس مکان میں مرزا صاحب رہتے تھے اُس کے مالک مکان نے اس وجہ سے اُس کی مرمت ایک عرصہ سے نہیں کرائی تھی کہ اُس کا کرایہ ایک زمانے سے رُکا ہوا تھا۔ کیونکہ پنشن بند ہونے کے سبب مرزا صاحب اس کا کرایہ ادا کرنے سے قاصر تھے۔ لہٰذا وہ مکان نہایت بوسیدہ اور سڑا ہوا تھا اور اُس کے در و دیوار ہر وقت پکار پکار کر لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ کوئی اللہ کا بندہ ہم کو اتار لے۔ بہر حال دوست کی زبانی حالات سُن کر مرزا صاحب پر اگرچہ یاس کا عالم طاری تھا مگر خبر بد سننے سے حد درجہ گریز کر رہے تھے چنانچہ اور بار بار پوچھتے رہے کہ وہ مکانات جو گرے ہیں ان کے بارے میں کچھ مزید اطلاع ہے؟

اس کے بعد پوچھنا شروع کیا کہ کہئے پاس والے چُنّی جان کے مکان کا کیا حال ہے؟ ، اُس کے بعد جب اُس نے کہا کہ وہ منہدم ہو گیا تو بولے بلاقی حجام کا مکان تو بخیریت ہے اس نے کہا کہ وہ بھی بارش کے نذر ہو گیا۔ اس کے بعد مرزا صاحب نے اپنے مکان سے جو بالکل متصل مکان تھا اس کی خیریت دریافت کی اور اس طرح اُنھیں یقین ہو گیا کہ ان کا مکان بھی گر گیا ہے۔
اور اس سارے مکالمہ کا مقصد صرف خبر بد سے بچنا تھا۔

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تم ہی تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

مرزا صاحب دن رات اپنے محبوب کو اپنے تخیل میں لبائے رکھتے تھے اور ہر وقت اُس کی تصویر ان کی آنکھوں میں پھرتی رہتی تھی مگر اس کے باوجود اُن کی محبوبہ ایسی ظالم اور جابر واقع ہوئی تھی کہ جب مرزا صاحب کی طرف سے نکلتی تو برقعہ میں نکلتی۔ اس پر ایک دن جب وہ مرزا صاحب کی بیٹھک کے بالکل سامنے سے برقع پہنے گذرنے لگی تو مرزا صاحب نے اُن کو دیکھ کر کہا کہ حضت یہ آپ کی کون سی ادا ہے کہ آپ ہم سے پردہ کرتی ہیں حالانکہ آپ کی تصویر ہماری آنکھوں میں بسی ہوئی ہے اور ہم آپ کے جسم کے ایک ایک روئیں کو پہچانتے ہیں اگر کسی مولوی سے اس شعر کا مفہوم دریافت کیا جائے تو وہ براہ راست کہہ دے گا کہ یہ شعر اللہ میاں سے متعلق ہے جو رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں؟ اور جن کا خیال ہر وقت انسان کے دل میں رہتا ہے اور جس سے کوئی انکار بھی نہیں کر سکتا۔

مگر حیرت اس بات پر ہے کہ اس درجہ قریب ہونے کے باوجود تم نظر نہیں آتے ۔

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے   ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

تمام شعراء اس معاملہ میں متفق الرائے ہیں کہ دنیا میں جتنی تباہیاں آتی ہیں اُس کا ذمہ وار وہ تنبو ہے جو آسمان کی شکل میں ہمارے آپ کے سروں پر تنا ہوا ہے اور ہر عاشق اپنی خانہ ویرانی کا ذمہ دار آسمان ہی کو قرار دیتا ہے مگر مرزا صاحب اپنی تباہی کے معاملہ میں آسمان سے بھی دس ہاتھ آگے نکل گئے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آسمان تو محض برینائے دشمنی آفتیں لاتا ہے مگر ہماری محترمہ کی دوستی تو آسمان کی دشمنی تک کی دُم پر پیر رکھے ہوئے ہے اور جن صاحب کو یقین نہ ہو وہ آپ سے دو ایک منٹ کی عشق فرما کر دیکھ لیں تو ہی جو دن میں تارے نہ نظر آجائیں اور اُس دن سے یقین نہ ہوجائے کہ محترمہ کی دوستی کے آگے آسمان کی دشمنی لونڈا ہے کیونکہ جس سے جس سے آپ نے دوستی فرمائی اُس سے آسمان نے یہ کہہ کر دشمنی کرنا بند کردی کہ ہم دشمنی میں ایسی دولتیاں کیا ماریں گے جو دوست بن کر وہ اپنے دوستوں کے دن رات رسید کرتی ہیں اور ان پر مصائب کے پورے پورے ہمالہ پہاڑ برساتی رہتی ہیں ۔ اس پر مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ کتنے شرم کی بات ہے کہ نکاح تو اُن کے ساتھ فرمالیا اور خیریت پوچھنے والوں میں ایک ہم رہ گئے ہیں گویا اچھا اچھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو ۔ بھلا یہ بتایئے ہماری وفاداری کی آزمائش ہو رہی ہے یا ہم کو دیدہ و دانستہ ذلیل کیا جارہا ہے اِس شعر میں مرزا صاحب نیا دوالوں

سے اس کا انصاف چاہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ بھی کوئی آزمائش میں آزمائش ہے کہ نکاح تو دشمن سے کئے بیٹھی ہیں اور خیریت ہم سے پوچھوا رہی ہیں۔ یہ تو ظلم ہوا نہ کہ آزمائش۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو ظلم و تشدد کرکے ذلیل کرانا کس کو کہتے ہیں؟

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

مرزا صاحب کی محبوبہ نے ایک نہایت "ناہموار" قسم کے انسان سے تعلقات قائم کر رکھے تھے اور اس کی جملہ حرکتوں سے مرزا صاحب بخوبی واقف تھے چنانچہ ایک دن جب مرزا صاحب سے ان کی محبوبہ ملیں تو انھوں نے کہا اگر گستاخی معاف اب آپ رقیب سے نہ ملا کیجئے کیونکہ رقیب سے ملنے میں آپ کی بڑی رسوائی ہو رہی ہے چنانچہ آج ہی گڑبڑ کبڑیے (سبزی فروش) کی دکان پر اسی کا ذکر چھڑا ہوا تھا کہ آپ کے تعلقات ایک نہایت "ناہموار" قسم کے آدمی سے ہیں جو نہ جانے آپ کے بارے میں کیسی کیسی باتیں مشہور کئے ہے۔ اس پر ان کی محبوبہ نے کہا کہ اس میں رسوائی کی کیا بات ہے؟ اس پر مرزا صاحب نے کھسیا کر طنزیہ انداز میں کہا۔ "بالکل صحیح بجا فرمایا آپ نے" ذرا مکرر ارشاد ہو۔ سبحان اللہ سبحان اللہ! اس شعر میں مرزا صاحب ناراض ہو کر اس کے قول کو دہرا رہے ہیں۔

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب تیرے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

جب سیدھی انگلیوں گھی نہیں نکلتا تو مجبوراً انسان کو ٹیڑھی انگلیوں گھی نکالنا پڑتا ہے۔ مرزا صاحب نے زندگی بھر محبوب کی خوشامد کی اور ساری زندگی

ان کے پیر دھو دھو کر پیے مگر جب چاپلوسی کرتے کرتے تھک گئے تو انھوں نے آخر میں طنز کا حربہ استعمال کرنا شروع کیا۔ مرزا صاحب جانتے تھے کہ اگر وہ آم کہیں گے تو وہ املی کہے گا لہذا چلو اُسے بے وفا بے مروت اور نامہربان کہہ کر دیکھو شاید اس کہنے پر وہ منفعل ہو کر اور محض ضد میں مہربانی کرنا شروع کر دے لیکن مرزا صاحب کی یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی بلکہ وہ ان کے اس کہنے پر اور زیادہ ناراض ہو گیا اور اس نے اُن پر اور زیادہ سختیاں کرنا شروع کر دیں۔

غزل نمبر ۱۱

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

مرزا صاحب اپنی گلی کے رہنے والوں سے حد درجہ بیزار اور تنگ تھے کیونکہ سویرے سے شام تک دیاں ماں پدر رہا کرتی تھی جس سے مرزا صاحب کے لکھنے پڑھنے میں سخت خلل واقع ہوتا تھا۔ دوسرے سویرے سے شام تک قرض خواہوں کا ایک تانتا بندھا رہتا تھا۔ تیسرے دوست احباب سویرے سے شام تک اُن کی "کال بل" CALL BELL بجا بجا کر ان کا ناطقہ بند کئے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ جس مکان میں وہ رہتے تھے اُس کا ایک مدت سے کرایہ بھی ادا نہیں ہوا تھا۔ پڑوس میں جو مکان تھا وہاں بھی دو چار نہایت بُری قسم کی عورتیں رہتی تھیں جن سے اُن کی بیگم صاحبہ کی نہیں بنتی تھی۔

ڈیوڑھی پر جو پہرہ دار تھا وہ بھی تنخواہ نہ ملنے کے سبب مرزا صاحب سے زبان لڑانے لگا تھا اور گھر کے آدمی جن جو بیماری کے عالم میں مرزا صاحب کی تیمار داری کرتے تھے اُن کی تنخواہیں بھی مرزا صاحب پر واجب الادا تھیں چنانچہ ان قطع بند اشعار میں مرزا صاحب نے اپنے گھریلو حالات کے پیش نظر اپنے لئے یہی بہتر سمجھا کہ جامعہ ملیہ یا قطب مینار کے نواح میں کسی جھونپڑے وغیرہ میں چل کر رہا جائے تاکہ انھیں مذکورہ بالا زحمتوں سے نجات حاصل ہو جائے اور وہ پرسکون زندگی بسر کر سکیں۔

ردیف ہ

غزل نمبر ۱

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ　　طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

دل ایک کثیر المعنی لفظ ہے اہل تصوف دل سے نور بصیرت مراد لیتے ہیں بہرحال ہم کو مولویوں کے معاملات میں دخل نہیں دینا ہے۔

اس شعر میں مرزا صاحب کو ہر طرف عشق کی ہریالی نظر آرہی ہے کسی نے ایک مفلس سے سوال کیا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟ اُس نے جواب دیا کہ "چار روٹیاں"۔ یہی حال اس شعر کا ہے کہ دل چونکہ شاعروں کے نزدیک ایک آئینہ ہوتا ہے اور اُس میں اُن کو ہمیشہ اپنے محبوب کے مختلف پوز نظر آتے ہیں اس لئے آفتاب سے لے کر ذرہ تک ہر چیز میں اُنہیں اپنا دل نظر آرہا ہے اور اس دل میں ان کے محبوب کا فوٹو چسپاں ہے۔ طوطی سے مراد ان

کی محبوبہ کی کوئی ہجولی ہے جو اچھی خاصی صورت شکل کی ہوگی۔ اور اپنی جوانی میں کوئی خاص شہرت رکھتی ہوگی۔

غزل نمبر ۲

ناچار بیکسی کی بھی حسرت اٹھائیے دشواریٔ رہ وستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

یہ واقعہ ہے کہ یتیم اور مفلس یا بیکس کا دنیا میں کوئی شریک نہیں۔ جدھر نکل جائیے۔" ٹھڑی ٹھڑی" ہوتی ہے۔ مرزا صاحب کیا کوئی بھی اس کا ساتھ دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ مرزا صاحب اپنے محبوب کو رام کرنے کیلئے سوچے کچھ آب یتیموں۔ بیکسوں اور لاچاروں کی شکل بنا کر دیکھا جائے شاید اسے ترس آجائے۔ چنانچہ مرزا صاحب نے قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر بیکسوں کا میک اپ کیا اور جب اصل سے اپنے کو ملا دیا تو بیکس بنکر کوچۂ محبوب میں میک اپ کرنے کے باوجود وہاں پہچان لئے گئے اور محبوب کی ڈیوڑھی سے مغلانی نے اندر پکار کر کہا کہ بیگم صاحبہ آج شیر گدھے کی کھال اوڑھ کر آیا ہے یعنی مرزا صاحب بیکسوں کا سوانگ بھر کر تشریف لائے ہیں چنانچہ مرزا صاحب کی یہ آرزو بھی پوری نہ ہوئی اور اس میں بھی ان کی محبوبہ کی مغلانی نے اُن کو چوٹ دے ہی دی،

ردیف ی

غزل نمبر ۱

ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق یعنی ہنوز منتِ طفلاں اٹھائیے

برات: وثیقہ، چیک۔ براتِ معاش: تنخواہ کا چیک۔

مرزا صاحب جب عشق کے چکر میں مبتلا ہوئے اور محبوب کی یاد میں صحرا نوردی اختیار کی تو بچوں نے اُن پر پتھر پھینکنا شروع کئے۔ ظاہر ہے جنونِ عشق میں کوئی پلاؤ زردہ تھوڑے بٹتا ہے اس کی آمدنی یا معاش یہی پتھر ہوتے ہیں چنانچہ یہ تنخواہ نہایت پابندی سے گلی کوچہ کے لڑکے ہر مجنوں اور پاگل انسان کو دیا کرتے ہیں مرزا صاحب چونکہ عشق میں ہر سختی کو ایک نعمت سمجھتے ہیں اس لئے لونڈوں کی اِس ڈھیلے بازوں کو بھی اُن کا احسان عظیم تصور کرتے ہیں۔

یا مرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجئے　　یا پردۂ تبسمِ پنہاں اٹھائیے

زخمِ رشک ۔ مراد صرف رشک ہے کیونکہ زخم سے بھی انسان کو تکلیف ہوتی ہے اور رشک سے بھی اس لئے زخم سے تشبیہ دی گئی ہے یہ ایسی ہی ترکیب ہے جیسے گلِ عارض وغیرہ، اس شعر میں "زخم" لانے کی دوسری وجہ یا لفظ تبسم کی رعایت ہے۔ زخم اور خندہ میں کشادگی وجہ تشبیہ ہے۔ تبسم پنہاں = پوشیدہ طور پر ہنسنا یا چپکے چپکے بلا سبب مسکرانا پردہ اٹھانا = بے تکلف ہونا۔ بات نہ چھپانا = بھید کھولنا۔

مرزا صاحب بلا کے شکی مزاج واقع ہوئے تھے معلوم نہیں گھر والی کے ساتھ اِن کا کیا برتاؤ رہا ہوگا جبکہ محبوبہ کے ساتھ اِن کے شک کا یہ عالم ہے کہ اگر وہ اپنی سہیلیوں کے متعلق کوئی بات سوچ کر مسکراتی نظر آتی ہے تو مرزا صاحب کو یہی شبہ ہوتا ہے کہ رقیب کی کوئی بات اُسے بہت اچھی معلوم ہوئی ہے جس کی بنا پر وہ ہنس رہی ہے چنانچہ ایک دفعہ مرزا صاحب نے جو اُنھیں

تنہائی میں کسی بات پر مسکراتے دیکھ لیا تو اسے دیکھ کر آپ فرماتے ہیں ہو نہ ہو یا تو رقیب کے نوچنے کھسوٹنے میں ان کو مزہ آیا ہے جس پر سوچ سوچ کر مسکرا رہی ہیں اور گندی ہوئی باتوں کے مزے لے رہی ہیں یا مجھ سے کوئی حماقت سرزد ہوگئی ہے جس کی بنا پر ان کو ہنسی آرہی ہے یہ سوچ کر مرزا صاحب محبوبہ کے پیچھے پڑ گئے۔ مرزا صاحب کی کھال کچھ اتنی زیادہ نازک تھی کہ چھری یا دھاردار چیز تو الگ رہی اس پر اگر کوئی سخت بات کہی جاتی تو اس کا چرکہ۔۔ لگ جاتا تھا چنانچہ رشک کا چرکا کھانے کے بعد آپ اب اُنکے (محبوبہ) پاس جاکر غلط فہمی دور کرنا چاہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ صاحب صاف صاف بتائیے کہ آج آپ مسکرائیں کیوں؟ آپ کی مسکراہٹ کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں اول رقیب کی کسی بات پر خوش ہونا یا ہماری کسی حماقت پر مسکرانا لہٰذا یا تو آپ ہمارے گمان کو دلائل و براہین سے جھٹلائیے یا پھر ہم کو رقیب کے سلسلے میں جو رشک ہوا ہے اُس کو بے بنیاد کہہ کر ذلیل و رسوا کیجئے۔ جب جب تک آپ صاف صاف نہ بتائیں گی میں اسی طرح تڑپتا رہوں گا آخر معلوم تو ہو کہ یہ چھپ کر مسکرانا کیا معنے؟ اے آپ کو مسکرانا تھا تو ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی ہوتیں۔

غزل نمبر ۲

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے   بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہیئے

خرابات = مے خانہ۔ بھوں = گمان ابرو۔ محراب۔ مسجد۔ آنکھ۔ چشم مخمور۔ مے خانہ۔ قبلہ حاجات = زاہد خشک۔

شعراء کا عام دستور ہے کہ وہ زاہدوں پر چوٹیں کرتے ہیں یا محتسب اور واعظ کے خلاف احتجاجی جلوس نکالا کرتے ہیں اور اُن پر پھبتیاں کستے ہیں اور محبوب کے قامت اور نشتر غمزوں کو نئی نئی تشبیہات اور استعارات کے ذریعے لوگوں سے روشناس کراتے ہیں مثلاً اُن کے ابرو کو مسجد کی لمبی چوڑی محراب سے تشبیہ دیتے ہیں اور آنکھ کو کبھی تاڑی خانہ یعنی مے خانہ بتاتے ہیں اور کبھی اُن کی پلکوں کو بھالے اور خنجر سے تشبیہ دیتے ہیں غرض محبوب عشق و محبت کی دنیا میں آنے کے بعد عشاق کے ہاتھ میں اندھے کے ہاتھ بیٹر یا بندر کے ہاتھ کھلونا بن کر رہ جاتا ہے چنانچہ اس شعر میں بھی مرزا صاحب اپنے محبوب کو لگتے پر چڑھا کر زاہد اور محتسب کو اس طرح تپاتے ہیں کہ وہ بوٹیاں نوچ کر رہ جاتے ہیں معلوم نہیں زاہد اور محتسب ان کی باتوں پر خوش ہوتے تھے یا دانت پیس پیس کر رہ جاتے تھے مگر یہ واقعہ ہے کہ سَو میں ننانوے زاہدوں کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ وہ مذہبی جھول ڈالنے کے بعد بھی حسینوں پر مسمریزم کی مشق فرماتے رہتے ہیں اگر مرزا صاحب محبوب کی آنکھ کو کسی زاہد کے سامنے یہ کہہ کر پیش کرتے کہ حضور قسم آپ کو اپنے زہد کی ایک نظر اُٹھا کر دیکھئے تو اگر محراب کے نیچے ہمارے محبوب کی آنکھ اچھا بھلا مے خانہ نہ نظر آئے تو دام واپس دوسرے وہ محبوب کی چشم مست کے جواز میں فرماتے کہ اے قبلۂ حاجات! مسجد کے ساتھ خرابات یعنی مے خانہ ایک ضروری اور لازمی شے ہے جس طرح روشنی اور تاریکی لازم و ملزوم ہیں اور چلم کا لطف بغیر حقّہ کے حاصل نہیں ہو سکتا اُسی طرح

ابرو کے نیچے خرابات چشم لگی ہوتی ہیں اگر ابرو کے ساتھ آنکھ نہ ہو تو چہرہ بالکل بے رونق معلوم ہو اُسی طرح مسجد کے مقابلے میں مے خانے کا ذکر کئے بغیر مسجد کی عظمت واضح نہیں ہوتی اگر سجدے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی محبت نہ ہو تو وہ نماز اور عبادت ناقص اور نامکمل ہے پس تحقیق سے ثابت ہوا کہ اگر ابرو کو کسی استرے سے صاف کر دیا جائے تو آنکھ کی ساری رونق ختم ہو جائے گی اور اگر ابرو کے نیچے کوئی کانی آنکھ لگی ہو تو ابرو کی خوبصورتی اور دلکشی ختم ہو جائے گی۔

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی ایک اور شخص پر آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیئے

مکافات = بدلہ

مرزا صاحب تو محبوب کے جور و تشدد سے برداشتہ خاطر تھے ہی اور برابر گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگتے رہتے تھے کہ اے پاک بے نیاز اس کی کسی ایسے کے ساتھ کرا دے جو اسے مارتے مارتے چھٹی کا دودھ یاد دلا دے چنانچہ مرزا صاحب کی یہ دعا اللہ تعالیٰ نے قبول کر لی اور اُن محترمہ کی محبت کی شادی (LOVE MARIAGE) ایک ایسے ظالم قسم کے پٹھان سے ہو گئی جس نے اُن کی ساری سینما بازی کی دلچسپیاں خاک میں ملا دیں اور ان پر وہ جور و تشدد کئے کہ ان کو واقعی چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ مرزا صاحب یہ سُنکر بہت خوش ہوئے کہ ہم نہ کہتے تھے کہ کنوارے پنے کے زمانے میں ہم پر اتنے ستم نہ توڑو، ورنہ ہمارا صبر رائے گاں نہ جائے گا چنانچہ اللہ تعالےٰ نے ہماری دعا قبول کر لی اور اُس کا بدلہ آپ کو مل رہا ہے اور جو جو جور و تشدد

آپ نے ہم پر کیے تھے وہی اب آپ پر ہو رہے ہیں۔

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لئے ہم مصوری　　تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

جب مرزا صاحب نے دیکھا کہ اُن کا محبوب کسی طرح ان کے قابو میں نہیں آرہا ہے تو کسی نے مرزا صاحب کو یہ پٹی پڑھادی کہ اُن محترمہ کو جن پہ آپ عاشق ہیں فوٹو کھنچوانے کا بڑا شوق ہے لہٰذا اگر آپ فوٹوگرافی اور مصوری سیکھ لیں تو اُن تک پہنچنے کا ایک بہانہ آپ کے ہاتھ آجائے گا۔ مرزا صاحب اپنے دوست کا یہ مشورہ سن کر بہت خوش ہوئے اور انھوں نے جلدی جلدی فوٹوگرافی اور مصوری سیکھ لی اور اس کے بعد اُن کی رسائی محبوبہ تک ہونے لگی بہرحال جیسے مرزا صاحب کے دن پھرے اللہ تمام عشاق کے دن پھرائے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو　　اِک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

نشاط = عیش = شادمانی۔ روسیاہ = گنہگار۔ ایک گونہ = تھوڑی سی۔

مرزا صاحب سے کسی نے آکر کہا کہ مرزا صاحب اب آپ کی عمر ایسی نہیں کہ آپ عشق و محبت میں اپنا وقت ضائع کریں یہ عمر تو ایسی ہے کہ آپ چِلّا کشی کرکے مراقبہ میں بیٹھیں اور اللہ ہو اللہ ہو میں زندگی گذاریں چنانچہ مرزا صاحب اس کے لیے تیار ہوگئے اور اُنھوں نے طے کرلیا کہ وہ پابندی سے مراقبہ میں بیٹھ کر اپنی بقیہ زندگی اللہ کی یاد میں گذار دیں گے مگر چونکہ مراقبہ کی عادت کبھی پڑی نہ تھی اس لئے انھوں نے دھڑ دھڑ اس بات کی کوشش کی کہ مراقبہ میں یکسوئی حاصل ہو اور دیگر دیات زمانہ کی طرف سے اُن کے خیالات پھر جائیں مگر اس میں اُن کو کامیابی نہیں ہوئی اس وجہ سے

کہ ساری زندگی تو رندی میں گذری تھی اور ساری عمر حسینوں میں بسر ہوئی تھی لہذا جب مراقبہ میں بیٹھے تو ایک دم خیالات کسی محبوب کے کوچے میں پہنچ جاتے۔ مرزا صاحب سوچتے کہ لاؤ شراب پی کر مراقبہ میں بیٹھا جائے شاید اُس سے تھوڑی بہت یکسوئی حاصل ہو۔ چنانچہ اُنھوں نے ایسا ہی کیا اور شراب پی کر مراقبہ میں بیٹھے اِس پر جن لوگوں نے اِن کو شراب پیتے دیکھا تھا مرزا صاحب سے آکر کہا کہ جناب یہ کون سی حرکت تھی اِس پر مرزا صاحب نے جواب دیا کہ قسم آپ کے سر عزیز کی میری مے نوشی عیش و نشاط و کیف و سرور کی خاطر نہیں بلکہ میں شراب اِس لئے پیتا ہوں کہ ہر وقت خود فراموشی کے عالم میں رہوں اور یکسوئی کے ساتھ مراقبہ میں اللہ اللہ کر سکوں۔

غزل نمبر ۴۶

رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے

تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

مرزا صاحب کو کسی نے مشورہ دیا کہ صاحب یہ جو آپ محبوب کی ہر وقت خوشامد درآمد کیا کرتے ہیں اِس چیز نے بھی اُس کے دماغ کو خراب کر رکھا ہے۔ لہذا آپ ایک دن اُتار کھڑا رے کر پڑے رہیئے اور ذرا اپنے آپ کو لئے دیئے رکھئے شاید اُس سے اُس پر کوئی اثر پڑے اور وہ سارے شتر غمزے بھول جائے چنانچہ مرزا صاحب محبوب کی خدمت میں جب اس کے بعد تشریف لے گئے تو آپ نے یہی نسخہ استعمال کیا اور دیر تک منھ پھیلائے بیٹھے رہے نہ منھ سے بولے اور نہ سر سے کھیلے اِس پر اس نے کہا

کہ مرزا صاحب پان حاضر کروں؟ مرزا صاحب کھنچے کھنچے انداز میں بولے "میں پان نہیں کھاتا" اس نے کہا کہ مرزا صاحب کیا آج گھر والی نے آپ کو ڈانٹا ڈپٹا ہے؟ آپ نے اور منہ پھلا لیا اور چہرے پر ایک بناوٹی افسردگی طاری کر لی۔ جب ان کے محبوب نے یہ دیکھا تو ان کی طرف سے پیٹھ پھیر لی اور اس نے رقیب کو پان بنا بنا کر دینا شروع کئے اور ان کی خاک پرواہ نہ کی تھوڑی دیر تک تو مرزا صاحب منہ پھلائے اس انتظار میں بیٹھے رہے کہ شاید وہ کوئی اثر قبول کرے مگر اس نے مرزا صاحب کی خاک پرواہ نہ کی آخر میں مرزا صاحب اس نتیجہ پہ پہنچے کہ یار یہ بھی ہماری بے وقوفی تھی جو ہم ان صاحب کے کہنے میں آگئے اور اس حماقت کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو بلکہ بیٹھے بٹھائے محبوب کو اور زیادہ ناراض کر لیا۔

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعث افزائش درد درون وہ بھی

کاش = حرفِ تمنا :۔ ہمدم = ساتھی، دوست :۔ باعثِ افزائش = زیادتی کا موجب :۔ دردِ درون = درد دل :۔

مرزا صاحب اگرچہ آہ و زاری اور نالہ و فریاد میں ماہر تھے اور زندگی بھر آتش عشق میں انھوں نے نالے اور آہیں نشر کی تھیں مگر اس کے باوجود وہ اپنے آہ و نالوں کو زیادہ صحیح طریقہ پر استعمال نہ کر سکے اسی وجہ سے ان کی کوئی آہ اور کوئی نالہ ٹھیک نشانہ پر نہیں بیٹھا چنانچہ ایک دن جبکہ مرزا صاحب

آتشِ عشق میں سلگ رہے تھے اور پیٹ میں نالوں اور آہوں کے گولے اُٹھ رہے تھے یہ سوچ کر لاؤ اس آتش عشق کی جلن کو جو سینہ پر محسوس ہو رہی ہے کم کرنے کے لئے دو ایک نالے نشر کردوں شاید اُس سے دل کی جلن ہلکی ہو جائے اور جو آگ دل میں لگی ہے اُس میں کمی ہو جائے چنانچہ آپ نے آہ و زاری شروع کردی مگر دل نے جو مرزا صاحب کو یہ حرکت کرتے دیکھا تو اُسے ہول ہوئی کہ مرزا صاحب کو یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہونے لگا؟ چنانچہ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ بلا سبب ہی تو میں نے رونا پیٹنا اور نالوں کو نشر کرنا شروع کیا کیونکہ بجائے کم ہونے کے اس سے تاؤ یہ تکلیف اور زیادہ بڑھ گئی۔

غزل نمبر ۴

ہے دورِ قدح وجہِ پریشانیٔ صہبا یکبار لگا دو خمِ مے میرے لبوں سے

دورِ قدح = گردشِ ساغر :- صہبا = شراب :- خم = مٹکا :-

ایک صاحب کے یہاں تقریب تھی اور پلاؤ زردہ اور دنیا کی نعمتیں خاصی مقدار میں تقریب ختم ہونے کے بعد بھی بچ رہی تھیں ایک صاحب جو اس قسم کی تقریبوں میں بغیر بلائے بھی پہنچ جایا کرتے تھے ایک دم پہنچ گئے اور انواع و اقسام کی چیزیں دیکھ کر بولے کہ حضرت گرمی اور برسات کے زمانے میں تقریب کرنے والوں کو بڑی پریشانیاں اٹھانا پڑتی ہیں اور بہت سا کھانا نشر کر ضائع ہو جاتا ہے اب دیکھئے آپ ہی کے یہاں یہ ساری چیزیں بچی پڑی ہیں یہ بچاری کل سویرے تک سڑ سڑا کر بے کار ہو جائیں گی لہٰذا اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو میں ان سب کو کھا دوں۔ اس شعر میں مرزا صاحب

نے بھی ایسا ہی واقعہ جو انھیں پیش آیا بیان کیا ہے۔ مرزا صاحب جو پینے پلانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے اور ہمہ وقت شراب کے چکر میں رہتے تھے ایک دن ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں شراب کی بوتلوں کے انبار لگے ہوئے تھے اور کوئی پینے والا نہ تھا سوچے کیا ترکیب کی جائے جو ڈٹ کر شراب پینے کو مل جائے سوچتے سوچتے ایک ترکیب ان کی سمجھ میں آئی اور صاحب خانہ سے فرمانے لگے کہ حضرت! اس وقت آپ کے یہاں شراب کو دیکھ کر مجھے اس پر ترس آرہا ہے کہ اس بے زبان شے کو کتنی مصیبتوں اور زحمتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ پیٹ میں جانے سے قبل اسے سب سے پہلے تو خم سے ساغر میں انڈیلا جاتا ہے پھر ساغر کو گردش میں لایا جاتا ہے اس سے اُسے سخت زحمتیں اٹھانا پڑتی ہیں اسی سوچ میں آپ کے یہاں جو شراب رکھی ہے وہ بھی پریشان ہے لہذا شراب کو اس پریشانی سے بچانے کی صرف ایک ہی صورت ممکن ہے اور وہ یہ آپ خم کو ایک بار میرے لبوں سے لگادیں اور میں اُسے چڑھا کر اپنے پیٹ میں اتار کر پیٹ میں محفوظ کرلوں اس طرح وہ پریشانی و پراگندگی سے بچ جائے گی۔

رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہے زاہد زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

زنہار۔ حرف تنبیہ ہے خبردار۔ طرف ہونا۔ الجھنا۔ طرف مقابل و حریف۔

مرزا صاحب شراب پینے میخانے کی طرف جارہے ہیں اتنے میں رستے میں اُنھیں ایک مولوی صاحب مل جاتے ہیں جو یاحق کچھ کہتے ہیں"

کے نعرے بلند کر رہے ہیں مرزا صاحب ان سے نہایت اخلاص سے پیش آتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ مولوی صاحب واللہ آپ وعظ کیا بیان کرتے منہ سے موتیوں کا مینہہ برساتے ہیں! عوام میں تو آپ کی وہ عزت اور وہ پوچھ گچھ ہے کہ کچھ نہ پوچھئے آپ اگر کسی سے کہیں کہ رات بھر ایک ٹانگ سے کھڑے رہو تو قسم آپ کے سر عزیز کی سارس کی مانند کی طرح ایک ہی ٹانگ پر کھڑا رہے گا آپ کی ہر دلعزیزی دیکھ کر دنیا رشک کرتی ہے مگر مولوی صاحب اس سلسلہ میں ایک گذارش ہے اور وہ یہ کہ خدا نہ کرے جو کسی بڑے وقت یا برے انسان سے آپ کا پالا پڑے لہذا گستاخی معاف حفظ ماتقدم کی خاطر عرض کر رہا ہوں کہ آپ کبھی کسی شراب پینے والے سے نہ الجھئے گا اور ان حرامخوروں کے منہ نہ لگئے گا اس وجہ سے کہ اول تو وہ ہر وقت شراب پینے میں مست رہتے ہیں اور اس مستی کے عالم میں نہ شریف کو شریف اور نہ رذیل کو رذیل سمجھتے ہیں جو اول فول منہ میں آتا ہے کہہ گذرتے ہیں اب اگر خدا نخواستہ اُن بے ادبوں کو آپ نے کوئی درس دیا یا آپ شراب خانہ میں بغرض تبلیغ پہنچ گئے تو یقین مانئے کہ آپ سخت خطرہ میں پڑ جائیں گے دوسرے وہاں ایک سے ایک منہ پھٹ اور گستاخ ہمہ وقت دکھائی پڑتا ہے وہ نہ تو آپ کی بات سنیں گے اور نہ آپ کی شرافت کی پرواہ کریں گے اور ایسی نازیبا حرکات پر اُتر آئیں گے کہ مجھے کہتے شرم آتی ہے لہذا اگر میرا مشورہ آپ قبول فرمائیں تو ہرگز ہرگز کسی شراب خانہ میں تبلیغ کی غرض سے تشریف نہ لے جائیے گا۔

غزل نمبر ۵

تاہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا   سُن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

مرزا صاحب کا محبوب بھی سینکڑوں برساتیں دیکھے ہوئے تھا اور وہ جانتا تھا کہ مرزا صاحب اس موقع کی تلاش میں ہیں کہ اُن کو کوئی بہانہ بات کرنے کو مل جائے مثلاً مرزا صاحب کو اگر اُس سے بات کرنا ہے اور وہ انھیں راستہ میں مل گیا ہے تو مرزا صاحب اس بہانہ سے اُسے اپنی طرف مخاطب کریں گے کہ حضرت آپ کو راستہ میں کوئی منی آرڈر والا تو ادھر آتا نہیں دکھائی دیا یا کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہاں محلے میں اچھا دودھ کہاں ملتا ہے؟ غرض مرزا صاحب مختلف بہانوں سے اُس کے پاس جاتے رہتے اور وہ مرزا صاحب کی ان رکھی بازیوں سے بخوبی واقف تھا ایک دن مرزا صاحب کے رقیب نے مرزا صاحب کی اُس سے شکایت کی کہ آج مرزا صاحب فلاں فلاں عورت کی طرف دیکھ رہے تھے یا فلاں جگہ بیٹھے آپ کی برائیاں کر رہے تھے چنانچہ وہ رقیب کے منہ سے مرزا صاحب کی شکایت سُن کر خاموش ہو گیا مرزا صاحب کے مخبروں نے آکر مرزا صاحب کو اطلاع دی کہ ارے بھائی مرزا صاحب مبارک ہو آج جب رقیب نے آپ کی شکایت کی تو خلاف توقع اور خلاف اُمید اُس نے بجائے گالی گلوچ کرنے کے بالکل سکوت اختیار کیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے لئے حالات کچھ سازگار ہو رہے ہیں مرزا صاحب یہ سُن کر مسکرائے کہ ارے بھائی تمھارے منہ میں گھی شکر مگر تم اُس کے مزاج سے واقف نہیں ہو اور جو لوگ اُس کی خو بو سے واقف نہیں ہیں وہ ایسی ہی

غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں واقعہ یوں ہے کہ سوائے ہمارے کوئی
دوسرا اُن کی خاموشی کا مفہوم سمجھ ہی نہیں سکتا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ
بہت خوبیوں کے انسان ہیں اور کسی کی اچھائی برائی میں نہیں ہیں اور لوگ
اُنھیں نہایت بامروت قسم کا انسان سمجھے ہوئے ہیں مگر
حقیقت یہ ہے کہ اُن کی خاموشی
کا سبب ہم کو اپنے پاس آنے سے روکنا ہے وہ جانتے ہیں کہ ہم کوئی نہ کوئی
بہانہ اُن تک پہنچنے کا ڈھونڈتے رہتے ہیں لہذا اگر وہ اپنی زبان سے
ہماری شکایت کریں گے تو ہم اُن کے پاس شکوہ و شکایت کے بہانے
پہنچ جائیں گے اسی خیال سے وہ ہم کو شکایت کا موقع نہیں دیتے۔
غالب تیرا احوال سنا دیں گے ہم اُن کو وہ سُن کے بلا لیں یہ اجارہ نہیں کرتے
اجارہ کرنا ۔ ذمّہ لینا ۔ ٹھیکہ لینا ۔
ایک صاحب ٹھیکدار بنکر مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے
مرزا صاحب محبت کے مختلف امراض میں مبتلا تھے اور حسب دستور قدیم
آہ وزاری فرما رہے تھے ان ٹھیکیدار صاحب کو اُن پر ترس آیا اور
اُنھوں نے کہا کہ صاحب آپ کی محبوبہ سے میری بھی ماشاء اللہ
تھوڑی بہت یاد اللہ ہے اور اب تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے اُن
سے کوئی بات کہی ہو اور انھوں نے اُسے نہ مانا ہو میں اُن ہی کے پاس
جا رہا ہوں اور باتوں باتوں میں آپ کے لئے سعی سفارش کردوں گا اُس
کے بعد آپ کا مقدر ہے مگر ہم اس بات کا ذمہ نہیں لیتے کہ آپ کا حال سُنے

گے بعد وہ آپ کو بلائیں یا نہ بلائیں۔

غزل نمبر ۶

گھر ہمیں تھا کیا کہ تیرا غم اُسے غارت کرتا   وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

مرزا صاحب کا یہ شعر در اصل ان رقعہ کی نقل معلوم ہوتا ہے جو ان کی طرف سے منگنی ہونے کے بعد ان کی سسرال والوں کو گھر والوں کی طرف سے لکھوا کر بھیجا گیا تھا اور جس میں انھوں نے لکھ بھیجا تھا کہ صاحب جہاں تک لڑکے کی مالی حالت کا تعلق ہے وہ بھی پوتڑوں کا ...... فقیر ہے تمام عمر عسرت اور بے سر و سامانی میں گذری اور گذر رہی ہے دونوں وقت پابندی سے فاقے ہوتے ہیں اور سارا گھر پیٹ پر پتھر باندھ کر سورہا ہے آبائی فقیر ہیں نہ آباد اجداد کو کبھی پیسہ میسر ہوا اور نہ آئندہ کوئی توقع ہے آپ اپنی صاحبزادی کا مقدر سوچ سمجھ کر پھوڑیں زیادہ حد ادب۔

اس مضمون کو مرزا صاحب اس انداز میں ادا کرتے ہیں یعنی غم عشق سر و سامان کو تباہ کرنے والا ہے یعنی شادی بیاہ میں چونکہ مزید مصارف کے امکانات ہیں۔ لہذا گھر کی تباہی یقینی ہے اور مفلسی کا یہ عالم ہے کہ غارت کرنے والی تک کوئی چیز نہیں ہے۔ مقصد یہ کہ یہاں نہایت چہ خفتہ چہ بیدار والا حساب کتاب ہے یعنی یہ کہ شادی بیاہ کے بعد تباہی اور بربادی کا سوال یوں نہیں پیدا ہوتا کہ گھر میں کسی کے پاس ایک چھدام زہر کھانے تک کو نہیں ہے اس لئے معشوق سے یعنی اپنی سسرال والوں سے مرزا صاحب بانداز مایوسی فرماتے ہیں کہ "اے دوست یعنی لڑکی والو تمہارے

غم کی تواضع و مدارات ہم نہ کر سکیں گے یعنی لڑکی کو ہم نان نفقہ نہ دے سکیں گے اگر گھر میں کچھ ساز و سامان اور مال و دولت ہوتی تو ہم اس کو نذر کرتے یعنی اُس کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتے اور وہ اُس کو غارت کرتیں یعنی خوب ٹھاٹھ سے خرچ کرتیں لیکن وہ پہلے ہی سے تباہ و برباد ہیں یعنی پہلے ہی سے ہمارے پاس ایک ٹکہ نہیں ہے اور ایک کانی کوڑی تک نہیں ہے ایسی صورت میں وہ کیا غارت کریں گے یعنی کس طرح گذر بسر کریں گی۔ البتہ پہلے بھی ہم حسرت تعمیر رکھتے تھے اور اب بھی رکھتے ہیں یعنی مانگے جانچے کام چلاتے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی صدقے خیرات ہی میں زندگی بسر کرتے رہیں گے ہمارے پاس بجز اس حسرت کے اور کچھ نہیں ہے یعنی سوائے خیرات زکات پر زندگی بسر کرنے کے ہمارے گھر میں ایک ٹکا نہیں ہے۔

غزل نمبر ۲

غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

سر اٹھانے کی فرصت پانا = دم بھر کی مہلت ملنا۔ یا تھوڑی سی دیر کے لئے کسی کام سے نجات پانا۔ تقریب = سبب یا باعث :۔

اس شعر میں مرزا صاحب اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ جب غم دنیا سے سر اٹھانے کی فرصت ملتی ہے تو سر اٹھاتے ہی آسمان پر نظر جا پڑتی ہے اور چونکہ وہ جفا پیشہ ہے اس لئے دیکھتے ہی تو یاد آجاتا ہے اور

دوسرا غم شروع ہوجاتا ہے غرض کسی حالت میں غم سے نجات نہیں مقصد یہ ہے کہ جب مرزا صاحب کو شعر کہنے سے فرصت ملتی ہے اور گھر کی طرف نگاہ جاتی ہے تو ایک دم گھر کے روزانہ کے اخراجات کی فکر دامنگیر ہوجاتی ہے اور جب روز مرہ کے خرچ کا خیال پیدا ہوتا ہے تو یہ خیال دل میں آتا ہے کہ اگر محبوب سے ملاقات کی صورت پیدا ہوگئی اور وہ نکاح پڑھوانے پر بھی تیار ہوگئیں تو پھر دوسرے گھر کے مصارف کیوں کر پورے ہوں گے اِن حالات میں مرزا صاحب کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح پریشانیوں سے نجات حاصل کی جائے۔

کھلے گا کس طرح مضموں میرے مکتوب کا یارب
قسم کھائی ہے اُس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

مرزا صاحب نے بازار سے درجنوں لفافے منگا کر رکھ لئے ہیں اور دن بھر اِن کا کام یہ رہ گیا ہے کہ وہ محبوب کے نام خط لکھ لکھ کر سپرد ڈاک کرتے رہیں اور محبوب پابندی سے اُن خطوط کو پڑھنے کی زحمت گوارا کئے بغیر مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اگر وہ بجائے میرے خطوط ردّی کی ٹوکری میں ڈالنے کے غصہ ہوکر انھیں نذر آتش کر دیتا تو بھی میرا کام بن جاتا اور ردی کی ٹوکری میں ڈالتا رہے تو بھی میرا مقصد پورا ہوجاتا وہ یوں کہ مرزا صاحب ہر وقت اپنے دل میں عشق کا تنور جلائے بیٹھے رہتے ہیں اور ان کے دل میں سوز عشق اور آتش فراق کی آگ ہر وقت جلتی رہتی ہے جو سارے جہاں کی جلنے والی آگوں سے آگاہ ہے

جہاں کہیں شہر میں کوڑا کرکٹ جلایا جاتا ہے مرزا صاحب کو اُن کی آتشِ فراق بتا دیتی ہے کہ اجمیری گیٹ کی طرف کوڑا گھر جلایا جاتا ہے کل چوڑی بازار میں چوڑیوں کا تاؤ تیار ہوا ہے اسی لئے مرزا صاحب چاہتے تھے کہ اگر وہ ان کے خطوط پاکر اور غصہ میں آگ بگولا ہو کر انھیں جلا دیتا تو کم از کم ان کو اطلاع ہو جاتی کہ ہمارا خط بجائے پڑھنے کے جلا دیا گیا مگر ان کا بیہودہ پن اور ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اِدھر ڈاکیہ نے پکار کر اُن کے ہاتھ میں ہمارا خط دیا اُدھر اُنھوں نے اُس کو سونگھتے ہی سمجھ لیا کہ مرزا صاحب کا خط ہے اور بغیر پڑھے اور اُس کے مطالب سے آگاہ ہوئے پھاڑ کر پھینک دیا۔ خدا جانے مرزا صاحب کے خط میں کس قسم کے مضامین ہوتے تھے کہ ان کا محبوب اِسے پڑھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کرتا تھا اور خط ملتے ہی براہِ راست ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتا تھا جس سے مرزا صاحب کی ساری اُمیدیں اور توقعات خاک میں مل کر رہ جائے۔

اُنھیں منظور اپنے زخمیوں کو دیکھ آنا تھا
اٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کا محبوب نہایت جلاد قسم کا انسان تھا جو کئی سو عشاق کی یومیہ پٹائی کر کے ہسپتالوں میں داخل کراتا رہتا تھا اُس کا روزمرہ کا پروگرام یہ تھا کہ اِدھر شام ہوئی اور اُس نے اپنی بزم آراستہ کی اور تھوڑی بہت ضروری غیر ضروری باتیں کر کے اُٹھ کھڑا ہوا اور اُن سے کہہ گیا کہ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں ذرا باغ میں چہل قدمی کر آؤں کیونکہ اِن دنوں

عاشقوں کی پٹائی کے سبب میری صحت کچھ ٹھیک نہیں ہے اور اس بہانے اٹھ کر وہ اسپتال پہنچ جاتا اور یہاں پٹے پٹائے عشاق اپنے اپنے گل لالہ قسم کے زخم سے پڑے ہوتے اُن کو دیکھ کر سکون حاصل کر لیتا اُس کے نزدیک گویا سرگل اور زخمیوں کا دیکھنا مساوی حیثیت رکھتا تھا۔

ہماری سادگی تھی التفات ناز پر مرنا   تیرا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جلنے کی

سادگی = بیوقوفی۔ عقل کی کوتاہی :- التفات ناز = معشوق کا آنا۔
تمہید = عنوان یعنی تقریب آغاز : مرنا بے حد خوش ہونا فریفتہ ہونا۔

مرزا صاحب عشق میں جو بیسوں گھنٹے تڑپتے رہتے تھے اور محبوب کی ستم ظریفی دیکھیے کہ وہ پابندی سے ان کے تڑپنے سے لطف اندوز ہوتا تھا چنانچہ محض لطف لینے کے لئے وہ مرزا صاحب کے گھر شام کو آتا اور دیکھ جاتا کہ مرزا صاحب قاعدے سے تڑپ رہے ہیں یا سستا رہے ہیں۔ مرزا صاحب اس کا مفہوم یہ سمجھے کہ اُسے مرزا صاحب سے اُسے کوئی خاص اُنس یا محبت ہے اِس پر مرزا صاحب خوش ہو ہو کر تڑپتے اور اس میں نئی نئی راہیں نکالتے کبھی اُتر دکھن لوٹتے تو کبھی پورب پچھم۔ ایک دن اُن کے دوست نے کہا کہ مرزا صاحب آپ کس غلط فہمی میں مبتلا ہیں حضور والا وہ جو آپ کو دیکھنے تشریف لاتے ہیں وہ محض آپکے تڑپنے سے لطف لینے کی غرض سے آتے ہیں کیا یہ آپ نے اندازہ نہیں کیا کہ نہ تو وہ آپ کے گھر کی چائے پیتے ہیں نہ پان کھاتے ہیں بلکہ دو گھڑی کھڑے ہو کر خیریت تک نہیں پوچھتے آتے ہیں اور نکلے چلے جاتے ہیں اگر وہ تھوڑی دیر رُک کر آپ کی خیر خیریت دریافت کرتے تو

بھی ایک بات تھی مگر وہ آپ کو تڑپا تڑپا کر مار رہے ہیں اور اپنے حسن و جمال سے روزانہ آپ کی تڑپن میں اضافہ کر کے چلے جاتے ہیں۔

لکدکوب حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی   میری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

لکدکوب = دولتی حوادث جمع حادثہ کی معنیٰ آفات ضامن = ذمہ دار۔
طاقت = صلاحیت :-

مرزا صاحب زندگی بھر عشق سے لذت اندوز ہوتے رہے اور ان کے پاس لے دے کر صرف ایک صلاحیت تھی اور وہ یہ کہ مراقبہ میں پڑے رہیں اور "ہائے مار ڈالا" کے نعرے بلند کرتے رہیں نہ اُن کو گھر بار کی فکر تھی اور نہ اس کی پرواہ کہ کون جیا اور کون مرا۔ اُن کا کام صرف بتوں کے ناز و نخرے اٹھانا اور چارپائی پر لیٹے لیٹے حقہ پینا تھا اسی لئے وہ زندگی بھر حد درجہ پریشان رہے جب پریشانیوں کی انتہا ہو گئی تو حاضر ہو کر فرماتے ہیں اور ایک وقت میں دو دو کام نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میں نے دنیا میں بتوں کے ناز و نخرے اٹھانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے اگر کبھی آپ کو حسینوں کے ناز و انداز کے صحیح نمبر معلوم کرنا ہوں تو مجھ سے آکر دریافت کر جایئے دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صاحب محبوب کے ناز و نخروں کی لاتیں کھانے میں جو مزا ہے وہ حوادث زمانہ اور آفات آلام روزگار کو نصیب نہیں ایک زمانہ وہ تھا کہ میں بتوں کے ڈیڑھ ڈیڑھ ڈھائی ڈھائی من وزن کے ناز و غمزوں کو یاعلی کہہ کر اٹھا لیتا تھا مگر اب اس قدر ضعیف اور کمزور ہو چکا ہوں کہ ان کے ناز و نخروں کی ایک معمولی سی پوٹلی بھی اگر کوئی کندھے پر رکھ دے تو برداشت نہیں کر سکتا۔

غزل نمبر ۸

اُس شمع کی طرح سے جسکو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغ ناتمامی

جلے ہوئے: عشاق :- داغِ ناتمامی: ناقص ہونے کا عیب۔

ایک صاحب جو زندگی بھر بیکار رہے تھے اور جنھوں نے کبھی کوئی کام نہ کیا تھا اُن سے لوگوں نے کہا کہ آپ کو شرم آنا چاہیئے کہ آپ نے دنیا میں آکر فضول ایک جگہ روک رکھی ہے اس پر وہ حد درجہ چراغ پا ہو کر بولے کہ صاحب ہم میں اور آپ میں صرف "بے" ہی کا تو فرق ہے ورنہ اور کونسا بڑا فرق ہے۔ بولے یہ کیسے: فرمانے لگے کہ "آپ" "باکار" ہیں اور ناچیز بیکار ہے اسی طرح آپ بانخواہ ہیں اور ناچیز بے تنخواہ ہے اسی قسم کی بات مرزا صاحب اس شعر میں فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میرا شمار بھی دل جلے عاشقوں اور عارفوں میں ہے فرق صرف یہ ہے کہ وہ کامل ہیں اور آپ کا یہ "تابعدار" "ناکامل" یا ناقص کامل ہے بس یوں سمجھ لیجئے کہ وہ روشن شمع ہیں اور میں گل کی ہوئی شمع ہوں بہ الفاظ دیگر وہ چلم کی تازہ تمباکو ہیں اور میں سُلفا ہو چکا ہوں کہنا یہ چاہتے ہیں کہ روشن شمعوں میں ایک بجھی ہوئی شمع ہوتی ہے جو داغدار اور عیب دار ہوتی ہے۔

غزل نمبر ۹

حالانکہ ہے یہ سیلئی خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے سے مے کا گمان ہے

سیلی: چوٹ مضرب :- خارا: سنگِ خارا۔ شیشے سے مراد: دل۔ مے: یہ سامان حسرت و نشاد مانی۔

مرزا صاحب زندگی بھر شراب سے لطف اندوز ہوتے رہے جس کے سبب شہر بھر میں بدنام تھے۔ چنانچہ وہ اگر کبھی معمولی جوشاندہ بھی پیتے تو لوگ اُن پر یہ شبہہ کرتے کہ ہو نہ ہو مرزا صاحب شراب کی قسم کی کوئی چیز پی رہے ہیں اسی طرح اگر مرزا صاحب اپنی کمزوری کو دور کرنے کے لئے بکری کی کلیجی کا خون بھی پیتے ہوتے تو بھی لوگوں کو یہی شبہہ ہوتا کہ مرزا صاحب خوب مزے اڑا رہے ہیں اور شراب پی رہے ہیں مگر مرزا صاحب اِس درجہ بامروت واقع ہوئے تھے کہ لوگوں کی اِس غلط فہمی کی ذرّہ برابر پرواہ نہ کرتے تھے اور کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتے کہ وہ درحقیقت کمزوری اور ضعف کے سبب کلیجی کا عرق پی رہے ہیں۔

کی اُس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا　　آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مقام ہے

جا گرم کرنا = سکونت پذیر ہونا۔ رہنا۔ اہلِ ہوس = رقیب۔ سینۂ = مراد دل۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کا معشوق ٹھنڈے مقام پر رہنے کا عادی تھا اور گرمیوں میں وہ نینی تال اور مسوری چلا جاتا تھا نیز دل پر جانے سے پہلے جاڑے اور برسات کے موسم میں رقیبوں کے ٹھنڈے ٹھنڈے دلوں میں کوئی کمرہ لئے پڑا رہتا تھا۔

مرزا صاحب اِس شعر میں فرماتے ہیں کہ چونکہ رقیب کا سینہ آتشِ عشق سے عاری ہے اور محبت کی گرمی سے خالی ہے۔ اِسی لئے معشوق نے ٹھنڈا مقام دیکھ کر رقیب کے دل میں اپنا مسکن بنا رکھا ہے اور مرزا صاحب کی طرف اس

وجہ سے توجہ نہیں کرتا کہ مرزا صاحب جو بیسوں گھنٹے اپنے دل میں عشق کی آگ جلائے بیٹھے رہتے ہیں۔ گویا باہر تختی پر لکھائے بیٹھے ہیں حمام گرم ہے۔

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا بس چپ رہو ہمارے بھی منھ میں زبان ہے

ہمارے بھی منھ میں زبان ہے۔ اس کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ ہمارے پاس ایسے ثبوت ہیں کہ اگر زبان کھولنے پہ آئیں تو تم کو قائل کر دیں اور دوسرے شوخ معنی یہ ہیں کہ ہم زبان سے چکھ کر بتا سکتے ہیں کہ غیر نے بوسہ لیا ہے یا نہیں مقصد یہ کہ آپ بیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ ہانڈی جھوٹی ہے یا بغیر چکھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب اپنے محبوب کے استعمال شدہ رخساروں کو دیکھ کر سخت نالاں ہیں کیونکہ محبوب تازہ تازہ دو ایک بوسے رقیب کو دیئے چلا آرہا ہے اور اسی طرح جھوٹا منہ لئے مرزا صاحب کے سامنے پہنچ گیا ہے۔ مرزا صاحب دیکھتے ہی تاڑ گئے ہیں کہ گالوں پر جگہ جگہ گیلے سے کیوں بنے ہیں مرزا صاحب چونکہ آدمی تجربہ کار تھے اس لئے رخساروں کے پارۂ حرارت سے معلوم کر لیتے تھے کہ کتنے فیصدی بوسے لئے جا چکے ہیں اور کتنے بوسوں کی ابھی گنجائش ہے لہذا فرماتے ہیں کہ بس جو کچھ آپ کر کے آئے ہیں اس کے لئے منہ نہ کھلوایئے ورنہ بوسہ زدہ رخسار کو چکھ کر میں ابھی بتا دوں گا کہ آپ کتنے بوسے دلوائے چلے آرہے ہیں۔

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

مرزا صاحب ایک زمانے میں جب مفلسی سے تنگ آ گئے تو انھوں نے حقہ تک پینا بند کر دیا۔ مگر لوگوں کو کسی طرح یہ یقین ہی نہ آتا تھا کہ مرزا صاحب

کے یہاں پچھلی پی ہوئی چلموں کا جو سلفہ پڑا تھا اُس کو دیکھ کر لوگ کہتے تھے کہ اگر مرزا صاحب حقہ نہیں پیتے تو یہ سلفہ کہاں سے آتا ہے۔ چنانچہ مرزا صاحب سخت عاجز تھے کہ ان معترضین کو کس طرح یقین دلائیں کہ وہ حقہ نوشی ترک کر چکے ہیں اسی لئے اُن کو اس موضوع سے متعلق یہ شعر کہنا پڑا۔ چنانچہ اس میں مرزا صاحب نے جگر کو حقہ سے تشبیہ دی ہے اور سلفہ کو اُس کے داغ سے اور فرماتے ہیں کہ ہمارے وجود کا یقین یا اطلاق حقہ سے تھا۔ جب تک جگر رہا ہم خیال کرتے رہے کہ ہماری ہستی ہے یعنی حقہ ہے مگر اب غم نے جگر کو جلا کر ختم کر دیا ہے اور جگر کے بجائے اُس کے جلنے کی علامت ایک داغ کی صورت میں باقی ہے یعنی وہی سلفہ جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ لہذا جس چیز پر ہماری ہستی کا اعتبار منحصر تھا یعنی جس پر حقہ کے پئے جانے کا شک ہوتا تھا وہ چیز ہی باقی نہیں رہی اس لئے ہماری ہستی بھی مٹ گئی یعنی ہم نے حقہ نوشی ترک کر دی لیکن جب ہم لوگوں سے بیان کرتے ہیں کہ ہمارا وجود باقی نہیں ہے یعنی ہم نے حقہ کشی بند کر دی ہے تو وہ یقین ہی نہیں مانتے۔ کثرت غم سے جگر ہی مٹ گیا یعنی اخراجات نے اِس قابل ہی نہیں رکھا کہ ہم تمبا کو خریدیں اور حقہ تازہ کرائیں۔ جگر کے بجائے ایک داغ رہ گیا ہے یعنی سلفہ۔ مگر لوگ سلفے کو دیکھ کر یقین ہی نہیں کرتے کہ ہم حقہ نوشی سے تائب ہو چکے ہیں اس شعر میں لطف یہ ہے کہ شاعر اپنے کو حقہ کشی سے تائب سمجھتا ہے اور دوسرے لوگ سلفے کو دیکھ کر اس کی بات ماننے کو تیار نہیں ہیں۔

ہے ہار اعتبارِ وفاداری اسقدر　　　غالب ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے

مرزا صاحب جہاں اچھی بُری شراب پینے کے عادی تھے وہاں معشوق کی مہربانی اور عدم مہربانی کی بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔ نہایت "نیکی کر کنویں میں ڈال" قسم کے لوگوں میں سے تھے۔ چنانچہ باوجود محبوب کے نامہربان ہونے کے بلا کسی مقصد کے وفاؤں پر وفائیں کرتے چلے جاتے تھے اور ان کا ضمیر اپنی جگہ مطمئن تھا۔ غرض عجیب "چہ خفتہ چہ بیدار" قسم کی طبیعت پائی تھی یوں سمجھ لیجئے کہ مرزا صاحب کی طبیعت ہمارے ایک دوست سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی جو ایک ادارہ میں ملازم تھے وہ ملازم تو تھے مگر اُن کو اس کی چنداں فکر نہ تھی کہ تنخواہ ملے یا نہ ملے اِس طرح اُن کا ضمیر مطمئن تھا کہ وہ بیکار نہیں ہیں جب اُن سے اس کا جواز دریافت کیا جاتا تو فرماتے کہ صاحب ہم کو تو شروع ہی سے معلوم تھا کہ انسان کو بیک وقت دو چیزیں حاصل نہیں ہو سکتیں۔ یا تو ملازمت لے لے یا تنخواہ۔ ہم نے ملازمت قبول کر لی تھی اس لئے اب تنخواہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ چنانچہ مرزا صاحب بھی جب عشق کرنے چلے تھے تو یہ سمجھ کر چلے تھے کہ یہ بھی بے تنخواہ ... کی ملازمت ہے یعنی اس میں محبوب کی مہربانی کا سوال عدم ادائیگی تنخواہ کی طرح پیدا ہی نہیں ہوتا یعنی عاشق کو چاہئے کہ اپنی جگہ برد باری جملہ کا نشان بنا رہے خواہ محبوب عاشق کی وفاداریوں کا اعتراف کرے یا نہ کرے۔

غزل نمبر ۱

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ

رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

جب مرزا صاحب کے محبوب نے دیکھا کہ مرزا صاحب عشق کے کوچے میں بالکل ہی نابالغ ہیں تو مجبوراً اس نے مرزا صاحب سے اپنا رشتہ منقطع کرلیا اور اُس کے ماں باپ نے اُس کا کسی دوسری جگہ عقد کر دیا۔ مرزا صاحب اس خیال میں تھے کہ جب داڑھی مونچھوں والے ہوں گے اور جوانی اپنے جوش میں آئے گی تو پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنے دل کی بھڑاس نکالیں گے مگر محبوب کے ماں باپ کو نہ جانے کس وجہ سے جلدی تھی کہ انھوں نے گھبرا کر محترمہ کا دوسرے کے ساتھ عقد کر دیا۔

غزل نمبر ۱۱

سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

سرگشتگی یعنی پریشانی۔ عالم ہستی = زندگی۔ یاس = مایوسی۔ نوید = مژدہ، خوش خبری۔

مرزا صاحب نے غالباً کئی عشق کئے تھے۔ ڈومنی والے عشق کے متعلق تو بہرحال ہم آپ سب ہی جانتے ہیں اور اُن کی گھر والی کو بھی اس کی اطلاع تھی مگر ایک اور مسماۃ جن کا ذکر اکثر غیر مطبوعہ نسخوں میں ملتا ہے۔ جو اب کہیں دستیاب نہیں، اُن میں ایک مسماۃ کا نام تسکین آرا بیگم دیا ہوا ہے۔ چنانچہ اس شعر میں مرزا صاحب نے ان مسماۃ کا ذکر کیا ہے ایک مرتبہ جب مرزا صاحب اپنی تمام "معشوقاؤں" سے حد درجہ دل برداشتہ ہوئے تو انھوں نے طے کر لیا کہ اب ہم صرف ایک کے ہو کر رہیں گے اور یہ تھیں مسماۃ تسکین آرا بیگم۔ مگر چونکہ مرزا صاحب نے ڈومنی کے ساتھ کچھ

اچھا سلوک نہیں کیا تھا اور بقول مرزا "جس پر مرتے تھے اُس کو مار رکھتے تھے اس لئے یہ مسماۃ بھی مرزا صاحب سے بھاگی بھاگی پھرتی تھیں لہذا مرزا صاحب نے یہ سوچکر کہ "گندم اگر بہم نرسد بھُس غنیمت است" چلو انھیں مسماۃ کے ساتھ زندگی بسر کرلیں گے ان کی تلاش شروع کی تو معلوم ہوا کہ وہ بھی لاپتہ ہیں اس پر مرزا صاحب حد درجہ غمگین ہوکر زندگی سے مایوس ہو گئے اور انھیں زندگی سے مایوسی کے بعد موت کی اُمید بندھ گئی اور یہ خیال کرکے کہ اگر جیتے جی وہ بھاگی ہیں تو مرنے کے بعد تو بہر حال دکھائی پڑیں گی اور اگر زندگی میں وہ نہیں مل سکتیں تو مرنے کے بعد میدان حشر میں تو پکڑ ہی ملیں گی۔

اس شعر میں مرزا صاحب خود اپنی ذات سے مخاطب ہو کر عالم خیال میں فرما رہے ہیں کہ سُن رکھئے کہ اب ہم انتقال فرمانے جا رہے ہیں بہتر صورت یہی ہے کہ آپ چلی آیئے اور ہم سے دُور مت بھاگئے۔ ورنہ کیا فائدہ جو مرنے کے بعد ہم نے میدان حشر میں بلوہ کرکے آپ کو حاصل کر لیا۔

لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

مرزا صاحب اپنی محبوبہ کے پیچھے کچھ اس بری طرح پڑ گئے تھے کہ خود تو گھر میں بیٹھے رہتے تھے اور دل کے اردلی کو حکم دے رکھا تھا کہ جہاں بھی وہ دکھائی پڑیں ان کو پکڑ کر حاضر کرو چنانچہ اُن کے دل کا اردلی دن بھر ان کے محبوب کی تلاش میں مارا مارا پھرا کرتا تھا اگر وہ کسی ریسٹوران میں چائے پی رہا ہوتا تو یہ پہلے سے وہاں موجود رہتا لیکن اس تلاش کے باوجود ان کا محبوب ایسا مغرور متکبر اور غفلت شعار واقع ہوا تھا کہ وہ

نہ تو ان کے دل کے اردلی کی پرواہ کرتا اور نہ مرزا صاحب ہی کی خبر لیتا ان کا دل جس ریستوران میں جاتا اور ان کو کھانا کھاتے یا چائے پیتے دیکھتا سامنے اس انتظار میں کھڑا رہتا کہ شاید کھاتے ہیں نگاہ اٹھ جائے مگر اس نے کبھی نگاہ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہ دیکھا اور ان کے دل کے متعلق سمجھتا رہا کہ وہ مرزا صاحب کے گھر پر ان کا حقہ تازہ کر رہا ہوگا حالانکہ جس دن سے مرزا صاحب کے پاس انھوں نے آنا جانا ترک کر دیا تھا اس روز سے وہ بیچارہ ان کے پیچھے پیچھے سائے کی طرح لگا رہتا تھا اور رحم کی بھیم کے ساتھ تپ کی ڈگی بنا دکھائی دیتا

کیجئے بیان سرورِ تپِ غم کہاں تلک ہر موے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

سپاس یعنی شکر گزاری۔ سرور، مسرت یا مے نوشی کے بعد کی کیفیت۔ تپ حرارت یعنی گرمیٔ عشق۔

مرزا صاحب کو ایک زمانے میں ملیریا ہو گیا تھا اور شدید سردی لگ کر بخار آنے لگا تھا چنانچہ یہ شعر مرزا صاحب نے لحاف میں لیٹے لیٹے اس وقت کہا تھا جب پورے زور و شور سے ان پر لرزہ طاری تھا اور ان کے جسم کے رونگٹے بحالت بخار کھڑے ہوئے تھے۔ مرزا صاحب چونکہ ہر چیز کو عاشقانہ رنگ میں پیش کرنے کے عادی تھے لہذا اس واقعہ کو بھی وہ عاشقانہ رنگ میں بیان کرتے ہیں یعنی سوزشِ عشق (بخار) میں ایسا مزہ آتا ہے کہ بیان نہیں کر سکتے اس لذت و سرور کی فراوانی کا اندازہ بآسانی اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ہر موئے بدن زبان بن کر تپِ غم یعنی بخار کی شکر گزاری میں مصروف ہے۔ دیکھئے تو مرزا صاحب نے کس خوبی سے جوڑی بخار کو عاشقانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا ہر چند اُس کے پاس دلِ حق شناس ہے

بیگانۂ وفا۔ وفا نا آشنا یعنی بیوفا۔ دلِ حق شناس = حق و باطل میں تمیز کرنے والا دل۔

مرزا صاحب کی محبوبہ یا معشوقہ ایک طرف تو روزہ نماز کرتی ہیں اور بڑے گھر کی بہو بیٹیوں کی طرح زندگی گذارتی ہیں اور دوسری طرف وہ چونکہ اتفاق سے حسین واقع ہوئی ہیں اس لئے اُن کو اس کی قطعی پروا نہیں کہ شرعًا ان کو کیا کرنا چاہیئے اور کون کون سی باتوں پر عمل کرنا چاہیئے اس سلسلے میں وہ اپنے فرائض کو پس پشت ڈالے ہوئے ہیں اور ضمیر کی آواز تک کو خاطر میں نہیں لاتیں ورنہ ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ جب اُنھوں نے مرزا صاحب سے عشق فرمایا تھا اور مرزا صاحب کو دیکھا تھا کہ وہ ہر وقت اُن کے سامنے سوالیہ جملہ کا نشان بنے بیٹھے رہتے ہیں اور اس درجہ وفادار اور خدمتگذار ہیں کہ پان ڈلی کتھے سے لے کر دنیا کا سودا سلف بے چون وچرا لا دیتے ہیں تو اُن کو بھی چاہیئے تھا کہ وہ مرزا صاحب کی وفاداری اور خدمتگذاری کا اعتراف کرتیں۔ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ جہاں تک حق شناسی کا تعلق ہے وہ ایک نہیں مجھ پر لاکھ مظالم کریں اور مجھ کو برا بھلا کہیں مجھے خدا کے گھر جانا ہے لہٰذا میں گلے گلے پانی تک یہ ضرور کہوں گا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو جو دل عطا فرمایا ہے وہ حق شناس ضرور ہے یہ دوسری بات ہے کہ بُری صحبت میں پڑ کر وہ چوپٹ ہو گئی ہیں اس لئے وہ ضمیر کی آواز خاطر میں نہیں لاتیں۔ ممکن ہے کہ مرزا صاحب اس شعر میں یہ کہنا چاہتے ہوں کہ مرزا صاحب کا حق شناس دل

وہ رہن کئے بیٹھی ہیں یعنی مرزا صاحب نے اپنا حق شناس دل اُن کے پاس رہن رکھوا دیا ہے اور چونکہ مرزا صاحب کا دل ہے لہٰذا اُس میں وہی مرزا صاحب والی باتیں موجود ہیں اور منٹ منٹ پر وہ بیگانگی اور بے راہ روی پر اِن کو ٹوکتا رہتا ہے لیکن وہ اُس کی ہر بات کو غرورِ حسن کی وجہ سے گدھے کی لات سمجھتی ہیں۔

پی جس قدر ملی شب مہتاب میں شراب اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

راس ہے = موافق ہے، مفید ہے۔

مرزا صاحب تمام زندگی شراب پیتے رہے اور مولوی صاحبان برابر ان پر ڈانٹ ڈپٹ کرتے رہے۔ چنانچہ مرزا صاحب کا دستور تھا کہ جب چاندنی راتیں ہوتیں تو خوب ڈٹ کر شراب پیتے۔ ایک دن ایک مولوی صاحب اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمانے لگے مرزا صاحب یہ کیا آپ نے شراب کی لت اپنے پیچھے لگا رکھی ہے۔ اس پر مرزا صاحب نے کہا کہ مولوی صاحب اسلام میں حفظانِ صحت اور جان بچانے کے لئے شراب کو حلال قرار دیا گیا ہے یہ میں جو شب مہتاب میں شراب نوشی کرتا ہوں اُس سے آپ اس غلط فہمی میں کیوں مبتلا ہیں کہ میں نشاط کی خاطر ایسا کرتا ہوں۔ یقین مانیئے کہ میں بلغمی مزاج واقع ہوا ہوں اور چونکہ شراب مزاجاً گرم ہوتی ہے۔ اس لئے بطور دوا اُسے استعمال کرتا ہوں اور آپ نے دیکھا ہوگا کہ رات ہی کے وقت پیتا ہوں اور صرف اس خیال سے کہ بلغمی آدمی کو رات ہی میں زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ لہٰذا میں شرع کی خلاف ورزی نہیں کرتا بلکہ بطور دوا شراب استعمال کرتا ہوں۔ لہٰذا میرے متعلق جھوٹا پروپیگنڈہ نہ کیجئے ورنہ اندھیرا اجالے سمجھ لوں گا۔

غزل نمبر ۱۲

کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ　　دل فردِ جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے

گلہ = شکوہ ۔ حسرت اظہار = ظاہر کرنے یا بیان کی آرزو ۔ فرد = واحد یا تنہا یا وہ اکہرا کاغذ جس پر جمع و خرچ کا حساب لکھا جاتا ہے ۔ فردِ جمع و خرچ وہ کاغذ جس پر حساب لکھا ہوا ہو۔

اس شعر میں مرزا صاحب اپنی بیماری اور دوستوں کی بے التفاتی کا شکوہ کرتے ہیں جب دلی میں غدر کا زور ہوا اور مرزا صاحب کا نام بھی مجرمین کی فہرست میں شامل کر لیا گیا تو مرزا صاحب سے لوگوں نے ملنا ترک کر دیا۔

چونکہ انگریزی حکومت کی طرف سے باغیوں کی تلاش ہو رہی تھی اور ہر طرف خفیہ پولیس کا جال بچھا ہوا تھا ۔ اس لئے مرزا صاحب سے کوئی پوچھنے بھی نہیں آتا تھا کہ مرزا صاحب آپ کو کیا تکلیف ہے اگر لوگ قریب سے گذرتے تھے تو گونگے بہروں کی طرح خاموشی سے نکلے چلے جاتے تھے ۔ مرزا صاحب جو حقیقتاً بے قصور تھے ، یہ چاہتے تھے کہ وہ دوست احباب کو بتائیں کہ ہم بالکل بے قصور ہیں ۔ ہم تو اپنا درد دُکھ یعنی عشق لئے پڑے ہیں ۔ اور اُسی میں زندگی بسر کر رہے ہیں ۔ ہمارا شمار نہ تو خان میں ہے اور خان کے اونٹوں میں ۔ نہ ہم باغیوں کو جانیں اور نہ ہمیں بلوائیوں سے کوئی واسطہ ہے ۔ مگر دوست احباب اُن سے اس وجہ سے کتراتے تھے کہ مرزا صاحب کے پاس اگر وہ گئے اور مرزا صاحب نے اپنی معصومیت اور بیگناہی کا ذکر کیا تو خفیہ ہر طرف لگے ہی ہوئے تھے معلوم نہیں کیا جھوٹ سچ لگا دیں اور مرزا صاحب کی رفاقت میں

وہ بھی نہ صرف لئے جائیں چنانچہ مرزا صاحب احباب کی ان بے التفاتیوں کا حساب دل میں نوٹ کرتے جا رہے ہیں۔ گویا دل ایک فرد حساب ہے جس پر اُن نہ پوچھنے والی گونگی زبانوں کا جمع خرچ درج ہے۔ یہ شعر حساب کے پرچوں میں بھی پوچھا جا سکتا، حساب والے طلبہ نوٹ کریں۔

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی   اے شوق منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

شوق = عشق محبت۔ منفعل ہونا = نادم ہونا۔

جب مرزا صاحب کا محبوب اُن کے پاس نہیں آتا تھا تو مرزا صاحب بڑے بڑے اپنے عشق سے ہوائی باتیں کیا کرتے تھے۔ ایک دن یہ حسب دستور قدیم اپنے دل سے باتیں کر رہے تھے کہ عشق نے اِن کے محبوب پر کیچڑ اچھالنا شروع کر دی اور اول فول بکنے پر اُتر آیا اور کہنے لگا اجی مرزا صاحب! آپ نے ہماری ٹانگ بھی پھنسا رکھی ہے یعنی ایک ایسے شخص سے دل لگا رکھا ہے جس کی دشمنی مسلم ہے۔ اُس کے حرکات و سکنات سے کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ آپ کی جان کا دشمن نہیں ہے۔ اس پر مرزا صاحب جو بیچارے نہایت فدوی قسم کے عاشق تھے اور محبوب کی غائبانہ چہیتر کیا کرتے تھے، فرماتے ہیں اے توبہ کر۔ اس قسم کی بدگمانی اُن کی طرف سے اپنے دل میں پیدا کئے ہے تو یقین مان اس سے تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گا۔ منہ پر طمانچہ مار، اُٹھا بیٹھی کر اور مرغا بن اور آج سے تہیہ کرلے کہ اس قسم کا خیال اپنے دماغ میں کبھی نہ لائے گا۔

وحشت پہ میری عرصہ آفاق تنگ تھا   دریا زمین کو عرق انفعال ہے

عرصۂ آفاق: دنیا کا میدان یعنی وسیع میدان۔ عرقِ انفعال: خجالت اور شرمندگی کا پسینہ۔

مرزا صاحب کے بارے میں یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ عشق نے ان کے پیروں میں سنیچر باندھ رکھا تھا اور پھرتی کی طرح اُن کو کسی ایک جگہ قرار نہ تھا سینکڑوں جنگلوں، بیابانوں اور صحراؤں میں جنونِ عشق کے ہاتھوں یہ زمین کا گز بنے رہے۔ چنانچہ ان کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کی وسعت اُن سے پوچھ کر نہیں رکھی ورنہ اپنی وحشت کی کسوٹی پر کس کر بتاتے کہ صاحب اتنے میل، اتنے فرلانگ اور اتنے گز زمین کا رقبہ اور بڑھایا جائے تاکہ ان کی صحرانوردی کے لئے کافی ہو مگر چونکہ یہ ارض وسما کی تخلیق کے وقت وہاں موجود نہ تھے اور ان کی غیبت میں زمین وجود میں آگئی۔ لہذا مرزا صاحب کا خیال ہے کہ یہ جو آپ کو بڑے بڑے سمندر جگہ جگہ دنیا میں نظر آرہے ہیں مثلاً بحرِ ہند، بحرِ اسود اٹھلانٹک اوشن (ATLAMTIC OCEAN) ان میں جو چیز آپ کو پانی کی شکل میں دکھائی دے رہی ہے وہ پانی نہیں ہے وہ حقیقتاً اس زمین کا پسینہ ہے جو مرزا صاحب کی صحرانوردی کو دیکھ کر خجالت کے سبب اُس کے پنڈے سے چھوٹا ہے۔

غزل نمبر ۱۰۳

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو حذر کرو مرے دل سے کہ اُس میں آگ دبی ہے

حذر کرو: ڈرو، پرہیز کرو۔

جس طرح بیسویں صدی کا یہ شاعر ہمہ وقت ایک پورے دیوان سے مسلح

رہتا ہے اور کسی احمق کی تلاش میں رہتا ہے کہ اگر وہ اُسے کہیں اور مل جائے تو اپنا
چوغزلہ اور پنج غزلہ اُس کی جان پر مسلط کر دے یہی حال مرزا صاحب کا اپنے
محبوب کے عشق میں تھا کہ ہر وقت اُن کے دل میں آگ کی ایک انگیٹھی جلا کرتی
تھی جس پر اُس کی شکایتیں ابلا کرتی تھیں مگر مرزا صاحب چونکہ پرانی وضع کے
عاشقوں میں سے تھے اور عاشقانِ صادق کا پیشہ عشق کو چھپانا ہے اس لئے
وہ والدین اور محبوب کے گھر والوں سے راز رکھنے کی غرض سے ان چنگاریوں
کو دبائے رہتے تھے ایک دن محبوب نے باتوں باتوں میں کرید کرید کر ان
سے دریافت کرنا شروع کیا کہ بھلا مرزا صاحب یہ تو بتائیے کہ آپ کو ہم
سے شکایت کیا ہے؟ یہ سنتے ہی مرزا صاحب بولے کہ صاحب جہاں تک
شکایتوں کا تعلق ہے اُن کی تو کوئی حد و انتہا نہیں چونکہ آپ کے پاس وقت
کم ہے اس لئے آپ اگر اصرار نہ فرمائیں تو بہتر ہے ورنہ اس کا نتیجہ کچھ اچھا
نہ ہوگا کیونکہ شکایات ایک دو کی تعداد میں نہیں ہیں بلکہ اُن گنت ونگن
دل میں چھپے ہوئے ہیں اگر میں نے انھیں بیان کرنا شروع کیا تو صرف
اُن شکایات کے عنوانات ہی سنتے سنتے آپ جھک ہو جائیں گے اور بلا سبب
اچھی بھلی دوستی ایک عداوت کی شکل اختیار کر لے گی کیونکہ ہمارے پاس
اُن شکایات کا چوغزلہ اور پنج غزلہ ہے اگر ہم نے اُن میں سے ایک شکایت
بھی بیان کر دی تو مرغ کی اذان تک ایک ہی شکایت نامہ ختم نہ ہوگا لہٰذا
ڈریئے اُس وقت سے جب ہم آپ کے سامنے اپنی شکایات کا بہی کھاتہ کھول
کر بیان کرنا شروع کر دیں۔

غزل نمبر ۱۹۵

مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی — زندگی سے بھی میرا جی اِن دنوں بیزار ہے

مرزا صاحب زندگی بھر محبوب سے فرمایا کرتے تھے کہ "تو ہے ہماری زندگی"

ایک دن مرزا صاحب کو انھوں نے راستے میں پکڑ پایا اور اُن سے اُن کا قول دہرایا اور کہا کہ مرزا صاحب یہ جو آپ ہمیں اپنی زندگی اور جان کہتے ہیں اِس کا آخر مفہوم کیا ہے؟ مرزا صاحب غالباً اُس وقت بیوی سے لڑ کر بازار سودا سلف لینے نکلے تھے اور گھر پر ایسی ڈانٹ ڈپٹ کھائے تھے کہ زندگی سے بیزار تھے بولے کہ حضت! کیا بے وقت آپ میرا قول دہرا رہے ہیں اِس وقت معاملہ یہ ہے کہ مجھ پر تازہ ڈانٹ ڈپٹ پڑی ہے اس لئے مروت میں اپنی جان سے بیزار ہوں لہٰذا اگر میں آپ کو اِس وقت اپنی زندگی اور جان کہنے کا مطلب تیار دونگا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ خدانخواستہ میں آپ سے بیزار ہوں۔ ان شاء اللہ کسی دوسرے وقت حاضر ہو کر اس کا جواب دوں گا اِس وقت تو سودا سلف خریدنے جا رہا ہوں مجھے معاف کیجئے۔

آنکھ کی تصویر سر نامہ پر کھینچی ہے کہ تا — تجھ پہ کھل جائے کہ اُسکو حسرت دیدار ہے

مرزا صاحب کا محبوب اُن کی ہر بات کو لایعنی سمجھتا تھا مگر اس کے باوجود مرزا صاحب کی محبت کا یہ عالم تھا کہ یہ ڈاک خانہ سے روزانہ لفافے خرید خرید کر اُن کو خط لکھا کرتے تھے مگر وہ نہایت پابندی سے اِن کے خطوط ردّی کی ٹوکری میں ڈالدیا کرتا تھا اور کبھی اس کی زحمت تک گوارہ نہ کرتا تھا کہ مرزا صاحب نے اُن خطوط میں کیا آئیں بائیں شائیں باتیں لکھی ہیں چنانچہ مرزا صاحب نے

یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ ہمہ وقت چشم انتظار بنے رہتے ہیں، لفافے پر جہاں پتہ لکھا جاتا ہے ایک موٹی سی آنکھ کی تصویر بنا دیا کرتے تھے تاکہ اُسے لفافہ ملتے ہی معلوم ہو جائے کہ مرزا صاحب رات بھر اُس کی محبت کی رات جگا دیا کرتے ہیں اور سوتے نہیں۔

غزل نمبر ۱۵

پینس میں گذرتے ہیں جو وہ کوچے سے میرے کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

پینس = پالکی یا ڈولی۔

خدا جانے مرزا صاحب کے بارے میں اُن کا محبوب کیا رائے رکھتا تھا اور اُن کو کیا سمجھے ہوئے تھا کہ اگر وہ ان کے مکان کے قریب سے پینس میں بیٹھ کر بھی گذرتا۔ اور کہار تھک کر کندھا بدلنے لگتے تو وہ کہاروں پر ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دیتا۔ اس سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں یا تو ان کی معشوقہ اس درجہ موٹی اور بھدی تھی کہ کہاروں کو ہر چار قدم پر کندھا بدلنے کی ضرورت پیش آتی تھی اور وہ دو قدم آگے بڑھ کر ہانپنے لگتے وہ اس کا اظہار مرزا صاحب سے نہیں کرنا چاہتی تھی اس لئے کہاروں ہی پر ڈانٹ ڈپٹ کرتی تھی یا پھر دوسرا شبہہ یہ ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کی ڈیوڑھی کے پاس سے جتنی سواریاں ڈولیوں میں گذرتی تھیں اُن کو مرزا صاحب زبردستی گھر میں اُتروا لیا کرتے تھے۔ لہذا اس خوف سے اُس نے کہاروں کو حکم دیدیا تھا کہ خبردار جب مرزا صاحب کے مکان کے پاس سے گذرنا تو ایک منٹ بھی نہ رکنا ورنہ جانے کیسی الٹی پڑے۔

غزل نمبر ۱۶

خزاں کیا، فصلِ گل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

یہ شعر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جامع مسجد پر اردو بازار شروع ہونے سے پہلے جو کبوتروں اور مرغیوں کی دکانیں ہیں اور جہاں ہمہ وقت مرغیاں کبوتر اور بٹیر ٹاپوں میں بند نظر آتے ہیں، اُن سے متاثر ہو کر مرزا صاحب نے کہا ہے کیونکہ وہی ایسے طیور ہیں جو اپنی جان سے بیزار ہر وقت اپنی منقاریں پوٹوں میں ڈالے موت کے انتظار میں اونگھا کرتے ہیں اور اپنی بے بسی اور قید و بند پر رویا کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اُن طیور کی نظروں میں کیا بہار اور کیا خزاں۔ کیونکہ جو بیسوں گھنٹے وہ اپنے ہم جنسوں کی کھال کھنچتے دیکھتے ہیں اور زبان سے اُف تک نہیں کر پاتے۔

غزل ۱۷

رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغ کشتہ ہے   نبضِ بیمار وفا دودِ چراغ کشتہ ہے

بود = ہستی، حیثیت، چراغ کشتہ = بجھا ہوا چراغ، نبض دودی = نہایت کمزور نبض یا عالم نزاع کی نبض۔ بیمار وفا = یعنی عاشق۔

اس شعر میں مرزا صاحب گڑگڑا کر محبوب کی خدمت میں رحم کی درخواست گزار رہے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ارے بھئی اب نہ ہم میں "سٹھاسٹلی" باقی ہے اور نہ توانائی۔۔ ہم عشق کے ہاتھوں موت کے گھوڑے پر سوار ہونے جا رہے ہیں اور تقریباً محبت میں بالکل مُسلفا ہو کر رہ گئے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ اگر ہماری نبض پر

ہاتھ رکھ کر دیکھا جائے تو وہ اس درجہ دھیمی ہے کہ اُسے کوئی محسوس نہیں کر سکتا اور اُسے دیکھ کر لوگ چراغ کُشتہ کا شبہہ کرتے ہیں لہٰذا اگر زحمت نہ ہو اور آپ کے والدین اجازت دیں تو تھوڑی دیر کے لئے تشریف لے آیئے ورنہ ہم فیوز ہو جائیں گے اور اُس کے بعد آپ کو رانڈوں کی طرح زندگی بھر سفید دوپٹہ اوڑھنا پڑے گا۔

غزل ۱۸

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے — سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

نوا = آواز۔ نوا پرداز ہے = باتیں کر رہی ہے۔ شعلہ = زبانِ آتش۔ تو کہوے = گویا۔ چشم = آنکھ۔ دیکھنے کے علاوہ غم و غصہ اور محبت کا اظہار مطالب کی ادائیگی آنکھوں سے بھی ہوتی ہے گویا آنکھ زبان کا بھی کام دیتی ہے چنانچہ محاورہ بھی ہے "آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کرنا"۔

یہ شعر مرزا صاحب نے غالباً حقہ پیتے وقت ایسے موقع پر کہا ہے جب حقہ پورے مزہ پر آچکا ہے۔ چلم سے شعلے نکل رہے ہیں اور اُن شعلوں کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا دھواں بھی ہے۔ اور مرزا صاحب ان کوئلوں کے نکلے ہوئے شعلے اور اُس کے دھوئیں کی لکیر سے حسینوں کی آنکھوں میں لگے ہوئے کاجل کا تصور کر رہے ہیں۔ اب ملاحظہ ہو اس شعر کا مطلب معشوق تو بہر حال ہر وقت اپنے دونوں لب سیئے رہتا ہے اور اس کی حالت ایک نئے بٹیر کے مانند ہوتی ہے جس کو کبھی بولنا نہ گیا ہو لیکن محبوب کے چہرہ پر جو دو آنکھیں لگی ہوئی ہیں اُن سے اُس کے دلی جذبات کا اظہار ہوتا ہے

اور جبر اُجب بھی عشاق کی نظریں اُن آنکھوں پر پڑتی ہیں اُنھیں ہر وقت خفگی اور غصّے کے شعلے بھڑکتے دکھائی پڑتے ہیں۔ چونکہ مرزا صاحب اُس وقت حقہ پی رہے تھے اور اُن کے حقہ کی چلم سے شعلہ نکل رہا تھا اور شعلہ زبان سے مشابہ ہوتا ہے اور آواز بھی زبان سے نکلتی ہے اس لئے مرزا صاحب اُس شعلے کو معشوق کی آواز شعلہ غضب سے تشبیہ دے کر اپنا مطلب حل کر لیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ جو دنیا کی ساری "معشوقائیں" اپنی آنکھوں میں کاجل لگائے لگائے پھرتی ہیں وہ در اصل اُن کی چلم کے شعلے کا دھواں ہے جسے وہ بغیر اجازت استعمال میں لاتی ہیں۔

پیکرِ عشاق سازِ طالعِ ناساز ہے نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے

پیکر = جسم۔ ساز = باجہ۔ طالع ناساز = بخت خفتہ یا طالع خوابیدہ۔ نہلے اور دیوں پر آپ نے بکس کے لکھنے کی پھبتی تو سنی تھی یہاں مرزا صاحب عاشقوں کے جسم کو بدنصیبی کا باجا قرار دیتے ہیں اور وہ اُن کو باجا کہنے میں اِن معنوں میں حق بجانب ہیں کہ ہر وقت اُن سے نالہ و فریاد کی بے سُری دُھنیں نکلتی رہتی ہیں۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ یہ عشاق جو رات دن اپنے محبوب کی یاد میں چیخا کرتے ہیں یہ آوازیں وہ بدنصیب خود نہیں نکالتے بلکہ یہ آوازیں ستاروں کی گردش کا نتیجہ ہیں۔ مرزا صاحب اس شعر میں صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ عشاق مادر زاد بدقسمت ہوتے ہیں اور نالہ و آہ و زاری کرنے کے لئے دنیا میں بھیجے گئے ہیں گویا جس طرح بھانڈ شادی بیاہوں میں نقلیں کرنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں

اُسی طرح عشاق معشوقوں کی جان کو رونے کی خاطر دنیا میں آئے ہیں۔

غزل نمبر ۱۹

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

سہی = مانو، جانو یا خیال کرو۔

ساری دنیا کے معشوقوں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے اور اُن کی ورکنگ کمیٹی (WORKING COMMITEE) میں یہ ریزولیشن (RESOLUTION) "جمالیاتی طور پر" پاس ہو چکا ہے کہ یہ تمام عشاق سٹری سودائی ہیں اور ان کو جلد سے جلد پاگل خانے بھیجدیا جائے ورنہ راہ چلتوں پر ڈھیلے بازی شروع کر دیں گے۔ مرزا صاحب بھی جب عشق میں دیوانگی کی منزل پر پہنچے تو معشوقوں نے اور بالخصوص اُن کی معشوقہ نے مشہور کر دیا کہ مرزا صاحب پر دیوانگی کا دورہ پڑا ہے اور وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں۔ اس پر مرزا صاحب نے یہ کہلا بھیجا کہ اب تو چاہے آپ ہم کو پاگل کہیں یا سٹری سودائی ہم نے تو آپ کو اس قابل نہیں رکھا کہ کہیں سے آپ کی بات چیت آئے اور آپ سے کوئی معقول لڑکا شادی کرنے پر آمادہ ہو جائے لہٰذا ہم نے تو اپنی طرف سے کوئی کسر اور کوئی دقیقہ اِس چیز کو مشتہر کرنے میں باقی نہیں رکھا ہے کہ آپ کا ہم سے کوئی تعلق ہے اور ہم آپ پر بری طرح مرتے ہیں۔ ان حالات میں اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ کچھ نہیں تو آپ اِس احسان ہی کو تسلیم کر لیں کہ میری وحشت کے سبب آپ کی اتنی شہرت ہو گئی۔

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی ۔ اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

اگر یہ شعر کسی لکھنؤ والے کے سامنے پڑھ دیا جائے تو وہ اسے سُنکر دونوں کانوں میں انگلیاں دے لے گا۔ کیونکہ "میرے ہونے میں" ذم کا پہلو ہے۔ سہی = منظور کرو، قبول کرو۔ مرزا صاحب محبوب سے فرماتے ہیں کہ صاحب! یہ جو آپ کے یہاں بڑے بڑے مشاعرے، بڑی بڑی محفلیں اور بڑی بڑی تقریبیں از قسم سونڈن۔ گھوڑ چڑھائی یا شادی بیاہ ہوتی رہتی ہیں اُن میں آپ ہمیں کبھی نہیں بلاتیں۔ آپ کو شاید ہماری طرف سے یہ غلط فہمی ہے کہ ہم دستر خوان پر بیٹھتے ہی بجائے کھانا کھانے کے بے تکی داستان لے کر بیٹھ جائیں گے۔ اور آپ کی رسوائی کا سبب بنیں گے۔ بہر حال آپ کا یہ خیال صحیح ہو یا غلط مجھے اس سے کوئی واسطہ نہیں مگر کبھی کبھی خلوت اور تنہائی میں ہی بلا لیا کیجئے وہاں تو کسی کی موجودگی کا یا رسوائی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس لئے آپ کی مجلس نہ سہی خلوت ہی سہی میں بہر حال ہر وقت ہاتھ باندھے آپ کے دعوت نامہ کے انتظار میں" جاگتے رہو، جاگتے رہو، یا علی حیدرؑ" کے نعرے بلند کرتا ہوں گا۔

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے ۔ غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

سہی = برائے ایجاب قبول اور ماننا۔

مرزا صاحب کو اس کا تو پورا یقین تھا کہ ان کا محبوب رقیب کو اپنے ماں باپ سے بھی زیادہ چاہتا ہے اور اسی وجہ سے اُس کو مرزا صاحب کی صحبت سے نفرت اور رقیب کی سچی محبت کا پورا پورا یقین تھا۔ اور اس کی

وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ ہر وقت محبوب کے گھر کے سامنے اس طرح بیٹھا رہتا تھا جیسے قصاب کی دکان کے سامنے کتا بیٹھتا ہے اور اپنی محبت کی الٹی سیدھی باتیں سا اِن کو بتا کر ٹپا تار ہتا تھا۔ اِدھر مرزا صاحب بلا شرکت غیرے محبوب کی محبت میں سوالیہ جملہ کا نشان بنے ہوئے تھے اور رقیب کی دشمنی میں زہر کھانے پر آمادہ تھے۔ لہذا آخر میں جب اِن کے (مرزا صاحب) بنائے کچھ نہ بنا تو اب آپ محبوب سے طنزاً کہتے ہیں کہ ارے بھائی اگر آپ رقیب کو اپنا سچا ہمدرد سمجھتی ہیں تو سمجھئے مگر کبھی کبھی اس خاکسار کے بارے میں بھی اگر آپ غور و فکر سے کام لیں تو اس نتیجہ پر پہنچیں گی کہ یہ بندۂ ناچیز شہر کے اندیشے میں نہیں بلکہ آپ کی محبت میں دبلا ہوتا چلا جا رہا ہے۔

ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ہم کو آپ ایسا گھٹیا قسم کا عاشق نہ سمجھئے جو لپاڈگی اور مار پیٹ سے گھبرا کر محبت کے کوچے سے بھاگ کھڑا ہو خدا جانتا ہے کہ ایک نہیں دس ہزار مولوی صاحبان اگر ہم کو سمجھانے کی کوشش کریں کہ حضرت آپنے یہ کیا مصیبت اپنی جان پر مسلط کر رکھی ہے جو عشق کو لادے لادے اِدھر اُدھر مارے مارے پھر رہے ہیں تو یقین مانئے ہم اِن مولوی صاحبان سے بھی صاف صاف کہہ دوں گا کہ آپ تو عشق کو مصیبت بتاتے ہیں اگر اسے آپ گدھے کی لادی بھی قرار دیتے تو بھی ہم اس سے دست کش نہ ہوتے۔

کچھ تو دے اے فلک نا انصاف آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

سہی = یہاں تاکید کے معنوں میں ہے اور اٹھتے بیٹھتے اُسے برا بھلا کہتے رہے ہیں

اُن کا خیال ہے کہ یہ سارے مظالم جو محبوب کی معرفت اُن پر توڑے جا رہے ہیں اُن میں آسمان کا ہاتھ ہے جس کا عالم یہ ہے کہ بقول شخصے "مارے اور رونے نہ دے" چنانچہ مرزا صاحب فلک سے مخاطب ہو کر فرما رہے ہیں کہ اگر تشدد کرتا ہے تو کر مگر خدا کے لئے آہ و فریاد کے ذریعہ ہم کو دل کا غبار ہی نکالنے کی اجازت دیدے ورنہ عشق کے بوجھ سے یوں ہی ہماری کمر کیا کم ٹوٹی جا رہی ہے جواب تو آہ و زاری کا بوجھ بھی ہم پر لادے دے رہا ہے۔

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ نہ سہی وصل تو حسرت ہی سہی

سہی = غنیمت ہے ۔ حسرت = تمنّا ، آرزو۔ چھیڑ = ہنسی ، ٹھٹھا ، دل لگی ،

مرزا صاحب نے ایک دن معشوق کی بیوفائیوں سے تنگ آ کر اس کا تہیّہ کر لیا تھا کہ وہ عشق کے کوچے سے باحسرت و یاس کنارہ کش ہو جائیں گے اور کوئی دوسرا دھندا شروع کر دیں گے اس پر ان کے ایک دوست نے کہا کہ مرزا صاحب یہ تو کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ اتنے دنوں کی محنت کے بعد آپ اس طرح مایوس ہو کر وصل محبوب سے دست کشی اختیار کر لیں ۔ اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو آپ ایسا کیجئے کہ دست کش تو بہر حال آپ ہو ہی رہے ہیں ۔ لہذا جب کبھی وہ رستے گلی میں دکھائی پڑیں یا آپ کے مکان کے پاس کسی دکان پر سودا سلف کے سلسلے میں تشریف لائیں تو آپ چھیڑ خانی کی خاطر دو ایک آوازے اُن پر کس دیں وہ یوں کہ اگر آپ کو ان کا وصل نہیں نصیب ہوتا تو وصل کی حسرت ہی غنیمت ہے ۔ ذکر العیش نصف العیش۔

غزل نمبر ۲۰

کرتا ہے بس کہ باغ میں تو بے حجابیاں　　آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

بے حجابی ۔ بے حیائی ۔

مرزا صاحب کا محبوب سدا کا ہرجائی ہے اور اُس کی زندگی کا مقصد محض سیر و تفریح اور سنیما بازی تھا۔ شام کو چہل قدمی کرنے نکلا ہے تو پیچھے پیچھے عشاق کا جلوس ہے اور آگے آگے رقیب باادب باملاحظہ ہوشیار کرتا چلا جا رہا ہے اور باغ میں پہنچکر وہ نجانے کون کون سی حرکتیں اور کیسی کیسی رنگ رلیاں کرتا ہے کہ مرزا صاحب اُن حرکات کا تصور کر کے پسینے پسینے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جہاں کسی نے مرزا صاحب سے باغ کا ذکر کیا مرزا صاحب کو اُن کے محبوب کی شرمناک حرکتیں یاد آ گئیں اور انہوں نے شرم و حیا سے آنکھیں نیچی کر لیں یہاں تک کہ مرزا صاحب کو پھولوں کی خوشبو سے بھی شرم آنے لگی تھی۔ کیونکہ پھولوں نے ان کے محبوب کے اُن حرکات کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھا تھا۔ باغ سے اس وجہ سے نفرت ہو گئی کہ باغ میں اپنے محبوب کو رنگ رلیاں کرتے دیکھا تھا اور ہوا کے جھونکوں سے بوں دور دور اُن حرکات کی تشہیر ہوتی تھی مگر مرزا صاحب چونکہ محبوب سے حد درجہ محبت کرتے تھے اس لئے انھیں اور زیادہ شرم و حیا محسوس ہوتی تھی۔ غرض کہ اپنی حرکتوں کے جملہ حقوق اُنھوں نے اپنے نام محفوظ کر رکھے تھے اور شرمندہ ہونے کی بیگار مرزا صاحب کے سر تھی۔

غزل نمبر ۲۱

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گذری غالب　　ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اس رنگ = اس بے سروسامانی اور پریشانی سے

مرزا صاحب اوّل تو گھر کے روزمرہ کے اخراجات سے عاجز تھے دوم انھوں نے مفلسی میں غلطی یہ کی دو دو گھر کر رکھے تھے یعنی منکوحہ بیوی کی موجودگی میں اپنے آپ کو ڈومنی کے عشق میں مبتلا کر رکھا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف ڈومنی کی فرمائشیں اور دوسری طرف گھر کا روزمرہ خرچ، ان کے لئے مصیبت بنا ہوا تھا اسی لئے مرزا صاحب ہر وقت پریشان رہنے لگے۔ ایک دن جب مرزا صاحب پیسے سے بالکل ٹوٹے ہوئے تھے کہ دونوں گھر والیوں نے اُن سے خرچ کا مطالبہ کیا اس پر جب مرزا صاحب کے بنائے کچھ نہ بن پڑی" تو انھوں نے اللہ میاں پر دانت پیسنا شروع کر دیئے اور فرمانے لگے کہ اے قادرِ مطلق تو نے اپنے ہر بندے سے وعدہ کیا ہے کہ تو اس کی خبر گیری کرے گا اب بتا کہ ان دو دو گھوڑیوں کو کیوں کر پالوں اور ان کے لئے دانہ گھاس کہاں سے فراہم کروں۔

غزل نمبر ۲۲

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے　　بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے

بنا = ممکن ہونا +

مرزا صاحب نے جس محبوبہ سے عشق فرمایا تھا اُنھیں مرزا صاحب کی صورت سے نفرت تھی چنانچہ اُنھوں نے کبھی مرزا صاحب کے گھر آنیکی زحمت گوارہ نہ کی تھی ہمیشہ مرزا صاحب ہی کو الٹے اُن کے گھر جانا پڑتا اور جب مرزا صاحب پہنچتے تو اُن کے یہاں ایک محفل گرم ہوتی جس میں ہر فرقے ہر گروہ اور ہر مذہب کے

لوگ نظر آتے چنانچہ مرزا صاحب کبھی ایک کونے میں دبک کر بیٹھ جاتے مگر وہ مرزا صاحب کی ذرہ برابر پرواہ نہ کرتی اور ان کی موجودگی میں غیروں سے ہنسی مذاق اور چہلیں کرکے مرزا کو ستاتی اور مرزا صاحب بیچارے خون کے گھونٹ پی پی کر رہ جاتے کیونکہ وہ وہاں تنہا تھے اس لئے اگر وہ ایک حرف شکایت کبھی زبان پر لاتے تو سارے محفل والے اُن پر پل پڑتے۔ لہذا مرزا صاحب کہتے ہیں کہ اگر شرم و حیا مانع نہ ہوتی تو میں سبھوں کا خون پانی ایک کر دیتا مگر مصیبت یہ تھی کہ اوّل تو وہاں جتنے لوگ تھے اور جن سے وہ اشارے بازیاں رہی تھی ان کو میں جانتا نہ تھا دوسرے اگر میں اعتراض کرتا بھی تو مجھکو اُس بزم سے نکال باہر کیا جاتا ایک طرف غیرت اور حمیت کا تقاضہ تھا کہ میں اُس بزم سے نکل بھاگوں اور دوسری طرف دل کا تقاضہ تھا کہ یہیں بیٹھے رہو۔ لہذا آخر میں مرزا صاحب نے فیصلہ کیا کہ پھر درویش بہ جان درویش اب تو نکاح کرنے کے بعد نجات کی کوئی صورت نہیں بے غیرتی لازماً ہی ہے خیریت اسی میں ہے کہ بےحیائی کا لباس پہنے چپ سادھے رہو دیکھو اللہ کیا دکھاتا ہے اور اِس اشارے بازی کے بعد اور کیا صورت پیش آتی ہے ؎

دل ہی تو ہے سیاست درباں سے ڈر گیا　　　میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کئے

مرزا صاحب اگرچہ محبوب کی ہر ترش و تلخ بات شربت کا گھونٹ سمجھ کر پی جاتے تھے مگر چونکہ وہ عاشق تھے۔ اور عاشق معاف فرمائیے گا ہمیشہ کے بزدل ہوتے ہیں اس لئے محبوب تو محبوب اُس کے کوچے کے کتوں تک سے وہ ڈرتے تھے۔ مرزا صاحب کا دستور تھا کہ یہ محبوب کو دیکھنے کے بہانے فقیروں کا سوانگ بھر کر اُس کی

ڈیوڑھی پر جایا کرتے تھے لیکن ایک دن جب انھیں محبوب کے دربان نے ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا اور انھیں صدا تک نہ لگانے دی تو کئی روز تک یہ دربان کے ڈر سے محبوب کے کوچے میں نہیں گئے چند روز بعد جب پھر یہ بے غیرت بنکر تشریف لے گئے تو اتفاق سے پہرہ دار بازار سے سودا سلف لینے گیا ہوا تھا لہٰذا اس کی غیر موجودگی میں محبوب نے دروازے پر نکل کر ان سے پوچھا کہیے ! مرزا صاحب ! اتنے دنوں تک کہاں رہے انھوں نے جواب دیا کہ صاحب کیا کریں آپ نے دروازے پر جو ایک بلڈاگ قسم کا پہرہ دار پال رکھا ہے وہ ہم کو آپ کی ڈیوڑھی کے آگے صدا تک نہیں لگانے دیتا اور ہم کو دیکھتے ہی ہمارے پیچھے کتے چھوڑ دیا کرتا ہے اب ہم اتنے حقیر اور ذلیل تھوڑے ہیں کہ آپ کے دربان کا کتا تک ہم پر آنکھیں نکالے ورنہ بھلا کیسے ممکن تھا کہ میں بغیر ایک ہانک لگائے آپ کے دروازے کے پاس سے گزر جاؤں۔

بے صرفہ ہی گذرتی ہے ہو گرچہ عمر خضر   حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے

بے صرفہ = بے فائدہ ۔ حضرت = حضرت خضر + کل = روز قیامت۔

اس شعر میں مرزا صاحب اپنی بیکاری اور بے روز گاری پر اظہار افسوس کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت خضر جن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ دنیا بھر میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں اور صرف بھولے بھٹکوں کو رستہ بتایا کرتے ہیں مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ان کی زندگی بھی تو ہرزہ سرائی میں گذری ہے وہ بھی میری طرح اپنی درازی عمر اور بیکاری پر صد درجہ افسوس کریں گے کہ ہم اتنے عرصے دنیا میں بلا سبب ہی گذرتا رہا اور کوئی قرینے کا کام نہ ہو سکا۔

کس روز تہمتیں نہ تراشا کئے عدو   کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کئے

تہمت تراشنا = جھوٹے الزام لگانا۔ بہتان باندھنا۔ آرے چلنا، رنج و مصیبت اٹھانا۔

مرزا صاحب کا رقیب دن بھر مرزا صاحب کی بیخکنی میں لگا رہتا تھا۔ کبھی مرزا صاحب کے بارے میں اڑا دیتا کہ آج مرزا صاحب حوضِ قاضی کے کنارے چاٹ والے سے قرض چاٹ کھا رہے تھے اور کبھی اڑا دیتا کہ مرزا صاحب پر کسی لڑکی کے اغوا کے جرم میں مقدمہ قائم ہو گیا ہے۔ غرض اسی قسم کی تہمتیں مرزا صاحب پر لگا لگا کر اپنا الو سیدھا کرتا رہتا اور محبوب رقیب کے کہنے میں آ کر مرزا صاحب پر نت نئے مظالم توڑا کرتا۔ مرزا صاحب پریشان تھے کہ رقیب محبوب کی نظروں میں انھیں اتنا ذلیل اور خوار کرتا رہتا ہے۔ اس کا کیا توڑ کریں لہٰذا مرزا صاحب سوائے دانت پیسنے کے اور کر ہی کیا سکتے تھے چنانچہ فرماتے ہیں کون سی تہمتیں اب تک عدو نے ہمارے خلاف نہیں تراشیں ہیں اور کون سی بچ رہی ہیں۔ اپنے تہمتوں کے آرے تو ہمارے اوپر دن رات چلتے ہیں۔ اور چلتے رہیں گے۔

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو   دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

مرزا صاحب جب اپنے محبوب پر شروع شروع عاشق ہوئے تو اس نے اپنے بوسوں کا بھاؤ اتنا بڑھا رکھا تھا کہ سونے کے داموں کسی کو میسر نہ ہوتے۔ چنانچہ مرزا صاحب جب کبھی اس سے بوسہ طلب کرتے تو وہ ہمیشہ سیان کرتا اور آدھا بوتھانی بوسہ دینے پر راضی نہ ہوتا لیکن کچھ عرصہ بعد مرزا صاحب کو معلوم ہوا کہ

اُس نے اپنے رخساروں پر سے تمام بندشیں ہٹالی ہیں اور چوراہے پر کھڑے ہوکر نعرے لگاتا ہے "کم اپ جنٹلمین ٹرائی یور لک" یعنی آیئے تشریف لایئے مفت بوسہ لیجئے اور چلے جایئے گویا بوسوں کی سبیل لگادی۔ چنانچہ ایک دن جب وہ مرزا صاحب سے ایک چوراہے پر ملا تو مرزا صاحب کے مطالبہ کئے بغیر وہ بوسہ دینے پر آمادہ ہوگیا۔ مرزا صاحب سخت حیران تھے کہ اس کے رویہ میں یہ اچانک تبدیلی کیسے پیدا ہوئی آخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ہو نہ ہو رقیب نے اپنی صحبت میں رکھ کر اُس کے رخساروں میں ایسے جراثیم پیدا کر دیے ہیں کہ اب بغیر بوسے کے اُسے چین ہی نہیں آتا

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدہ وفا کئے

مرزا صاحب کو ہمیشہ سے اپنے محبوب سے غیر معمولی عقیدت تھی اور وہ اس کے کسی فعل کو برا نہ کہتے تھے اور ہر شخص سے اُس کے عادات واطوار کی تعریفیں کیا کرتے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ بلا کا ضدی بھی ہے اور ضد میں وہ جو بھی نہ کر گذرے کم ہے لیکن اگر آپ اُس کی چھیڑ کرتے رہیئے اور اسے بہلاوے میں ڈالے رہیئے تو ایک نہیں اُس سے سیکڑوں وعدے جو اس نے کبھی کئے تھے پورے کرا لیجئے لیکن اگر آپ نے ضد دلادی تو معقول سے معقول بات بھی جس کا اُس نے آپ سے وعدہ کیا ہے پوری نہ کرے گا۔ مرزا صاحب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ کبھی تو وہ مرزا صاحب کے پاؤں تک دبانے کو تیار ہوجاتا تھا لیکن اگر کسی بات پر ضد پاگیا تو مرزا صاحب کا انتقال تک ہوجائے اور انھیں گھاس نہ ڈالے گا۔

غزل نمبر ۲۳

نظارہ کیا حریف ہو اُس برقِ حُسن کا جوشِ بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہے

حریف = مقابل +

اِس شعر میں مرزا صاحب صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ اس کا حسن برق کی طرح نظر کو خیرہ کرنے والا ہے اور اُس کا نقاب جوشِ بہار ہے گویا جوش بہار میں جلوہ برق پوشیدہ ہے مرزا صاحب کے اس شعر میں بھی ایک تلمیح ہے جس کو مرزا صاحب نے اسی طرح ادا کیا ہے چونکہ جوانی میں مرزا صاحب حد درجہ دل پھینک واقع ہوئے تھے لہذا رستہ چلتے برقع پوش عورتوں پر مسمریزم کی مشق فرماتے رہتے تھے ایک دن مرزا صاحب ایک راستے سے گذر رہے تھے کہ ان کی محبوبہ سامنے سے برقع میں نظر آئیں۔ مرزا صاحب پر ان کو دیکھتے ہی غشی کا عالم طاری ہو گیا اور وہیں پر بے ہوش ہو گئے۔ گھر لانے پر جب اُنھیں ہوش میں لایا گیا تو فرمانے لگے کہ صاحب آج تو بال بال کیا سوا بال بچ گیا ورنہ مرجانے میں کوئی کسر باقی نہ تھی کیونکہ اگر وہ اپنے چہرہ پر نقاب نہ ڈالے رہتیں تو بندہ تو ان کے آتشِ حسن سے جل کر شعلہ ہو جاتا یہ سمجھ لیجئے کہ میری نظر اُن کی نقاب ہی پر پڑی تھی کہ آنکھوں میں ایسی چکا چوند مچی کہ یہ سمجھا کہ اب آنکھوں سے معذور ہوا اور ساری زندگی کسی مزار کے سامنے گھڑا بجاتے گذرے گی۔ بہر صورت یہ تھا اصل واقعہ جس کو مرزا صاحب نے خوبصورت انداز میں بیان کر دیا ہے۔

گزرا اسد مسرت پیغام یار سے قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

مرزا صاحب کو اپنے معشوق کے چال چلن پر ہمیشہ سے شک رہا اور ان کا خیال تھا کہ وہ نوکروں چاکروں سے بھی اپنے تعلقات پیدا کر لیتا ہے لہٰذا مرزا صاحب ان نوکروں کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے چنانچہ ایک دن مرزا صاحب نے ایک نوکر سے کہا کہ دیکھو جی یہ خط لے جا کر ہمارے محبوب کو پہنچا دو۔ مگر آدمی کو روانہ کرنے کے بعد مرزا صاحب کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ جب قاصد ان کا خط لیکر اُن کی خدمت میں حاضر ہوگا تو وہ ضرور پوچھیں گی کہ تم کون ہو کہاں سے آئے ہو۔ تمھاری ولدیت اور تمھارا مذہبی نمبر کیا ہے؟ اتنی باتیں اگر محبوب نے قاصد سے کیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ قاصد کو مرزا صاحب پر ان معنوں میں افضلیت حاصل ہو جائے گی کہ مرزا صاحب زندگی بھر اُن کے دیدار کو ترستے رہے اور بات چیت کرنا تو بڑی چیز ہے اُس نے اُن کی طرف کبھی نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا یہ قاصد یعنی گھر کا ادنیٰ ملازم اس کو یہ عزت اور یہ مرتبہ حاصل ہو جائے کہ محبوب اس سے جواب سوال کر کے آپ اپنی طرف مخاطب کرے یہ خیال آتے ہی مرزا صاحب اپنا خط قاصد سے واپس لینے پر آمادہ ہو گئے اور اسی رشک کے سبب انھوں نے محبوب سے خط وکتابت ہی بند کر دی کہ کہیں اس خط وکتابت کی آڑ میں قاصد ان کی محبوبہ کو لے کر کسی طرف نہ چل دے۔

غزل نمبر ۲

غیر کو یارب وہ کیونکر منع گستاخی کرے   گر حیا بھی اُس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

خدا جانے مرزا صاحب کا رقیب کس طبقہ اور کس گروہ سے تعلق رکھتا تھا کہ وہ ایک شرمیلی اور حیا دار لڑکی کے ساتھ ایسی ایسی دست درازیاں اور گستاخیاں کرتا تھا کہ وہ شرم و حیا سے آنکھیں نیچی کر لیتی اور پسینہ پسینہ ہو جاتی مگر مرزا صاحب بیچارے ایسے فدوی قسم کے عاشق تھے کہ اُسے روک بھی نہیں سکتے تھے اس کا کام لے دے کر یہ رہ گیا تھا کہ رقیب کی گستاخیوں کو درج رجسٹر کرتے۔ چونکہ مرزا صاحب کے جاسوس رقیب کے پیچھے ہر وقت سائے کی طرح لگے رہتے تھے اِس لئے مرزا صاحب کے پاس اُن کے رقیب اور محبوب کے درمیانی تعلقات کا ایک چارٹ رکھا رہتا تھا۔ جس میں وہ روزمرہ کی اطلاعیں درج کرتے رہتے تھے۔ مثلاً یہ کہ آج رقیب نے کس کس نوعیت کی گستاخی اِن کی محبوبہ کی شان میں کی اور وہ کس رفتار سے شرمائیں اور کس کس انداز سے انھوں نے رقیب کی بے حیائی پر اشک افشانی کی اس کے علاوہ اس چارٹ میں وقت گھنٹہ اور منٹ درج ہوتے تھے جن میں مرزا صاحب لکھتے رہتے تھے کہ آج تین بجکر سینتالیس منٹ پر رقیب بوالہوس نے اُن کے ایک زوردار چٹکی لی۔ ساڑھے تین بجے ایک عدد گھونسے سے نوازا۔ پانچ بجکر سینتالیس منٹ پر اِن کی محبوبہ نے نہ جانے کس بات پر شرم و حیا سے آنکھیں نیچی کر لیں اور ڈیڑھ گھنٹے تک چپ سادھے پڑی رہیں غرض خدا جانے رقیب روسیاہ نے کس قسم کا بیہودہ پن اُن کی محبوبہ کے ساتھ کیا تھا کہ شرم تو شرم اُن کی حیا تک کو اُس کی حرکتوں پر شرم آتی تھی مگر رقیب بھی اتنا ڈھیٹ تھا کہ پہلے چٹکی بگوٹے لیتا تھا اور جب وہ اُس کی گستاخی سے شرما تیں تو یہ بحث اور تکرار پہ اتر آتا اور اپنی حرکات

کے جواز میں دلائل پیش کرتا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو مرزا صاحب کا رقیب کوئی بیحد دولت مند شخص تھا جو اُن کی محبوبہ کے گھر بھر کی کفالت کرتا تھا یا اتنا بڑا غنڈہ تھا کہ اُس سے اُن کے گھر والے اور خود محترمہ اس درجہ ڈرتی تھیں کہ اُسے اُس کی گستاخی پر ٹوک تک نہ سکتی تھیں۔ اسی وجہ سے وہ خجالت سے سر جھکائے رہتیں اور اُس کی حرکتوں پر شرما شرما کر رہ جاتیں۔

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائیے

لت = بُری عادت۔

جس طرح کوئی افیونی افیون کا عادی ہو جاتا ہے اور ایک چسکی کے بعد دوسری چسکی اور دوسری کے بعد تیسری سے اپنا سرور قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے اُسی طرح مرزا صاحب کے شوق کو نالے کھینچنے کی بری عادت پڑ گئی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ مرزا صاحب دمبدم نالہ کھینچتے رہیں چونکہ مرزا صاحب کو نالہ کھینچنے میں ہاتھ پیر ہلانا نہیں پڑتے تھے اور تنہا دل کو نالہ کھینچنے میں زور لگانا پڑتا تھا اس لئے دل نالہ کھینچتے کھینچتے بالکل نحیف ہو گیا تھا اُس میں اتنی توانائی باقی نہ رہی تھی کہ نالہ تو بڑی چیز ہے اُسے سانس لینے تک میں تکلیف ہوتی تھی۔ مگر مرزا صاحب کا یہ عالم تھا کہ نالے پہ نالے کھینچتے رہتے تھے کیونکہ نالوں کی کھینچائی کا خون ان کے منھ کو لگا ہوا تھا حالانکہ اُن کا دل پکار پکار کر کہتا کہ حضت یہ آپ کیا حرکت فرما رہے ہیں ہمارا انتقال ہوا جا رہا ہے مگر مرزا صاحب کا شوق اُن کو خاموش بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔

دور چشم بد تری بزم طرب سے واہ واہ   نغمہ ہو جاتا ہے گر نالہ مرا آ جائے ہے

مرزا صاحب کا محبوب تو بہر حال نہایت سنگدل ظالم اور جابر تھا ہی مگر مرزا صاحب اُس سے اس درجہ خوف زدہ تھے کہ وہ اس کے خلاف کھل کر کچھ نہ کہہ پاتے تھے چنانچہ طنزیہ انداز میں فرماتے ہیں کہ صاحب اُن کی بزم طرب عیش و نشاط اور شادمانی سے ایسی معمور ہے کہ اگر یہ اپنا کوئی نالہ یا اپنی کوئی آہ اس کی بزم میں بھیجتے ہیں تو وہ بھی اُس کی رنگ رلیوں کے سبب خوشی اور نغمہ میں بدل جاتی ہے مرزا صاحب کو یہ شعر کہنے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ وہ ایک مرتبہ جب محبوب کی بزم نشاط میں مرزا صاحب کی آہ وزاری کا تذکرہ آیا تو رقیب اور ان کے محبوب دونوں نے خوب خوب قہقہے لگائے اور مرزا صاحب کی وفاداری کا خوب ہی خوب مذاق اڑایا مثلاً اگر کسی نے کہا کہ آج مرزا صاحب نے تین ہارس پاور (HORSE-POWER) کا ایک نالہ محبوب کی یاد میں آسمان کی طرف سر کیا تو اُس پر رقیب نے اور خود محبوب نے کہا کہ جی ہاں ہم نے بھی اُس کو راکٹ کی شکل میں چاند کی طرف جاتے دیکھا تھا۔

ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا   رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

عاشق یہ شادی"۔ پری رخ = حسین، پری چہرہ۔ رنگ کھلنا = چہرہ پہ رنگ کا زیب دینا، خوبصورت ہونا۔ رنگ اڑنا = چہرہ فق ہونا۔

اس شعر سے یہ شبہہ ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کے معشوق پری رُخ نے کسی دوسرے سے نکاح کر لیا ہے اور وہ "امید" سے ہے ...... عموماً جب عورتیں امید سے ہوتی ہیں یا اُن کے پاؤں بھاری ہو جاتے ہیں تو اگرچہ جسم کا خون کم

ہو جاتا ہے اور چہرہ کا رنگ اڑنے لگتا ہے لیکن چہرے کی سرخی کم ہونے کے باوجود جسم کچھ ایسا گداز ہو جاتا ہے کہ چہرہ پہلے سے زیادہ دل کش نظر آنے لگتا ہے۔ مرزا صاحب اس شعر میں حقیقتاً کہنا تو یہی چاہتے تھے مگر چونکہ محبوب پر جان دیتے ہیں اس لئے اِس کا بھی اظہار کرنا نہیں چاہتے کہ اُن کی محترمہ کی شادی کسی دوسری جگہ ہو گئی تھی اور وہ ان حالات سے گذر رہی تھیں دوسرے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مرزا صاحب کا معشوق پہلے ہی سے نازک زناک تھا اُس کے بعد جب اُس پر عشق کا بوجھ پڑا اور چربی گھلی تو نزاکت میں اور اضافہ ہو گیا اور جوں جوں دُبلا ہوتا گیا رنگ کھلتا رہا مگر ساتھ ہی ساتھ ہر وقت چونکہ اس کا خطرہ بھی لگا ہوا تھا کہ کہیں ماں باپ کو عشق کی اطلاع نہ ہو جائے اس لئے مارے خوف کے رنگ اُڑتا رہتا تھا اور مار پیٹ کا خوف لگا رہتا تھا۔

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسدؔ پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

مرزا صاحب کی جب مالی حالت خراب ہوئی تو دوست احباب اور اپنے پرائے سبھوں نے اُن سے کنارہ کشی اختیار کر لی یہاں تک کہ مرزا صاحب کا سایہ بھی اُن سے دور دور بھاگا بھاگا پھرنے لگا۔ جب آگ جلتی ہے اور اُس میں سے دھواں نکلتا ہے تو دھواں عموماً آگ سے دور فضا میں اُڑ جاتا ہے جب مرزا صاحب کے ساتھ دوست احباب نے یہ سلوک کیا تو مرزا صاحب نے صبر ایوبی اختیار کیا۔ ایک دن جب مرزا صاحب تنہا حقہ پی رہے تھے اور چلم میں سے دھواں اُٹھ کر چلم سے دور جا رہا تھا تو آپ سوچنے کر لاؤ

دوستوں کی بے مروتی اور ان کی آمد و رفت ترک کر دینے کے واقعہ کو کیوں نہ نظم کر لیا جائے تاکہ بروقت ضرورت کام آئے۔ آدمی چونکہ حد درجہ بابرکت واقع ہوئے تھے اس لئے سوچے کہ اس انداز میں اس واقعہ کو بیان کرو کہ لاٹھی بھی نہ ٹوٹے اور سانپ بھی مر جائے۔ چنانچہ فرمانے لگے کہ صاحب یہ جو دوست احباب نے مجھ سے کنارہ کشی اختیار کی ہے اس کا ذمہ دار میں خود ہوں چونکہ میں محبت کی آگ میں جل رہا ہوں اور ایک شعلۂ جوالہ بنا ہوا ہوں اور محبت بھی ایک قسم کی چھوت کی بیماری ہوتی ہے اور دوست احباب میں بیٹھنے اٹھنے سے لگتی ہے اس لئے میرے قریب دوست احباب بھی آتے گھبراتے ہیں کہ کہیں وہ بھی اس مصیبت میں مبتلا ہو جائیں اور شہر بھر میں جگہ جگہ ہولی کے گنڈوں کی طرح ہر چوراہے پر جلتے دکھائی پڑیں۔

غزل نمبر ۲۵

ہوسِ گل کا تصوّر میں بھی کھٹکا نہ رہا عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

ایک صاحب جو نہایت بھینچو واقع ہوئے تھے ان کو ذلیل کرنے کے لئے ایک سوٹڈ بوٹڈ بزرگ نے کہا کہ "کیوں حضرت" آپ بنیٹ نہیں پہنتے۔ فرمانے لگے کہ صاحب میں بنیٹ اس وجہ سے نہیں پہنتا کہ بلاسبب اس کی کریز خراب ہو جائے گی۔ مرزا صاحب نے اس شعر میں بھی کچھ ایسا ہی بہانہ اپنی مفلسی اور بے سروسامانی کے سلسلے میں پیش کیا ہے اور فرماتے ہیں جس طرح بے پر و بال بلبل گل کی ہوس سے آزاد ہے۔ یعنی بنیٹ نہ ہونے کے سبب کریز خراب ہونے کا کوئی تصوّر نہیں۔ اسی طرح مرزا صاحب

اپنی بے سرو سامانی سے مطمئن ہیں کہ اُس حالت میں محبوب اور مرغوب چیزوں کا تصور ہی ان کے قریب نہیں آتا۔ چنانچہ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اگر فراغت کے اسباب مہیا نہیں ہیں تو اُن کا نہ ہونا ہی اچھا ہے کیونکہ اگر وہ موجود ہوتے یا ان کے پاس روپیہ پیسہ ہوتا تو ہر وقت وہ فراغت کے اسباب فراہم کرنے کی مصیبت میں مبتلا رہتے اب جبکہ روپیہ پیسہ یا سامانِ عیش و نشاط میسر نہیں تو مرزا صاحب اپنی مفلسی پر بغلیں بجا رہے ہیں اور خوش ہیں کہ اچھا ہوا دولت پاس نہیں ورنہ ہر وقت ہزار چیزیں خریدنے کی فکر میں مبتلا رہتے۔ اس شعر میں مرزا صاحب نے بلبل کے کندھے پر رکھ کر بندوق چھڑائی ہے۔

غزل نمبر ۲۶

ہم سے رنجِ بے تابی کس طرح اٹھایا جائے   داغِ پشتِ دستِ عجز، شعلہ خس بدنداں ہے

پشتِ دست بصورتِ عجز و انکساری، اور عجز اور خس بدنداں اور کاہ بدنداں گرفتن کے بھی یہی معنی ہیں، پس جس عالم میں داغ نے پشتِ دست زمین پر رکھ دی ہو اور شعلے نے تنکا دانتوں میں لیا ہو، ہم سے رنج و اضطراب کا تحمل کس طرح ہو۔

مرزا صاحب کے اِس شعر کا چھوٹے سائز میں صرف اس قدر مطلب نکلتا ہے کہ شعلہ اور داغ آگ سے متعلق ہیں پھر بھی آتشِ عشق کی تاب نہیں لا سکتے اور اظہارِ عجز کرتے ہیں پھر ہم اس رنج کو کس طرح اٹھا سکتے ہیں۔ مرزا صاحب نے جس آتشِ عشق کا اس شعر میں ذکر کیا ہے اور جس انداز کی گرمی انھوں نے

عشق کی تباہی ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ دوزخ میں جتنے عشاق دنیا میں عشق کرکے مرے ہوں گے اُن سب کو وہاں چیلوں اور کوؤں کی شکل میں استعمال کیا جائے گا کیونکہ صرف دوزخ کی آگ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ ہماری اس دنیوی آگ سے حرارت میں اتنی زیادہ ہوگی کہ ہماری دنیا کی آگ کے شعلے اُس کے سامنے ٹھنڈا معلوم ہوں گے۔

غزل نمبر ۲۷

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

مرزا صاحب عشق میں مبتلا ہو کر گھر بار چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں اور صحراؤں اور بیابانوں میں اپنی محبوبہ کی یاد میں نالے اور آہیں فرما رہے ہیں اُدھر گھر میں جب نوکر نے ستانا پایا تو وہ بھی ان کی پھلواری اور آنگن کا گھر بار چھوڑ کر چلتا ہوا۔ چنانچہ اب جو گھر بھر میں گھاس اگنا شروع ہوئی تو جدھر دیکھئے گھاس ہی گھاس لہلہاتی نظر آرہی ہے۔ مرزا صاحب کو دو تین مہینے بعد جب اطلاع ہوئی کہ گھر بھر میں قد آدم گھاس نکل آئی ہے تو آپ نے صحرا کی گھاس اور اپنے گھر والی گھاس کا ماتم کرنا شروع کیا کہ ہے ہے بیکار اتنی دوڑ دھوپ کی۔ اب ملاحظہ ہو کہ ہم اتنی دور پڑے ہوئے ہیں اور بہار قد آدم گھاس سے کر گھر آئی ہوئی ہے۔ حالانکہ مرزا صاحب صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ اس عشق اور جنون کی بدولت ہم کو جنگلوں میں سر پٹہ گھس گھس" کرنا پڑ رہا ہے۔

غزل نمبر ۲۸

سادگی پر اُس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

سادگی : بھولا پن یا الھڑ پن ۔ بس نہیں چلتا : بن نہیں پڑتا یعنی بے اختیار ہیں ۔ کف : ہتھیلی مراد ہاتھ ۔

مرزا صاحب خودکشی کرنے پر آمادہ ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ نہ اُن کے ہاتھ میں کوئی خنجر ہے اور نہ کوئی بھالا جسے کلیجے میں گھونپ کر اپنا رشتۂ حیات منقطع کر لیں ۔ مصیبت یہ ہے کہ جس وقت یہ اپنی محبوبہ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اتفاق سے اُس وقت اُس کے ہاتھ میں خنجر نہیں ہوتا ۔ ورنہ گھر پر تو ماشاء اللہ خدا کے دیے بہت سے ہتھیار تھے کیونکہ سپہ گری باپ دادا سے پیشہ ہی میں ملی تھی مگر ان کا دل اُس وقت مرنے کو چاہتا تھا جب محبوب کو اُس کے سادہ لباس میں دیکھ پائے ۔

اس شعر میں محبوب کے تیر غمزوں اور اس کی سادگی اور دوسری اداؤں کو مرزا صاحب نے اسلحہ قرار دیا ہے اور اپنے آپ کو اُس کے سامنے بے بس اور مجبور ٹھہرا دیا ہے گویا اُن کی اور محبوب کی حیثیت قصائی اور بکرے کی سی ہے یعنی قصائی کے ہاتھ میں تلوار ہے اور بکرا بالکل بے دست و پا ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کو جو اُس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

مرزا صاحب کو چونکہ اپنے دوست کی ہر احمقانہ سے احمقانہ بات میں لطف آتا تھا اور یہ اُس کی ہر حماقت کو سراہتے تھے لہٰذا آپ سے جب وہ کبھی چھٹے چھ ماہے ملاقات کرتا اور باتیں کرتا تو آپ انتہائی خوشامدانہ انداز

ہیں اُس کی تعریف فرماتے اور ہر بات پر سر ہلا ہلا کر فرماتے واللہ جو باتیں زبان اقدس سے نکل رہی ہیں بس یہ سمجھ لیجئے کہ براہ راست دل میں اتری جا رہی ہیں اور جن جذبات کی ترجمانی حضور فرما رہے ہیں وہ ایسی نہیں کہ اگر آپ نہ کہتے تو میں خود عرض کر دیتا۔ مگر اتنی خوشامد اور اتنی چھیڑ کے باوجود مرزا صاحب خدا جانے کن کن لوگوں کی بد دعائیں لئے ہوئے تھے اور کن کن ترضخواہوں نے انھیں کوسا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں زندگی بھر کامیاب ہوئے اور ساری زندگی محض محبوب کی تقریروں سے مزہ لیتے گذر گئی

رنج وہ کیوں کھینچئے واماندگی کو عشق ہے

اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

واماندگی = تھکاوٹ۔

مرزا صاحب عشق کی ریس میں شریک ہونے کے بعد اس درجہ تھک گئے تھے کہ اب اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ تکان کا بہانہ کر کے آپ اپنے بستر پر لیٹے لیٹے ساری دنیا سے کام لے رہے ہیں اور فرماتے ہیں کہ بھئی اس عشق کے چکر میں آنے کے بعد پاؤں میں اس قدر درد محسوس ہو رہا ہے کہ ہم دنیا کا کام کرنے کے قابل نہیں رہے۔ اس سے مرزا صاحب کو یہ فائدہ ہوا کہ وہ روزمرہ کا سودا سلف جو انھیں گھر کے لئے سویرے سویرے بازار سے لینے جانا پڑتا تھا اُس سے نجات حاصل ہوگئی اور مرزا صاحب سویرے سے شام تک اپنے پلنگ پر اینڈتے رہے اور لوگوں سے کام لیتے رہے۔

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی فتنۂ شورِ قیامت کس کے آب و گِل میں ہے

جلوہ زار ۔ جلوہ گاہ ۔ آب و گِل ۔ خمیر یہاں مراد معشوق کا وجود ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کا محبوب انھیں دوزخی دوزخی کہہ کر مخاطب کرتا تھا ۔ اس وجہ سے کہ مرزا صاحب ہر وقت اپنے دل کی آگ کا دکھڑا اس سے بیان کرتے تھے اور فرماتے رہتے تھے کہ صاحب ! ہمارے دل میں جو آگ جل رہی ہے وہ دوزخ کی آگ کے مانند ہے چنانچہ مرزا صاحب جب یہ خطاب سنتے سنتے جھک ہو گئے تو محبوب سے فرمانے لگے کہ اچھا صاحب ہمارا دل جلوہ زارِ آتشِ دوزخ سہی مگر آپ بھی تو تتیا مرچ ہیں اگر ہم آپ کو فتنۂ شورِ قیامت کہیں تو بگڑیئے گا تو نہیں مرزا صاحب کا مطلب یہ ہے کہ حضورِ والا ہم دوزخی تو بعد میں ہوں گے پہلے تو آپ اپنے فتنوں کو دیکھئے جو فتنۂ قیامت بنے ہوئے ہیں اور آپ ہی کی خاطر ہم کو اپنے دل کو آتشِ دوزخ بنانا پڑا ۔

غزل نمبر ۲۹

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

آپ نے اگر کسی صاحب کو کسی کچالو والے کی دوکان پر تنکے سے کچالو کھاتے دیکھا ہوگا تو اس شعر سے بہتر طریقے پر لطف لے سکیں گے اور اس کا مفہوم بھی آپ بخوبی سمجھ لیں گے ۔ مطلب یہ ہے کہ مرزا صاحب کا دل اور جگر کچالو کے قتلوں کی طرح تلے اوپر رکھے ہوئے تھے کہ محبوب نے اپنی نگاہ ناز کی کمان اٹھا کر جو تیر مارا تو دونوں قتلے چھد گئے اور اس نے دونوں قتلوں کو منہ میں رکھ لیا ۔ اسی واقعہ کو مرزا صاحب شعر کی شکل میں پیش کرتے ہیں ۔

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں　　اُٹھئے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

بادۂ شبانہ = رات کی شراب مراد عالم جوانی کا لطف + سرمستیاں = بدمستیاں + خواب سحر صبح کی میٹھی نیند - یہاں مراد پیری سے ہے۔

رات میں مرزا صاحب نے خواب میں دیکھا کہ جیسے کسی دستر خوان پر بیٹھے پلاؤ زردہ کھا رہے ہیں - چنانچہ خواب کے عالم میں یہ اس کے مزے لے رہے تھے کہ اچانک سویرا ہوگیا اور ان کی گھر والی نے ان کا شانہ ہلا کر کہا کہ اے مرزا آخر آج کب تک سوتے رہو گے؟ اس پر مرزا صاحب کی آنکھ کھل گئی - اس خیال کو جوانی کی بے ثباتی کے رنگ میں مرزا صاحب نے اس طرح پیش کیا ہے - گویا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جوانی کا لطف پیری میں کہاں - جوانی کے مزے اور بدمستیاں جاتی رہیں رات تمام بدمستی عیش میں گذر گئی سویرے آرام کی نیند آگئی اب پیری میں نہ رات کا عیش ہے اور نہ صبح کی نیند کی لذت -

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں　　بارے اب اے ہوا ہوس بال و پر گئی

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ جب تک وہ زندہ رہے کوئے یار میں پہنچنے کے لئے بال و پر کی خواہش رہی - یعنی اس بات کی فکر رہی کہ ذرا پیسہ ہو تو بہتر کیلئے قسم کے کپڑے بنوائیں اور بن ٹھن کر کوئے محبوب میں جائیں مگر ساری عمر گذر گئی کبھی اتنا پیسہ ہی نہیں ہوا کہ اس آرزو کو پورا کرتے۔ زندگی میں جب یہ آرزو پوری نہ ہوئی تو اب مرزا صاحب مرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ خیر کوئی بات نہیں اب جب ہم خاک میں مل کر خاک ہوگئے ہیں تو اب

ہم بھی محبوب کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور اب ہم دن بھر خاک بنکر ان کے کوچے میں گرد و غبار اڑاتے رہتے ہیں۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی   اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

بوالہوس = لالچی۔ یعنی نفسانی خواہشوں کا بندہ۔ حسن پرستی عشق شعار کی = اختیار کی۔ شیوہ = طرز۔ روش ۔ اہل نظر = صاحب نظر سچے عاشق یا حقیقت بین یا نقاد۔

مرزا صاحب کا یہ شعر پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کہ وہ انگریزوں کے زمانے کی وزارت کا مقابلہ موجودہ وزارت سے کر رہے ہیں۔ اور اُس زمانے میں وزرا کا جو رعب و داب اور مرتبہ لوگوں کی نظروں میں تھا وہ اس زمانے میں باقی نہیں ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ اب تو جس کو دیکھئے وزیر بنا نظر آ رہا ہے اور ہر وہ شخص جس کو کاٹ پیچ کی باتیں آتی ہیں اور دولت اور عہدہ کا لالچی ہے کرسیٔ وزارت پر نظر آ رہا ہے اور جو لوگ حقیقتاً وزیر ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں وہ بے وقعت اور مارے مارے پھر رہے ہیں۔ لہذا جس طرح بوالہوسوں کی حرکات سے سچے عاشقوں کی لوگوں کی نظروں میں کوئی وقعت اور عزت باقی نہیں رہی اُسی طرح اس دور کے وزیروں کی حرکات سے وزارت کی عزت خاک میں مل گئی ہے۔

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا   مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

مرزا صاحب کا محبوب کچھ اتنا زیادہ میک اپ کرتا تھا اور اپنے منھ پر غازہ پوڈر اور لپ اسٹک کا استعمال کرتا تھا کہ کوئی نظر اس پر ٹھہر

نہیں پاتی تھی اور پھسل جاتی تھی ۔ اس واقعہ کو مرزا صاحب نہایت عاشقانہ انداز میں بیان کر رہے ہیں اور فرماتے ہیں کہ صاحب محبوب جدھر سے نکل جاتا ہے اس کی دید کے لئے اس طرح لوگ اس کے گرد جمع ہو کر مستانہ وار ناچنا شروع کر دیتے ہیں کہ انھیں اس کے چہرے کے خد و خال نظر نہیں آتے اور وہ اس کے حسن سے پورے طور پر لطف اندوز نہیں ہو پاتے ۔ کیونکہ عاشقوں کی مست نگاہ اس کے چہرہ سے پھسل کر اور منتشر ہو کر نقاب کا کام کرنے لگتی ہے ۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ تماشا ئیوں کی بے شمار نظریں جب تہ بہ تہ محبوب پر پڑنا شروع ہوئیں تو ان کے تانے بانے سے محبوب کے چہرہ پر ایک نقاب سا پڑ گیا جس کی وجہ سے کوئی شخص اُن کے محبوب کے حسن کا نظارہ نہیں کر سکتا ۔ اس لئے جن لوگوں نے ان کے حسن کا فلم دیکھنے کے لئے ٹکٹ لیا تھا اُن سب کے دام ضائع ہو گئے ۔

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمھیں   وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

ایک صاحب کا نوکر جوانی میں اس درجہ آپے سے باہر تھا کہ اس نے محلے بھر کی جوان عورتوں کا گھر سے نکلنا دوبھر کر رکھا تھا نواب صاحب نے جن کے یہاں یہ ملازم تھا جب اس کی یہ حالت دیکھی تو چھ ماہ کی پیشگی تنخواہ دے کر کہا کہ "جا مردود شادی کر کے آ" چنانچہ یہ حضرت گھر تشریف لے گئے اور چھ ماہ بعد جب تشریف لائے تو چہرے پر خون کی ایک چھینٹ باقی نہ رہی تھی اور یہ ڈیوڑھی پر بیٹھے اونگھ کر مکھیاں پکڑتے رہتے تھے ایک دن انھوں نے ایک مکھی پکڑ کر اس سے کہنا شروع کیا ارے حرام خور تو بہت اُچک پھاند مچائے ہے دیکھ

نواب صاحب سے کہہ کر میں تیری بھی شادی کرا دوں گا۔ اس شعر میں مرزا صاحب نوجوانوں کی اچھک بھانڈ کا ذکر کر رہے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آدمی کا بوڑھا ہونا اور مرنا دونوں کی مساوی حیثیت ہے جوانی گئی تو اپنے ہمراہ سارے حوصلے اور ولولے لے گئی اور پیری آئی تو اس نے الگنی پر ٹانگنے کے قابل بھی نہ رکھا۔

غزل نمبر ۳۳

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

نہ روئیں = شکوہ شکایت نہ کریں + ذوقِ نظر = لطف دید۔

اِس شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کو یقین کامل تھا کہ وہ مرنے کے بعد جنت میں بھیجے جائیں گے جہاں وہ حورانِ بہشتی سے حقہ تازہ کرائیں گے اور چلمیں بھروائیں گے۔ اس شعر میں مرزا صاحب محبوب سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ صاحب اگرچہ مرنے کے بعد جنت میں ہم کو دنیا کے جھالروفانوس اور حور و غلماں اور عیش و نشاط کی ساری چیزیں میسر ہوں گی۔ مگر واللہ جو ہم اُن کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھیں ہم کو تو وہاں آپ کی تلاش ہو گی اور ہم حورانِ بہشتی میں یہ دیکھیں گے کہ کوئی آپ جیسی صورت کی حور بھی ہے قسم آپ کے سر عزیز کی جو اس خاکسار کو جیسا آپ کے وہاں ذرا بھی تسکین ہو اب ہماری یہ دعا ہے کہ اللہ ہم کو اور آپ کو ایک ساتھ دنیا سے اٹھائے لیکن ہم آپ کو یہ بتائے دیتے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی ہم نالہ و فریاد سے جنت کے رہنے والوں کی راتوں کی نیند حرام کرتے رہیں گے۔

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

وہ جو ایک روایت مشہور ہے کہ ایک بڑھیا مرگئی تو لوگ اُن کے صاحبزادے کے پاس تعزیت کے سلسلے میں تشریف لے گئے اور بولے کہ صاحب آپ کی والدۂ محترمہ کے مرنے کا بڑا افسوس ہوا اس پر صاحبزادے نے کہا کہ مجھے والدہ کے مرنے کا تو چنداں غم نہیں البتہ غم اس کا ہے کہ موت نے گھر دیکھ لیا۔
چنانچہ مرزا صاحب بھی اسی خیال کے پیش نظر وصیت فرما رہے ہیں کہ مرنے کے بعد مجھے بہت دور شہر سے باہر کسی جگہ دفن کروائیے گا ورنہ اگر مجھے محبوب کے کوچے میں دفن کیا گیا تو مجھے بیحد تکلیف ہوگی اس وجہ سے کہ میرے مزار پر لڈو اور ریوڑیاں چڑھنا شروع ہو جائیں گی اور میرے عقیدتمندوں کی تعداد چونکہ بہت زیادہ ہے اس لئے وہ مزار کا پتہ پوچھ پوچھ کر مزار پر پہنچنا شروع ہو جائیں گے اور اس صورت سے لوگ قاتل کا سراغ لگا کر اُسے پولیس میں دھروا دیں گے یا مزار پر دن رات بیٹھے آپ سے اشارے بازیاں کیا کریں گے۔ لہذا انھیں اپنے مرنے کا غم نہیں غم اس کا ہے کہ میرے تمام عقیدتمند آپ پر مرنا شروع کر دیں گے۔

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

مرزا صاحب آدمی اس قدر چالاک تھے کہ جب اپنی جیب سے شراب خرید کر پیتے تو زیادہ سے زیادہ دو چار آنے کی مگر جب مفت کی مل جاتی تو پورے پورے مٹکے چڑھا جاتے اور مختلف بہانوں سے پلانے والوں سے زیادہ سے زیادہ مقدار میں طلب کرتے۔ چنانچہ ایک دن مرزا صاحب کو کسی ذریعہ سے معلوم ہو گیا کہ اُن کے محبوب کے یہاں شرابی مدعو ہیں اور بے پناہ شراب

خرید کر آئی ہے چنانچہ آپ بھی پتہ لگاتے لگاتے وہاں پہنچ گئے اور جب آپ کا نمبر آیا تو آپ نے (ساقی) محبوبہ سے فرمایا کہ ارے صاحب آپ کی ساقی گری کے تو وہ شہرے ہیں کہ ابھی اجمیری گیٹ پر ایک قدآدم پوسٹر دیکھے چلا آرہا ہوں جسمیں آپ کو حاتم دوراں ساقیٔ وقت کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ لہٰذا آج آپ اتنی پلا دیجئے کہ میں جھک جاؤں۔ اس سے آپ کو یہ فائدہ ہوگا کہ آپ کی ساقی گری کی لاج رہ جائے گی اور بندہ کا کام بن جائے گا۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

ندیم:

مرزا صاحب کو ہر شخص چوٹ دے جاتا تھا چنانچہ ان کا نامہ بر بھی چلتے چلاتے ان کو چوٹ دے گیا۔ اور واقعہ یہ ہوا کہ مرزا صاحب نے اُس کے ذریعے اپنے محبوب کی خدمت میں ایک رقعہ بھیجا کہ اگر زحمت نہ ہو تو تھوڑی دیر کے لئے غریب خانے پر تشریف لے آیئے اور چلتے چلتے قاصد سے کہہ دیا کہ حضرت آپ کو اپنی جوانی کا واسطہ ایسا نہ کیجئے گا کہ خط دینے کے بعد آپ اُس پر عشق کا وار کر بیٹھیں ورنہ ہم کہیں کے نہ رہیں گے مگر مرزا صاحب کی بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ جب قاصد اُن کو یہ خط دینے لگا تو ان کے حسن و جمال سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اس نے ایک نعرۂ حیدری بلند کیا اور کپڑے پھاڑ کر جنگل چل دیا مرزا صاحب اُس کے انتظار میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے اطلاع دی کہ وہ آپ کا ندیم تو پاگل ہو کر جنگلوں میں مارا مارا پھر رہا ہے اس پر مرزا صاحب اپنا سر پکڑ کر رہ گئے اور اُن صاحب سے جنھوں نے یہ خبر دی تھی کہا کہ حضرت

اب کیا عرض کریں اب اس عشق بازی سے تو ہمارے جسم کا رونگٹا رونگٹا دشمن بن گیا ہے دیکھئے ناتا صد صاحب کو بھیجا تھا کہ وہ ہمارا خط پہنچا آویں تو وہ بجائے نامہ بری کے فرائض انجام دینے کے اُلٹے اُن پر عاشق ہو لیے اور اب سُنا ہے کہ ان کو اغوا کرنے کے چکر میں ہیں لہٰذا اگر ہمارے نامہ بر آپ کو کہیں مل جائیں تو اُن سے میرا سلام عرض کیجئے گا اور کہئے گا کہ کیوں صاحب اس طرح کوئی کسی بوڑھے عاشق کو چوٹ دیتا ہے جیسی آپ نے دی۔

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا ۔۔۔ فرصت کشاکش غم پنہاں سے گر ملے

مجنوں نے کیا کیا = مجنوں نے کچھ نہیں کیا۔

مرزا صاحب فرہاد اور مجنوں جیسے مستند اور مسلم الثبوت عشاق کو بھی اپنے عشق کے مقابلے میں لونڈا سمجھتے رہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ واللہ اگر بیوی بچوں والا نہ ہوتا اور قرض کا بار اتنا نہ ہوتا اور تھوڑی سی بہت فراغت نصیب ہوتی تو میں یہ ثابت کرکے دکھا دیتا کہ مجنوں علیہ رحمہ کے کارنامے میرے کارناموں کے آگے کوئی حقیقت نہیں رکھتے مقصد یہ کہ اگر مجنوں لنگوٹی باندھ کر جنگلوں اور صحراؤں میں انا لیلیٰ کے نعرے لگاتے تھے تو بندہ بغیر لنگوٹی کے بھی یہ کام کرکے دکھا سکتا ہے اور مجنوں کی دم پر پیر رکھ کر ثابت کر سکتا ہے کہ وہ بہر حال میرے عشق کے مقابلے میں لونڈے تھے اور لونڈے رہیں گے۔

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا ۔۔۔ تم کو کہیں جو غالب آشفتہ سر ملے

مرزا صاحب نے مجنوں کے بارے میں کہیں ایک کہانی پڑھ رکھی تھی کہ ایک دن جو وہ گھر سے بھاگا تو سویرے سے شام تک لاپتہ رہا چنانچہ شام کو اس کی بوڑھی ماں روتی پیٹتی ایک ایک سے دریافت کرتی پھرتی تھی کہ بیٹا ہمارے مجنوں کو تو کہیں نہیں دیکھا ہے ؟ اس سلسلہ میں اُس نے لیلےٰ کے کوچہ میں بھی محلے کے دو ایک لڑکوں کو بھیجا کہ ذرا جا کر وہاں کے رہنے والوں سے دریافت کر آؤ کہ انھوں نے ہمارے صاحبزادہ کو تو نہیں دیکھا ہے کیونکہ مجنوں کی والدہ کو معلوم تھا کہ یہ گھر سے چھٹتے ہی ناک کی سیدھ پر کوچہ محبوب یعنی لیلےٰ کے دروازہ پہنچ جاتا ہے اور دن بھر وہیں ڈنڈ تریں اور بیٹھکیں مارا کرتا ہے۔ ماں کی مامتا آپ جانتے ہیں جیسی کچھ ہوتی ہے ماں کو صاحبزادہ کی آوارہ گردی اور عشق و عاشقی سے کوئی مطلب نہ تھا البتہ وہ پریشان اس وجہ سے تھی کہ اگر وہ رات گئے واپس آیا تو دو پہر کا کھانا رکھے رکھے سڑ جائے گا اس شعر میں لفظ "دیکھنا" سے ماں کی مامتا کا اظہار ہوتا ہے۔ اس شعر میں مرزا صاحب نے مجنوں کی جگہ اپنا تخلص لکھ کر ساری بلا اپنے سر لے لی ہے۔

غزل نمبر ۱۳

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں   سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

اور ہے = زیادہ ہے :۔ غم ہائے نہانی = چھپا ہوا غم ہائے عشق و محبت۔

مرزا صاحب نے جب عشق فرمایا تھا تو یہ سوچ کر فرمایا تھا کہ عشق کیا کر رہے ہیں براہ راست دوزخ کی آگ میں اپنے آپ کو جھونک رہے ہیں کیونکہ

غمِ عشق سے جو شعلے بلند ہوتے ہیں وہ پتھر کے کوئیلوں سے نکلے ہوئے
شعلوں سے کہیں زیادہ تیز ہوتے ہیں اور دوزخ کی آگ کی اِن شعلوں
کی تپش کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں لیکن خدا جانے مرزا صاحب
آگ کا کیڑا تھے یا کیا تھے جو اُن کو نہ تپش کی پروا تھی اور نہ جہنم کے شعلوں کا
ڈر تھا اسی لئے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ مرزا صاحب ہمیشہ زندگی میں ایسے
ایسے افعال کے مرتکب ہوئے جس کے سبب دوزخ کی آگ اُن پر حلال ہوگئی

بارہا دیکھیں ہیں اُن کی رنجشیں پر کچھ اب کی سرگرانی اور ہے

سرگراں : خفگی : اور ہے : یعنی پہلی تمام رنجشوں سے سوا ہے

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ صاحب اب کی مرتبہ تو ہمارے محبوب صاحب
اس بری طرح ہم سے نالاں ہیں کہ اب پٹھے پر ہاتھ ہی نہیں دھرنے دیتے
ورنہ اس سے پہلے بارہا ہم نے اُن کو شکایت کا موقع دیا اور ہاتھ پاؤں جوڑ
کر اور خوشامد در آمد کرکے انھیں راضی کر لیا۔ اور وہ بھی شرافت سے پیش
آتے رہے۔ مگر اب کے خدا جانے ہماری سسرال والوں نے جا کر ان کے
کیسے کان بھر دیئے ہیں کہ انھیں ہماری صورت سے نفرت ہوگئی۔ نتیجہ یہ
ہے کہ اب ہم کو اُن کی پچھلی مہربانیوں کا تصور کرکے رونا آتا ہے۔

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

مرزا صاحب نے ایک صاحب کے ذریعے محبوب کے پاس ایک خط بھیجا
جب ان صاحب نے مرزا صاحب کا خط اُن کو دیا تو اُس کو پڑھ کر اُنھوں نے
گالی گفتہ شروع کردی۔ چنانچہ قاصد نے اُن سے کہا کہ سرکار جو کچھ آپ کو کہنا ہے

وہ مرزا صاحب سے کہئے ہیں تو نہ خان میں ہوں اور نہ خان کے اونٹوں میں
میں بازار سودا لینے نکلا تھا کہ راستہ میں مرزا صاحب آپ کی محبت کا وظیفہ
پڑھتے مل گئے مجھ کو بلا کر کہا کہ بھیا اپنی جوانی کی بہاریں دیکھو ذرا ہمارا خط اُولیں
ہی سے دیتے ہوئے اگلی دوکان سے سودا خرید لینا بس حضور ہماری اتنی
خطا تھی ۔ قاصد جب پلٹ کر مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو مرزا صاحب
نے اس کے چہرہ سے اندازہ کر لیا کہ شاید کچھ زبانی بھی کہلوایا ہے چنانچہ
مرزا صاحب نے پوچھا کہ کہئے انھوں نے کوئی زبانی پیغام بھی دیا ہے ؟ اس پر
اس نے کہا کہ حضور کہا تو زبانی بہت کچھ ہے لیکن ادب اس کی اجازت نہیں
دیتا کہ میں اُن کلمات کو آپ کے سامنے دہراؤں ۔

غزل نمبر ۳۲

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی　　اب کسی بات پر نہیں آتی

مرزا صاحب کی جوانی بڑی رنگ رلیوں میں گذری تھی اور مرنے جانے والی پردہ
پوش یا بے پردہ عورت پر وہ پھبتیاں کستے تھے اور دوستوں میں آ کر اور قہقہے لگا
لگا کر اس کا ذکر کرتے تھے غرض عجیب زندہ دلی کی زندگی تھی بعض اوقات تو ایسا بھی
ہوا کہ اُن کے ترسیب ترین اعزہ میں سانحہ ہو گیا اور تجہیز و تکفین کے وقت بھی
انھوں نے مرنے والے یا مرنے والی پر دو ایک پھبتیاں کس دیں مثلاً اگر کوئی مسماۃ
مریں تو فرما دیا کہ یہ جانور ہی ہیں مگر پہلا سوال منکر نکیر آپ سے یہی کریں گے
کہ کہئے جوانی میں آپ نے کسی سے بھی محبت کی یا جوانی بے داغ گذار دی
مگر یہ ساری باتیں اُس وقت کی ہیں جب تک مرزا صاحب نے کسی سے

باقاعدگی کے ساتھ عشق نہیں فرمایا تھا اور عشق کی عارضی اسامیاں پڑ کرتے رہے تھے۔ آج اس پر عاشق ہیں تو کل اُس پر اور اپنے دل کی اس، اچک پھاند پر انھیں ہنسی آتی تھی مقصد یہ کہ اُنھیں عشق کا احساس تو تھا اور اُسے محض ایک معمولی چیز سمجھے ہوئے تھے مگر جب رفتہ رفتہ عشق اُن پر پورے طور پر مسلط ہو گیا تو سارے احساسات ختم ہونے کے بعد اُس منزل میں آگئے جہاں انسان ششدر ہو کر رہ جاتا ہے اور اُسے ایسی چپ لگ جاتی ہے کہ نہ ہنستا ہے نہ بولتا۔ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں چنانچہ اس منزل میں آنے کے بعد مرزا صاحب فرمار ہے ہیں کہ پہلے کم از کم کچھ نہیں تو اپنے ہی حال دل پر ہنسی آجاتی تھی مگر اب کسی بات پر نہیں آتی حتیٰ کہ اپنے حال دل پر بھی ہنسی آنا بند ہو گئی ہے۔ قدر نڈھال اور افسردہ کیوں ہو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تمھیں بات ہی کرنا نہیں آتی اس پر جھلا کر فرماتے ہیں کہ ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے جو تم سے کہنے والی نہیں ہے گو یا جو ملواتیں اس نے سنائی ہیں اور جو گھناؤنی گالیاں اس نے دی ہیں وہ اس قابل نہیں ہیں کہ تم سے بیان کی جائیں۔

موت کا ایک دن معین ہے ۔۔۔ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

صاحب! معاف کیجیے گا یہ شعر جو وقت کہا گیا تھا اُس وقت سے اِس وقت تک غلط پڑھا جاتا رہا ہے۔ اسی لیے کوئی صاحب اس کا مفہوم نہ سمجھ سکے۔ اصل شعر یوں ہے۔

نیند کا ایک دن معین ہے ۔۔۔ موت کیوں رات بھر نہیں آتی

اب اس کے بعد شعر کا مطلب بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ مرزا صاحب کو جو رات رات بھر نیند نہیں آتی اس کی وجہ یہی ہے کہ روز ازل ان کے مقدر میں لکھ دیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ زیادہ سے زیادہ ایک دن سو پائیں گے چنانچہ زندگی میں ایک دن جو معین کر دیا گیا تھا اس روز مرزا صاحب

سے لیے اب بار ہا رات میں سونے کا سوال تو وہ دنیا میں آنے اور تقدیر میں لکھ جانے کے بعد پیدا ہی نہ ہوتا تھا لہٰذا دوسرے مصرعے میں مرزا صاحب کا یہ شکوہ ہی بیکار ہے کہ رات بھر نیند کیوں نہیں آتی دوسرے میں "موت" سے مراد آرام اور چین ہے اور یہ چین انھیں زندگی میں اس وجہ سے حاصل نہیں ہوا کہ انھوں نے آپ اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رکھی تھی اور دنیا لُٹنے کے بعد رقم رقم کے عشق کر رکھے تھے جس کی وجہ سے رات بھر ان کو ہائے ہائے کرتے گذرتی تھی۔ لہٰذا۔

خود کردہ را علاجے نیست

کہ کہ موت دن میں آئے گی رات بھر نیند نہیں آتی۔

داغِ دل گر نظر نہیں آتا   بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

مرزا صاحب جب عشق کے مرض میں مبتلا ہوئے اور ان کی حالت بالکل غیر ہونے لگی تو دوست احباب ایک حکیم صاحب کو پکڑ لائے۔ اور اُن سے مطالبہ کیا کہ صاحب! کہ ان کے مرض کی تشخیص فرما دیجئے! حال پوچھنے پر حکیم صاحب سے بتایا گیا کہ حضور! چلاتے بہت ہیں۔ اور رات رات بھر سارا محلہ سر پر اٹھائے رہتے ہیں۔ مرزا صاحب کے جسم پر جگہ جگہ سُرخ سُرخ چھپتے بھی پڑ گئے تھے اور داغوں کا سلسلہ دل تک گیا ہوا تھا چنانچہ حکیم صاحب نے ان کو بہت غور سے دیکھا اور بولے کہ جسم پر تو داغ ہیں مگر دل پر کوئی داغ نظر نہیں آتا اور یہ کہہ کر حکیم صاحب خاموش ہو گئے۔ مرزا صاحب چونکہ دل پر چوٹ کھائے ہوئے تھے اس لئے انھوں نے فرمایا کہ حکیم صاحب آپ ذرا غور سے ملاحظہ تو فرمائیں۔ مگر حکیم صاحب نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ ان کو اور دوسرے امراض بھی ہیں جن کو بتانا میں مناسب نہیں سمجھتا۔ مرزا صاحب جن کے دل میں تیر نظر کی سیخوں پر دل کے کباب بھونے جا رہے تھے اور جس کی بُو برابر اُن کی

ناک تک پہنچ رہی تھی بولے کہ ارے صاحب یہ آپ کیا باتیں کر رہے ہیں کیا دل کے کباب ہونے کی بو بھی آپ کو نہیں محسوس ہو رہی ہے۔ حکیم صاحب نے جب اُس سے بھی انکار کیا تو یارانِ طریقت نے فرمایا کہ خیر حکیم صاحب جائیے کسی دوسرے معالج کو دکھائیں گے۔ اس پر مرزا صاحب بولے کہ اماں میاں مہدی مجروح کس اناڑی حکیم کو پکڑ کر لائے تھے جس کی قوت شامہ تک درست نہ تھی اور اُن کے چہرے مہرے سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اُن کی سات پشتوں کو بھی عشق کی ہوا تک نہیں لگی تھی۔ ورنہ غضب خدا کا دل کے کباب بھن رہے ہیں اور جناب ہیں کہ فرماتے ہیں کہ کوئی بو نہیں آرہی ہے۔

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں ۔ میری آواز گر نہیں آتی

مرزا صاحب کا محبوب ایسا ظالم اور جابر تھا کہ ان سے لگاتار نالے بلند کرواتا رہتا تھا اور جب یہ ذرا دم لینے کے لئے رُک جاتے تو اُدھر سے آواز آتی کہ پھر چپ ہو گئے چنانچہ یہ پھر نالے بلند کرنا شروع کر دیتے لہذا مرزا صاحب اپنے مسلسل نالوں کے بلند کرنے کے جواز میں فرماتے ہیں ارے بھائی اگر چیخنے میں ذرا سے کمی رہ جاتی ہے یا میں چیخنا بند کر دیتا ہوں تو اُن کو شکایت ہوتی ہے کہ دیکھئے پھر آپ نے چیخنا بند کر دیا ہم کو صرف آپ کے چیخنے ہی میں تو مزہ آتا ہے ورنہ آپ میں اور رکھا کیا ہے

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب ۔ شرم تم کو مگر نہیں آتی

مرزا صاحب کی ساری زندگی شراب نوشی میں گذری مگر مصیبت یہ تھی کہ مرزا صاحب شراب بھی پیتے تھے تو ہم بانگ دُہل اور ہر شخص سے

اپنی بخی سے بخی گمزدہ، یاں بھی بیان کردیا کرتے تھے آخر انھوں نے جب خانہ کعبہ جانے کا فیصلہ کیا اور سوچ کر بیکار بیٹھنے سے کیا فائدہ چلو چل کر گناہوں کی معافی ہی مانگ لی جائے تو خود اُن کی گھر والی نے اُن سے کہا کہ اے مرزا صاحب سوچتے ہو کہاں کے تلی حج کو چلی" اسے اب جو تم کعبہ، حج کرنے کو جارہے ہو تو ذرا اپنی شکل تو دیکھو بھلا تمھاری شکل اس قابل بھی ہے جو تم وہاں جاؤ۔

غزل نمبر ۳۱

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے

مرزا صاحب کا خیال ہے کہ دردِ عشق کی دنیا میں کوئی دوا نہیں اور مرزا صاحب چونکہ عشق میں مبتلا ہیں اس لئے جب اُن کو اختلاج ہوتا ہے تو دل کی طرف سے مطالبہ ہوتا ہے کہ" مرزا صاحب! ہم کو حکم خسرو دواخانے سے خمیرہ دل افزا جواہر والا" لادیجئے ورنہ ہم آپ سے کہے دیتے ہیں کہ ہمارا انتقال کر جانا برحق ہے۔ اس پر مرزا صاحب اُسے ڈانٹنا شروع کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ" ابے کیا لونڈے پنے کی باتیں کر رہا ہے۔ تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ تو جس مرض میں مبتلا ہے اُس کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں ہے۔

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

مرزا صاحب اِس شعر میں اپنے عشق کے ابتدائی منازل کا ذکر کرتے ہوئے اپنے آغازِ عشق پر روشنی ڈالتے ہیں۔ چونکہ مرزا صاحب تپنگ کے

بیحد شوقین تھے اس لئے عنفوانِ شباب تک پتنگ اڑاتے رہے اسی لئے
پتنگ بازی پر اُن کی ایک نظم بھی دیوان میں موجود ہے۔ ایک دن یہ پتنگ
بازی کرنے کی غرض سے اپنے کوٹھے پر کھڑے ہوئے تھے کہ دور ایک لڑکی
کو کوٹھے پر کھڑا دیکھ کر اُس پر عاشق ہو گئے اور دوسرے روز سے پابندی
سے کوٹھے پر چڑھکر اُس کی طرف دیکھنے کے کام میں لگ گئے۔ اُس بدنصیب
کو اس کی اطلاع تک نہ تھی کہ کوئی صاحب دور کھڑے اُس پر جان دینے
پر آمادہ ہیں لہذا وہ اُن کی طرف سے پیٹھ موڑ کر ادھر اُدھر دیکھا کرتی
تھی۔ مرزا صاحب کے یہ چیز سمجھ میں نہ آئی کہ وہ مرزا صاحب کے عشق سے
ناواقف ہے لہٰذا آپ نے اُس کے اس رویے سے تنگ آکر اپنے دوستوں
سے کہنا شروع کیا کہ "یار کیا بتاؤں آج چار پانچ روز ہوئے جب سے ہم نہایت
پابندی سے دو گھنٹے عشق بازی کے سلسلے میں ضائع کر رہے ہیں مگر جن محترمہ
پر عاشق ہیں وہ ہماری طرف پیٹھ موڑ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور ہم کو کوئی لفٹ
نہیں دیتیں۔ آخر معاملہ کیا ہے" اس پر دوستوں نے کہا قبلہ آپ ابھی عشق
کے کوچے میں اناڑی مجسٹریٹ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے اس کے آداب
سے واقف نہیں ہیں معشوق آپ پر ظلم نہیں کرے گا تو کیا لڈو کے دونے بھیجے گا

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں   کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے؟

بزمِ محبوب میں دنیا بھر کے ڈھیٹ مختلف قسم کے عشاق ڈٹے ہوئے ہیں
جن میں ایک مرزا صاحب بھی ہیں۔ مرزا صاحب کا محبوب ہر بدھو نتھو سے
اُس کے بال بچوں کی خیریت پوچھ رہا ہے اور ان سب کی طرف حد درجہ ملتفت

ہے۔ مرزا صاحب اس انتظار میں نہیں کہ وہ اُن کے پاس آکر ان کی خیر و عافیت دریافت کرے اور اُن کے بیوی بچوں کا حال پوچھے مگر وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ چنانچہ جب مرزا صاحب اُس کے اس رویے سے حد درجہ متنفر ہو گئے تو ان سے نہ رہا گیا اور بولے" کہ حضور والا کیا ہم کو آپ نے حیوانوں اور جانوروں کے زمرے میں شامل کر رکھا ہے جو ہم سے مخاطب نہیں ہوتے آخر ہم سے بھی پوچھئے اور ہم کو بھی اپنا دلی مدعا بیان کرنے کا موقع دیجئے مگر محبوب نے ان کو شاید اس وجہ سے موقع نہیں دیا کہ یہ ہمیشہ اُس کی بزم میں اپنی شکایات کا چوغزلہ اور پنج غزلہ بحر طویل میں لے کر پہنچ جاتے تھے جس کے سنتے ہی تمام سامعین محفل چھوڑ چھوڑ کر بھاگنا شروع ہو جاتے تھے۔

جان تم پر نثار کرتا ہوں   میں نہیں جانتا دعا کیا ہے؟

مرزا صاحب ہر وقت اپنی جان ہتھیلی پر لئے بیٹھے رہتے تھے مگر عام عشاق مرزا صاحب سے زیادہ سیانے تھے وہ بازار سے کوے اور بھینگے خرید لاتے تھے اور محبوب پر اپنا رعب قائم کرنے اور اپنی جان نثاری اور محبت کا سکہ جمانے کے لئے سات سات بار صدقہ کر کے وقفے سے بھینگے چھوڑ دیا کرتے تھے پھر تنا تنا انھیں دعائیں دینا شروع کر دیتے۔ اور قریب پہنچ کر کہنا شروع کرتے: "آپ جوانی کی بہاریں دیکھیں اللہ پہلی ہی کھیپ میں اولاد نرینہ عطا کرے" وغیرہ وغیرہ مرزا صاحب ہمیشہ دوسرے عشاق پر اپنی افضلیت جتانے کی غرض سے محبوب کی خدمت میں پہنچ کر فرماتے کہ میں کوئی گھٹیا چیز آپ پر قربان کرنے نہیں آیا ہوں اور نہ جھوٹی محبت ظاہر کرنے کے لئے آپ کو دعائیں دینے کا قائل ہوں بلکہ میں اپنی مسلّم جان"

آپ پر نثار کرتا ہوں ۔ "گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف"

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ ۔۔۔ مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے؟

یہ شعر شاید مرزا صاحب نے اپنی منگنی کی یاد میں کہا ہے لکھتے ہیں کہ مرزا صاحب جوانی میں چونکہ نہایت دل پھینک انسان تھے لہذا شادی کے قبل اُنھوں نے اعلان کر رکھا تھا کہ ہم کو شادی کے لئے صرف لڑکی چاہیئے نہ جہیز کے قائل ہیں اور نہ لین دین کے ، مرزا صاحب کے اس اعلان پر ایک بزرگ محترم جو اپنے گھر میں درجنوں بچیاں پیدا کرائے بیٹھے تھے اُن کے کان کھڑے ہوئے اور انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی مرزا صاحب ہی سے کریں گے ۔ چنانچہ دونوں میاں بیوی میں اس سلسلے میں باتیں ہونے لگیں ۔ بیوی نے کہا کہ "مرزا صاحب کے پاس دھیلا تو ہے نہیں اور نہ کوئی کام کاج ہی کرتے ہیں پھر کوئی اپنی لڑکی کی قسمت اُن کے ساتھ کیسے پھوڑ دے" اس پر شوہر نے کہا کہ ارے بھئی یہ تو میں مانتا ہوں کہ "غالب میاں کچھ بھی نہیں ہیں" یعنی ان کے پاس ایک ٹکا نہیں ہے مگر یہ بھی تو دیکھو کہ لڑکا مفت ہاتھ آرہا ہے یعنی ایک پیسہ ایک دھیلہ نہیں مانگتا اس نئے برا کیا ہے اگر اُسے فرزندی میں قبول کر لیا جائے ۔ زندگی بھر غلام بنا رہے گا بلکہ خدمتگاروں کی طرح گھر کا سودا سلف لا دیا کرے گا ۔ یہ سمجھو کہ داماد نہیں لا رہی ہو بے پیسوں کا غلام رکھ رہی ہو ۔

غزل نمبر ۳۴

کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے ۔۔۔ ایک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے

غالیہ : ایک قسم کی خوشبو ہوتی ہے وہ کافور مشک اور عنبر وغیرہ سے مرکب ہوتی ہے ۔ ود : ضمیر جمع غائب یعنی وہ کی جمع ۔

ہندوستان کے ایک مشہور والئی ریاست کے بارے میں مشہور ہے کہ جب وہ قوالی کی محفل میں شریک ہوتے تو اُس وقت تک کوئی شخص کسی قوال کے شعر کی داد نہیں دے سکتا تھا جب تک کہ وہ خود اُس پر واہ واہ کہہ کر داد نہ دے لیں ۔ گویا ان کی واہ واہ کے پیچھے پیچھے درباریوں کی واہ واہ رہتی تھی ۔ ایک دن قوالی کی محفل جمی ہوئی تھی اور والئی ریاست کے انتظار میں لوگ سر جھکائے قوالی سُن رہے تھے اتفاق سے ایک اناڑی صاحب جو آداب مجلسی سے نا واقف تھے گھس آئے اور انھوں نے جو قوال کو ایک بڑھیا شعر پڑھتے سُنا تو بے اختیار ان کے منہ سے واہ واہ نکل گئی ۔ یہ سنتے ہی سارا مجمع یہ سمجھ کر کہ والئی ریاست تشریف لائے ہیں واہ واہ کہتا اُٹھ کھڑا ہوا ۔ مرزا صاحب کے محبوب کے یہاں بھی غالباً کچھ اسی قسم کے آداب رائج تھے چنانچہ جب تک محبوب محفل میں نہیں آیا تھا سب اپنے اپنے گھٹنوں میں منھ ڈالے اکڑوں بیٹھے رہے اور اس کے آنے کی دعائیں مانگتے رہے لیکن اتنے میں جب لوگوں نے مرزا صاحب کو دیکھا تو اُن کی حالت انتظار محبوب میں بالکل غیر ہوتی جا رہی تھی ۔ ود ایک نے مشورہ دیا کہ بھائی مرزا صاحب کو زندہ رکھنے کے لئے اِس وقت صرف ایک صورت سمجھ میں آرہی ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص زور سے چلا اٹھے کہ ”لو صاحب وہ آگئے“ اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ خوش خبری سن کر مرزا صاحب کی ساری کیفیت دور ہو جائیگی اور وہ

اس مسرت افزا خبر کو سنکر زندہ ہو جائیں گے یا پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو جائے گی اور انتظار یار میں اُن پر جو جان کنی کا عالم ہے وہ ختم ہو جائے گا یعنی وہ آسانی سے انتقال فرما جائیں گے

آنا ہی مجھ میں میرے آنا نہیں گو ہے   ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم

صاعقہ = بجلی ۔ سیماب = پارہ ۔

مرزا صاحب نے محبوب کی خدمت میں ہزاروں لاکھوں درخواستیں گذاریں کہ کبھی تو آپ ہمارے غریب خانہ پر بھی تشریف لاکر ہم کو سرفراز فرمائیے چنانچہ آپ نے اس سلسلہ میں بڑا اہتمام کیا مگر لیکن محبوب صاحب آئے تو مگر ہوا کے گھوڑے پر بیٹھ کر آئے   داخل ہوتے ہی السلام علیکم و علیکم السلام کہتے ہوئے دوسرے دروازے سے نکلے چلے گئے اور مرزا صاحب نے جو ان کے لیے فرنیچر اور جھاڑ فانوس کرایہ پر منگوائے تھے اور چائے پانی پر روپیہ صرف کیا تھا وہ سب بیکار گیا۔

ہاں منھ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے   ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین

نکیرین = وہ فرشتے جو قبر میں سوال و جواب کرتے ہیں ۔ بادۂ دوشینہ = شب گذشتہ کی شراب ۔

مرزا صاحب زندگی بھر شراب نوشی کی اور عشق و محبت کے کاروبار میں لگے رہے ۔ اس سلسلہ میں تمام مولویوں نے بار بار اُن سے کہا کہ مرزا صاحب تھوڑی بہت تو عبادت کر لیجئے مگر مرزا صاحب ہمیشہ انکار کرتے رہے تو جب

یہ تھی کہ مرزا صاحب نے اپنی بخشش کے سلسلے میں ورسوال و جواب سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے شروع ہی سے ایک تدبیر سوچ رکھی تھی اور یہ طے کر لیا تھا کہ مرتے وقت حصول مقصد کی خاطر تھوڑی سی شراب پی لیں گے۔ چنانچہ اس شعر میں اُسی مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ صاحب نکیرین کو بھگانے کا ایک نہایت سستا نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ نکیرین شراب سے پرہیز کرتے ہیں پرہیز کیا کرتے ہیں بلکہ شراب خانے اور تاڑی خانے سے دو دو ڈھائی ڈھائی میل ہٹ کر چلتے ہیں تاکہ شراب کی بو ان کی ناک تک نہ پہنچنے پائے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ صاحب ہم نے تو یہ طے کیا ہے کہ جب مرنا چاہیں گے تو رات میں اتنی شراب پی لیں گے کہ سویرے چار پائی پر مرے ہوئے دکھائی پڑیں۔ ظاہر ہے جب ہم اس حالت میں قبر میں پہنچیں گے تو شراب کی بُو سے ساری قبر بس جائے گی۔ اور قبر کے ذرے ذرے سے شراب کی بدبو آئیگی۔ لہٰذا منکر نکیر شراب کی بو سونگھتے ہی صرف ہماری ہی قبر سے نہیں بلکہ اُس پورے قبرستان سے بھاگ جائیں گے اور ہمیں پرسش سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نجات حاصل ہو جائیگی۔ اور رستے داموں جنت مل جائے گی۔

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے　　ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے

اس شعر میں مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ صاحب جہاں تک موت کا تعلق ہے اُس سے نہ ہم نے کبھی دھونس کھائی اور نہ انشاء اللہ کبھی دھونس کھانے کا امکان ہے۔ لہٰذا جلاد جو بظاہر دشمن ہے اُس کو ہم اپنا دوست سمجھتے ہیں

کیونکہ موت سے ہم ڈرتے نہیں بلکہ ہر وقت دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ اے
پاک بے نیاز ہم کو تو موت دے اور چونکہ جلاد موت لے کر سر پر مسلط ہوتا ہے
لہٰذا وہ ہمارا دوست ہے۔ رہے جناب واعظ صاحب تو وہ البتہ ہمارے دوست
بنکر اور جھول دول ڈال کر ہم کو سمجھانے بجھانے تشریف لایا کرتے ہیں اور بداعمالیوں
جیسی لطیف حرکات سے ہٹا کر اُس راستے پر لانا چاہتے ہیں جو مسجد کو جاتا ہے
لہٰذا اُن کو ہم اپنا مادر زاد دشمن تصور کرتے ہیں خواہ وہ کوئی بھیس بدل کر آئیں
ہم ان کو پہچان لیں گے۔ مرزا صاحب اس شعر میں صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جناب
ہم تجید قیافہ شناس واقع ہوئے ہیں اور اپنے دوست و دشمن اور اچھائی برائی
کو نجوبی سمجھتے ہیں خواہ وہ کسی روپ اور کسی شکل میں کیوں نہ ہو۔

کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر   اچھے رہے آپ اُس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

مرزا صاحب کے دوست بھی مرزا صاحب سے حد درجہ پریشان تھے اور اس
کیوجہ یہ تھی کہ انکے دوست لاکھ اُن سے غمخواری اور ہمدردی کرتے یہ کوئی
نہ کوئی پہلو ایسا نکال کر اُن پر اعتراض کر بیٹھتے تھے جس سے اُن کے دوست
سخت عاجز تھے۔ چنانچہ جب مرزا صاحب عشق میں بالکل فٹ گئے اور اُن
کی حالت ایسی ہو گئی کہ لوگ خیال کرنے لگے کہ اب مرزا صاحب دو ہی ایک
روز کے مہمان ہیں تو مرزا صاحب کی عیادت کے سلسلے میں الکفوں نے کہا
کہ چلو کر ان کے محبوب سے ان کی سفارش کر دی جائے شاید تیر نظر کی دو ایک
خوراکوں سے ان کی طبیعت چاق چوبند ہو جائے لہٰذا جب یہ اُن کے محبوب کی خدمت
میں ایک وفد کی صورت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ ان کے محبوب کو بھی سخت زکام

ہو گیا ہے اور چھینکوں پر چھینکیں آ رہی ہیں ۔ لہٰذا ان لوگوں نے کہا کہ صاحب آپ فلاں فلاں دوا استعمال کیجئے ۔ زکام مار دواخانے نے ایک دوا چھینک مار ایجاد کی ہے اُسے پی کر دیکھئے ورنہ خالص جوشاندہ بھی ٹھیک رہے گا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اُن سے زکام کے اسباب پوچھنا شروع کئے اس پر مرزا صاحب کے ایک دوست جو بغل میں کھڑے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ موقع سے پورا فائدہ اٹھا کر کہا کہ جناب گستاخی معاف یہ جو آپ روز بروز گھلتی چلی جا رہی ہیں اور آپ کو نزلے زکام کھانسی کی شکایت رہتی ہے ۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مرزا صاحب کی یہ آہ و زاری کا اثر ہو جس نے فضا کو اس درجہ مسموم کر دیا ہے کہ سانس لینے میں وہ ناقص ہوا آپ کے دماغ تک پہنچ گئی ہے اور نزلہ زکام اور کمزوری کی شکل میں ظاہر ہو رہی ہے ۔ وہاں سے واپس آ کر اُن لوگوں نے مرزا صاحب کو اطلاع دی کہ مرزا صاحب وہ بھی آپ کی محبت میں گھل گھل کر رشتہ خطمی ہوئی جا رہی ہیں ۔ یہ سنتے ہی مرزا صاحب نے کہا کہ ہائے ہائے یہ آپ نے کیا غضب کیا جو اُن کی ۔ حالت دیکھ کر میری بیماری کا ذکر کر دیا ۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تو کھٹیا سے لگ جائیں گی اور آپ لوگوں کا کیا جائے گا ۔ گویا آپ نے میری سفارش کیا کی اور مجھ کو ڈبو دیا ۔

غزل نمبر ۳۵

پھر جگر کھودنے لگا ناخن　　　　آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

فصل = موسم ۔　لالہ کاری = لالہ کی کاشت ۔

مرزا صاحب عجیب عجیب رنگ اور عجیب عجیب انداز میں اپنی بیماریوں کا

ذکر کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اس شعر میں انھوں نے خارشں کا ذکر کیا ہے جس میں وہ ایک زمانہ میں اس درجہ مبتلا تھے کہ ہر وقت پنڈا کھجلایا کرتے تھے۔ ملاحظہ ہو اس کھجلی کا تعلق کس خوبی سے عشق سے ملا لیا ہے اور ہندستان جیسے زرعی ملک میں کس عمدہ انداز میں کھیتی باڑی کی رعایت سے اپنے خالص ہندوستانی ہونے کا ثبوت دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ جگر میں کھجلی شروع ہوئی اور ہم جگر کو ناخون سے کھودنے لگے۔ مقصد یہ کہ ہم نے سارا پنڈا ناخنوں سے کھجا ڈالا۔ اور کھجانے کی وجہ یہ ہے کہ لالہ کی کاشت کا موسم آگیا ہے لہذا جسم میں جس قدر ددوڑے پڑے ہیں اُن سے خون بہنے لگے گا۔ اس کے بعد ناخون سے جگر کھود کر تخم ریزی کریں گے۔ اس کے دو معنی ہیں یعنی جسم پر جن جن مقامات پر ابھی تک کھجلی نہیں ہے وہاں تک کھجلی کا سلسلہ قائم ہوجائے گا یا پھر قریب کے اٹھنے بیٹھنے والوں کو کھجلی میں مبتلا کردیں گے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ گل لالہ کی فراوانی ہوگی یعنی جس جگہ بیٹھیں گے وہاں زمین کو سرخ کردیں گے۔ گویا خود اپنا پنڈا تو خارشں کو کھجلا کھجلا کر سرخ کر ہی لیں گے لیکن اُس کی فراوانی سے سارے محلہ میں اس کھجلی کی بیماری کو پھیلا دیں گے۔

بیخودی بے سبب نہیں غالبؔ کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے

مرزا صاحب جب عشق کے مرض میں مبتلا ہوئے تو ہر وقت مراقبہ میں پڑے " یا محبوب یا محبوب " کے نعرے لگاتے رہتے تھے چنانچہ پہلی بار جب یہ اپنے محبوب کے تیر نظر کا نشانہ ہو کر آئے اور گھر میں اٹار کھٹارے کر پڑے رہے تو ان

کی محترمہ نے آکر دریافت کیا کہ "خیریت تو ہے آج کچھ بول نہیں رہے ہو اور اس طرح بے حس و حرکت پڑے ہو آخر بات کیا ہے؟ بتاؤ تو؟ مگر مرزا صاحب نہ منہ سے بولتے تھے اور نہ سر سے کھیلتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے اِن کی محترمہ کو شبہ ہوا کہ آج کہیں سے بہت زوروں میں پی پلا کر آئے ہیں جس کے سبب بے خودی کا عالم طاری ہے لیکن جب اِن کے دوست واحباب سے انھوں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ آج نہ انھوں نے پی ہے اور نہ کہیں گئے ہیں اِس پر اُنھوں نے کہا کہ آج کچھ دال میں کالا معلوم ہوتا ہے ہو نہ ہو اُسی مرزدار کا یہ سارا بس بویا ہوا ہے ورنہ اور کوئی وجہ اِس طرح چپ رہنے اور حالت بیان کرنیکی سمجھ میں نہیں آتی۔

غزل نمبر ۳۶

بس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تربت پہ میرے گل فشانی کی

عشق کا جنون مرتے مرتے مرزا صاحب کے سر پر سوار جب تک زندہ رہے گلی کوچوں میں آگے آگے یہ اور پیچھے پیچھے محلے کے لڑکے پتھر لئے دوڑتے پھرے اور یہ اپنی محبوبہ کی محبت میں پیٹ پر پتھر باندھے اور سر پر پتھر کھاتے زندگی گذارتے رہے۔ مرزا صاحب اس رنگ میں زندگی گذارنے کے بعد جب جان سے گذر گئے تو اُس کے بعد بھی لونڈے ان کی تاک میں لگے رہے چنانچہ اِن کے قبر پر پہنچ کر اُنھوں نے گیڑیاں کھیلنا شروع کیا۔ خشت باری کرنا شروع کی۔ مرزا صاحب آدمی ذہین تھے سوچے یہ کہ

مزار پر کوئی صاحب چراغ جلانے تو آنے سے رہے گھر والی سے اس کی اُمید اس وجہ سے نہ تھی کہ ظاہر ہے مرزا صاحب نے زندگی بھر اُنھیں کون سا خوش رکھا تھا جو وہ مزار پر چراغ جلانے آتیں۔ جس ڈومنی نے محبت کی تھی اُس کو زندگی ہی میں مار چکے تھے۔ جن دوسری "معشوقاؤں" پر انھوں نے جان دینا شروع کی تھی اُن کے پاس نہ تو اتنا وقت تھا کہ وہ مرزا صاحب کے مزار پر چراغ جلاتیں اور نہ اتنا پیسہ تھا جو دو پیسہ یومیہ کے حساب سے ایک روپیہ مہینے کا تیل خرید کر اپنے اس فرض کو ادا کریں ان حالات میں مرزا صاحب نے سوچا کہ یار مزار میں اندھیرا دور کرنے کی کیا صورت کی جائے چنانچہ آپ اُن پتھروں کو جو دن بھر لونڈے ان کے مزار پر پھینکتے رہتے تھے اُٹھا کر اُس سے چنگاریاں نکال لیتے اور اپنے لئے مزار میں گلفشانی کی صورت پیدا کر لیتے۔

غزل نمبر ۳۷

رگِ لیلیٰ کی خاک دشتِ مجنوں ریشگی بخشے

اگر بو وے بجائے دانہ دہقاں نوکِ نشتر کی

رگِ لیلیٰ اور نشتر سے بعض لوگوں کو تلمیح کا شبہ ہوتا ہے۔ حالانکہ اس شعر میں تلمیح نہیں ہے محض نشتر کی رعایت سے رگ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ریشگی = جڑیں پیدا ہوں۔ جڑ اور رگ میں مشابہت ہوتی ہے۔

عام طور پر اگر آپ کسی کھیت میں جو یا جوار کے دانے ڈالتے ہیں تو جو اور جوار ہی کی فصل پیدا ہوتی ہے مگر مجنوں نے لیلیٰ کی عشق بازی میں نہ جانے جنگلوں اور صحراؤں کی زمین کو اپنے جراثیم سے کس قدر ناکارہ کر دیا تھا کہ وہاں

اگر ککڑی اور کدو کے بیج ڈالے جاتے تو اُس سے بھی لیلیٰ کا درخت پیدا ہوتا۔ گنا بوییے، تو گنے کا درخت انا لیلیٰ کہتا ہوا ظاہر ہوگا آم بوییے تو اُس کے بور سے انا لیلیٰ کی آوازیں برآمد ہوں گی یہاں تک کہ اگر اُس میں فولاد کا ٹکڑا بو دیا جائے تو وہ بھی ایک درخت کی شکل میں انا لیلیٰ کہتا ہوا نکلے گا اور اس کی جڑیں رگ ہائے لیلیٰ کی شکل کی ہوں گی اس کے معنی یہ ہوئے کہ جناب مجنوں علیہ رحمۃ جن جن دوسرے بیابانوں اور جنگلوں کی دشت نوردی فرما چکے تھے انھوں نے اُن تمام زمینوں کو اینٹوں کا بھٹہ بھی نکنے والی زمین بنا دیا ہوگا۔ سنتے ہیں کہ جس زمین پر اینٹوں کا بھٹہ قائم کیا جاتا ہے اور اینٹیں پھونکی جاتی ہیں وہاں کی زمین میں کسی پودے کے اگنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی چنانچہ مجنوں نے بھی جہاں جہاں لیلیٰ کے عشق کی بھٹی کو پھونکا تھا وہاں کی زمین اس قدر ناکارہ ہوگئی تھی کہ سوائے لیلیٰ کے کوئی درخت پیدا ہی نہ ہو سکتا تھا۔

کہاں تک روؤں اُس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے
میری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

مرزا صاحب نے جب اپنے محبوب کا گھر میں رہنا دوبھر کر دیا تو اس نے گھر اکر خیموں میں قیام فرمانا شروع کر دیا کیونکہ مرزا صاحب دن رات اس کے گھر کی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر اُس کی راتوں کی نیند حرام کر دیتے تھے اس لئے اُس کو مرزا صاحب کے سر سے تو بظاہر کوئی ہمدردی نہ تھی البتہ وہ نیند کو ترس گئی تھی چنانچہ جب مرزا صاحب کو خبر ملی کہ اُن محترمہ نے ایک خیمہ خرید کر

اُس میں رہنا شروع کیا ہے تو اُنھوں نے وہاں پہنچکر بے پناہ رونا اور چلّانا شروع کر دیا مگر رونے کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے اِس لئے محبوبہ نے اِن کے رونے کی خاک پرواہ نہ کی اور وہ گھوڑے بیچکر آرام سے سوتی رہی مرزا صاحب کو کچھ رونا اِس پر آ رہا تھا کہ وہ اِن کے رونے سے متاثر نہیں ہوئی اور اُس سے زیادہ رونا اس بات پر آ رہا تھا کہ وہ دیوار سے سر ٹکرا ٹکرا کر اور کھٹ کھٹ کی صدائیں بلند کر کے جو محترمہ کو رات بھر جگانے کا مشغلہ تھا وہ بھی ختم ہو گیا کیونکہ خیمہ کی دیوار میں کپڑے کی تھیں لہٰذا اُس سے سر ٹکرانا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ یہ سر ٹکراتے تھے اور پردہ ہل کر رہ جاتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ سر ٹکرا کر جان بھی نہ دے پاتے تھے

غزل نمبر ۳۸

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے　　جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہو گئے

بے اعتدالی :کسی کام میں حد سے زیادہ بڑھ جانا۔ سُبک ہونا: ہلکے ہونا۔ ذلیل ہونا :۔ کم ہو گئے: یہ حقیر ہوئے :۔

یہ واقعہ ہے کہ کسی معاملہ میں اگر انسان اعتدال سے بڑھ جاتا ہے تو اُس کو ذلیل ہونا پڑتا ہے شرابی جب معینہ مقدار سے زیادہ شراب پی لیتا ہے تو وہ کسی موری میں فروکش نظر آتا ہے۔ مرد جب عورت کی خوشامد اعتدال سے زیادہ کرنے لگتا ہے تو بازار میں انگوچھا ہاتھ میں لئے ترکاریوں کا بھاؤ دریافت کرتا دکھائی پڑتا ہے۔ عورت جب اعتدال سے زیادہ بچے پیدا کرتی ہے تو اُس کا حُسن زائل ہو جاتا ہے اور مرد کی نظروں سے وہ گر جاتی ہے

غرض جو جتنا آگے بڑھتا ہے اُس کو ردِ عمل میں پیچھے ہٹنا پڑتا ہے اگر جوانی میں کوئی داڑھی رکھ لیتا ہے اور بے حد مذہبی اور خدا پرست نظر آتا ہے تو بڑھاپے میں وہی شخص کلین شیو اور حد درجہ گمراہی کی باتیں کرتا دکھائی دیتا ہے۔ غرض مرزا صاحب اس شعر میں تلقین فرما رہے ہیں کہ انسان کو اعتدال کی حد سے آگے نہ بڑھنا چاہئے ورنہ اس کا نتیجہ اور ردِ عمل خراب ہوگا۔

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں   تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

مرزا صاحب اس شعر میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ عشق کرنے کے بعد صرف محبوب ہی کے جور و ستم کا شکار نہیں بنے بلکہ اُن کو ان جور و تشدد کے علاوہ دوسرے مظالم سے بھی دو چار ہونا پڑا چنانچہ ایک دن محبوب جانے کس ترنگ میں تھا جو مرزا صاحب پر مہربان ہو گیا لیکن مرزا صاحب کے چہرہ پر حسب دستورِ قدیم اُسی طرح یتیم خانہ برستا رہا اور وہ اُسی طرح افسردہ اور غمگین رہے اُس نے کہا کہ مرزا صاحب خیریت تو ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو میرے جور و تشدد کی شکایت تھی سو وہ اب ختم ہو جانا چاہئے۔ کیونکہ میں نے اپنا ہاتھ روک لیا ہے اس پر مرزا صاحب نے رو کر کہا کہ ارے صاحب آپ کو نہیں معلوم کہ ہم پر آپ کی محبت میں دوہری مار پابندی سے پڑتی رہی ہے یوں سمجھ لیجئے کہ ایک تو آپ کی طرف سے جو جور و تشدد ہوتے تھے دوسری طرف گھر پر آپ کی محبت کے سلسلے میں صلواتیں سننے کو ملتی تھیں اور تیسرے سسرال والوں نے اٹھنا بیٹھنا دشوار کر رکھا تھا اور خسر صاحب ڈنڈا لئے لئے

پھرتے تھے۔ اللہ کسی دشمن کو بھی ان حالات سے دوچار نہ کرے۔ اسی لئے
مرزا صاحب فرماتے ہیں۔

"ترے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے"

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے — اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہو گئے

اس شعر میں مرزا صاحب اپنی شادی کا واقعہ بیان کرہے ہیں۔ مرزا صاحب
کی شادی اُن کے چچا نے تیرہ ہی سال کی عمر میں کردی تھی معلوم نہیں کیوں ؟
اور جن کے ہاں شادی ہوئی تھی اُن کا مکان بھی غالباً قریب ہی تھا چنانچہ
اس شعر میں مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ؎

اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہو گئے

یعنی ابھی ہماری داڑھی مونچھیں بھی نکلنے نہ پائی تھیں کہ چچا نے ہماری
شادی کردی اور پہلے مصرع میں فرماتے ہیں کہ ؎

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے

یعنی وہ پردہ نشین خاتون ہمارے گھر کے قریب ہی رہتی تھیں دام
سخت سے مراد یہ ہے کہ وہ سخت پردہ نشین اور دقیانوسی خیال کی تھیں۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں — ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

حکایات خوں چکاں = ایسی دردناک حکایات ہیں جن کے لکھنے میں
قلم سے اور سننے والوں کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگے :۔ ہاتھ قلم ہونا =
ہاتھ کٹ جانا ہے یہاں اس سے مراد زخمی یا شل ہونے سے ہے۔

اس شعر سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا صاحب کو زندگی بھر کس قدر عاشقانہ

خطوط لکھنا پڑے۔ اول تو دوستوں کے نام انھوں نے جو خط لکھے وہ تو بہر حال
اُن کے مرنے کے بعد مختلف مجموعوں کی شکل میں ہماری اور آپ کی نظروں سے
گذر ہی چکے ہیں لیکن ان خطوط کے علاوہ انھوں نے جوانی میں لاکھوں عشقیہ
خطوط بھی لکھے جس کا اس شعر میں حوالہ ہے۔ غالباً ان خطوط کے لکھنے میں
چچا نے ان پر کچھ بندشیں عاید کر رکھی تھیں اور جب یہ خط لکھتے دکھائی دیتے اور پکڑے
جاتے تو چچا ان کے ہاتھوں پر بید مارتے تھے جس سے ان کے ہاتھ لہو لہان ہو جاتے
تھے۔ جسے دیکھ کر گھر کی عورتیں خون کے آنسو روتی تھیں۔ یا پھر خطوط اتنے طویل
ہوتے تھے کہ لکھتے لکھتے اُن کے ہاتھ شل ہو جاتے تھے تیسری صورت یہ بھی
ہو سکتی ہے کہ یہ خطوط اس درجہ دردناک ہوتے تھے کہ نظر ثانی کرتے وقت ان
کی آنکھوں سے خون کے آنسو بہنے لگتے تھے۔ یا ممکن ہے کہ مرزا صاحب یہ سوچ کر
کہ ان خطوط کا جواب تو آنے سے رہا لکھے جاتے ہوں اور روتے جاتے ہوں
کہ ہائے یہ ساری محنت ضائع ہو رہی ہے۔ بہر حال یہ مصیبت تو ان کی ذات تک
محدود نہ تھی۔ مگر اس سے زیادہ مصیبت اُن لوگوں پر تھی جن کو لکھنے کے بعد
یہ خطوط سننا پڑتے تھے۔ کیونکہ اول تو اتنے خطوط سنتے سنتے لوگ رو پڑتے
تھے دوسرے وہ چونکہ درد بھرے ہوتے تھے اس لئے سننے والوں کو اخلاقی نقطہ
نظر سے بھی از راہِ ہمدردی تھوڑا بہت رونا پڑتا تھا۔ بہر حال طوالت
کے پیشِ نظر مرزا صاحب نے ان خطوط کے لئے "حکایات" کا لفظ استعمال
کیا ہے۔ اور دردناک واقعات کے پیشِ نظر ان کو خوں چکاں کہا ہے۔

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق   جو پاؤں اٹھ گئے وہی اُن کے علم ہوئے

اہل ہوس = بوالہوس۔ غرض کے بندے۔ بند = لڑائی۔ جنگ

علم = پرچم۔

اگر آپ نے کبھی کبڈی کا کھیل دیکھا ہو گا تو اندازہ کیا ہو گا کہ مخالف پارٹی کا ایک آدمی کبڈی کبڈی کہتا ہوا جب دوسرے فریق کے پالے میں جاتا ہے اور وہاں سے جب کسی کو چھو کر اپنے پالے میں آتا ہے تو اُسے فتح اور جیت قرار دیا جاتا ہے۔ مرزا صاحب اِس کھیل کو شاعرانہ انداز میں رقیب کے کندھے پر بندوق رکھ کر بیان کر رہے ہیں۔ کبڈی کے میدان میں رقیبوں کی جیت یعنی کبڈی کے فریق مخالف کی کامیابی یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ اپنے مقابل والے فریق کی گرفت میں آنے سے پہلے اُسے چھو کر بھاگ آئے اور فریق مخالف کو اُس پر جو روتشدد کا موقع نہ ملے یعنی وہ اپنے پالے میں اُسے پکڑ کر پچھاڑ نہ سکے گویا اُس کی کامیابی مخالف کے پالے سے بھاگ آنے ہی میں مضمر ہے۔ بھاگنے میں جو پاؤں اُٹھتے ہیں اُسی کو علم فتح تصور کیا جاتا ہے۔

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے — جو واں نہ کھنچ سکے سو وہاں آکے دم ہوئے

مرزا صاحب کا ڈھانچہ جب روزِ ازل بنکر تیار ہوا تو اُن کو کئی درجن نالے سپرد کر دیے گئے اُس کے بعد جب روح پھونک کر ان کو کھڑا کیا گیا تو انھوں نے سوچا کہ میں اپنے نالوں سے چاند ماری کی عشق شروع کروں مگر چونکہ نالوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ باوجود رات دن صرف کرنے کے ختم نہ ہوئے لہذا جو نالے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں بچ رہتے وہ اُن کو اپنے ہمراہ دنیا میں لے آئے اور یہاں پہنچکر انھوں نے سوچا کہ عشق بازی شروع کر کے ان نالوں

کو استعمال میں لے آؤ۔

چنانچہ فرماتے ہیں کہ ازل ہی سے عشق بازی کے جراثیم میرے جسم میں موجود تھے اِس لئے دنیا میں آنے کے بعد اب میں ان بچے ہوئے نالوں کو استعمال میں لا رہا ہوں۔

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

دل لگی = عشق بازی ۔ سائل = گدا۔

مرزا صاحب شروع شروع میں دولت مند تھے چنانچہ جب تک دولت رہی بے پناہ عشق فرماتے رہے اور عشق کے کوچے میں روپیہ پانی کی طرح بہاتے رہے جب تک لوگوں نے اِن کی رقمیں کھائیں مزے کرتے رہے۔ لیکن جب مرزا صاحب پیسے سے ٹوٹ گئے اور جوانی کی اُمنگیں سرد پڑ گئیں تو بقول شخصے " اُترا شحنہ مردک نام" انھوں نے سائل بنکر کچھ عرصے کام چلایا۔ جو لوگ زندگی میں تماش بینی فرما چکے ہیں وہ شاید مرزا صاحب کے اس شعر سے صحیح معنوں میں لطف اٹھا سکیں گے کیونکہ جب تک تماش بیں کی گرہ میں پیسہ رہتا ہے اُس وقت تک کوٹھے والیوں میں ہر تماش بیں کی بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ منٹ منٹ پر پان کی گلوریاں پیش کی جاتی ہیں اور وادرے اور پھیرویں میں وہ وہ گلے بازی دکھائی جاتی ہے کہ تماش بیں کی جیبیں ہی یاد کرتی ہیں مگر جب وہی تماش بیں پیسے سے ٹوٹ جاتا ہے تو سائل اور مساکین کے گروہ میں شامل ہوجاتا ہے انھیں کوٹھے والیوں میں جنھیں روپیہ کھلا چکا ہے چلمیں بھرتا اور حقے تازہ کرتا دکھائی دیتا ہے اُس کے بعد اُس کو خیرات زکوٰۃ

کی صورت میں وہی چیزیں ملتے لگتی ہیں جو کسی زمانے میں نہایت پابندی سے ہر وقت پیسے کے زور پر ملتی تھیں اس شعر میں مرزا صاحب اسی کا ذکر فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگرچہ ہم پیسے سے ٹوٹ گئے ہیں مگر ہم نے دل لگی سے کنارہ کشی نہیں اختیار کی ہے اور اب جو چیز پیسے سے میسّر ہوتی تھی اُسے سائل بنکر ہم نے حاصل کرنا شروع کر دیا ہے اور اہل کرم یعنی کوٹھے والیوں کے احسان کو احسان سمجھ کر اب بھی ان کے سامنے سر جھکائے نظر آتے ہیں۔

غزل نمبر ۳۹

مجھے اُس سے کیا توقع بزمانۂ جوانی　　　کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی

کودکی = بچپن۔

اِس شعر سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا صاحب کا محبوب بچپن ہی سے بڑا سیانا تھا اور باوجود انتہائی کوششوں کے مرزا صاحب کے چکروں میں بچپن سے جوانی تک کبھی نہ آیا۔ حالانکہ بچپن کا دور ایسا دور ہوتا ہے جبکہ سوچنے سمجھنے کی وہ صلاحیتیں انسان میں نہیں ہوتیں جو سن بلوغ کو پہنچکر انسان میں پیدا ہوتی ہیں چنانچہ مرزا صاحب نے اُس کو لاکھ لاکھ بہلاوے دیئے مثلاً یہ کہ چلو تمہیں تو چندی کا جمعرات کا میلہ دکھالائیں۔ آج فلاں جگہ تو پتنگی ہونے والی ہے چلو اُس میں ہمارے ساتھ چلو، مزے رہیں گے لیکن اُس نے مختلف بہانوں سے مرزا صاحب سے اپنے آپ کو بچائے رکھا اور جب سن شعور کو پہنچا تو اُس نے مرزا صاحب کی درد بھری کہانی اور عشق و محبت کی داستانوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ چنانچہ اس شعر میں مرزا صاحب اسی کا شکوہ فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب انھوں نے عشاق

بچپن میں گھانس نہ ڈالی تو جوان ہونے کے بعد تو ظاہر ہے کہ وہ کیا گھانس ڈالتے۔

غزل نمبر ۸۴

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

گوہر: موتی۔ عقد گردن: مالا۔ ستارہ اوج پر ہونا، نہایت بلند اقبال اور خوش نصیب ہونا۔

ایک صاحب ایک حکیم صاحب کی خدمت میں اپنی شیر خوار بچی کو لے کر حاضر ہوئے حکیم صاحب نے بچی کو معدے کی شکایت تجویز کی اور کہا کہ بچی سے زیادہ ماں کو احتیاط کی ضرورت ہے اُن کو چاہیئے کہ وہ دو روز فاقہ کریں اور اُس کے بعد بچی کو دودھ پلائیں اُن صاحب نے کہا کہ بچی ماں کا دودھ نہیں پیتی بلکہ بکری کا دودھ پیتی ہے اس پر حکیم صاحب بولے کہ تو پھر بکری کو دو روز فاقہ کرائیے۔ مرزا صاحب کا یہ شعر بھی کچھ اسی قسم کا ہے کہ مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ گوہر فروش کا تعلق ظاہر ہے کہ مرزا صاحب کی محبوبہ سے کیا ہو سکتا تھا مگر مرزا صاحب نے محبوب کا بالواسطہ ایک تعلق نکال ہی لیا اور اُس بد نصیب کو بھی اپنی محبوبہ کا عاشق قرار دے کر اُس کی خوش نصیبی پر اور اپنی بد نصیبی پر ماتم کرنا شروع کر دیا مرزا صاحب کا معشوق اپنے بناؤ سنگھار کے سلسلے میں کسی جوہری کے یہاں موتیوں کا ہار خریدنے گیا ہوگا۔ مرزا صاحب بھی پیچھے پیچھے اس کے ساتھ ہو لئے چنانچہ گوہر فروش نے جب محبوب کو موتیوں کا مالا دکھایا تو محبوب نے مالا پہن کر دیکھا کہ وہ چھوٹا بڑا تو نہیں ہے اور جب وہ ٹھیک نکلا تو گوہر فروش کو خوشی ہوئی کہ اب وہ بک جائے گا

یہ دیکھ کر مرزا صاحب آپے سے باہر ہو کر فرماتے ہیں کہ صاحب گوہر فروش کے نصیبے کی بلندی ملاحظہ ہو

کہ صاحب گوہر فروش کا نصیبہ بھی کتنے عروج پر ہے کہ اُس کا دیا ہوا مالا محبوب کو اس درجہ پسند آگیا کہ اُس نے خوش ہو کر لے لیا اُسکے معنے یہ ہیں کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے ورنہ اُن کے خوش ہونے کی ضرورت کیا تھی۔ اب بھلا بتائیے کہ اس میں عاشقی اور معشوقی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے لہٰذا یہ تو بالکل حکیم صاحب والی بات تھی کہ تکلیف بچے کو ہے اور فاقہ بکری کو دیا جا رہا ہے اسی طرح گوہر فروش اپنی چیز بکنے پر خوش ہے اور مرزا صاحب ہیں کہ اس بدنصیب کو عشق کا مجرم قرار دیئے بیٹھے ہیں۔

دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست بزمِ خیال، میکدۂ بے خروش ہے

میکدۂ بے خروش = ایسا شرابخانہ جہاں کوئی آواز نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ مرزا صاحب کو اگر محبوب کی بزم میں جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی تو یہ کسی نہ کسی عنوان سے اپنی پکائی ہانڈی میں لینڈی نکال کر رکھدیا کرتے تھے اور محبوب کی بزم کو "بے خروش" بتا کر وہاں کی دلچسپیوں میں ایک کمی کا اظہار کر دیتے۔ یہ بھی حقیقتاً مرزا صاحب کا حسن طلب ہے یعنی اگر اُس بزم میں مرزا صاحب کو بلا لیا جاتا تو مرزا صاحب دو چار نالے اور دس پانچ آہیں کھینچکر اُس بزم کی رونق میں اضافہ فرما دیتے۔ مگر چونکہ محبوب نے ایسا نہیں کیا لہٰذا مرزا صاحب کو ان کی محفل میں ایک کمی محسوس ہونے لگی اس واقعہ کو مرزا صاحب اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ محبوب نے جو بزم نشاط منعقد کی ہے۔ اُس میں اگرچہ میخانہ کی سی

کیفیت ہے مگر وہ شور و غوغا نظر نہیں آتا جس سے بزم کی رونق میں اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ دیدار بادۂ معشوق کو سر بہ زانو ہو کر تصور میں دیکھنا شراب کا سا سرور پیدا کرتا ہے (حوصلہ ساقی) اُس کے بلوے کی تاب لانا حوصلہ ہی کا کام ہے۔ اس لئے حوصلہ کو مرزا صاحب نے اپنا ساقی قرار دیا ہے جس سے بادۂ دیدار حاصل ہوتا ہے۔ نگاہ مست یعنی دوست کے دیکھنے سے نگاہ مست ہو جاتی ہے۔ غرض مرزا صاحب نے کئی میل کا چکر کاٹ کر ایک بات جو سیدھے سادے طریقے پر کہی جا سکتی تھی وہ اس شعر میں فرمائی ہے۔

غزل نمبر ۱۴۱

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے　　نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے

نشہ = سرور۔ خمار = تکلیف۔ دردسر بادہ بدمزگی جو نشہ کے آثار کے وقت ہوتی ہے۔ اس شعر میں مرزا صاحب کو جس چیز پر اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ یہ جنت میں ہزاروں لاکھوں مولوی اور قربانی کے جانور اور دیگر معصومین کو رکھنا کیا معنے یہ جنت تو کوئی معاوضہ ہی نہ ہوا کیونکہ دنیا میں بعض تکلیفیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کے بدلے میں پوری پوری جنت دیدی جائے تب بھی اُس کی پوری پوری قیمت ادا نہیں ہوتی لہذا جنت سے کچھ زیادہ دیا جانا چاہئے تھا۔ مثلاً بکرے ہی کو لے لیجئے اس بدنصیب کو با اوقات عین جوانی میں ذبح کر دیا جاتا ہے اور اُس کی ساری حسرتیں خاک میں مل جاتی ہیں حالانکہ اُس کی ایک ایک آرزو، ایک ایک جنت کی مستحق ہوتی ہے اسی طرح بدنصیب گھوڑے کو لے لیجئے جو شباب آنے سے پہلے ہی یکے اور تانگے والوں کے بس کے آگے

جتا رہتا ہے۔ شادی بیاہ اور دوسرے جھگڑوں کو تو چھوڑیئے اُس کو گھاس تک نہیں نصیب ہوتی۔ لہٰذا قہر درویش بر جان درویش۔ اگر کسی وقت بنہناکر وہ اپنے معاشقہ کا اظہار کرتا ہے تو اُس پر سیکڑوں چابکیں پڑ جاتی ہیں اور اُس کے معاوضے میں زیادہ سے زیادہ اُس کو جنت کے لان پر چرنے کی اجازت دیدی جائے گی۔ بھلا یہ بھی کوئی معاوضہ ہوا۔

گریہ نکالے ہے تیری بزم سے مجھ کو ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

مرزا صاحب عشق و محبت میں اس قدر روئے تھے کہ اب اُن کو اپنے گریہ پر بھی اختیار باقی نہیں رہا تھا۔ چنانچہ ایک دن ان کو روتے دیکھ کر ایک صاحب کو ان پر ترس آگیا اور اُن کو لاکر اُن کے محبوب کی بزم میں بٹھا دیا گیا یہاں قہقہے بازی ہو رہی تھی اور محبوب سے اور بزم میں بیٹھنے والوں سے چٹکی بکوٹوں کا مذاق ہو رہا تھا۔ مرزا صاحب جو پہنچے اور انھوں نے یہ رنگ دیکھا تو تھوڑی دیر تو بیٹھے منہ بناتے رہے اس کے بعد بآواز بلند رونا پیٹنا شروع کر دیا جب محبوب نے مرزا صاحب کی یہ حرکت دیکھی تو حکم دیا کہ ان حضرت سے کہہ دو کہ ذرا ہماری محفل سے چلے جائیں۔ اول تو بغیر بلائے محفل میں گھس آئے ہیں مگر اس کے بعد بزم نشاط میں نحوست پھیلانے کیلئے رونا شروع کر دیا ہے۔ بہر حال مرزا صاحب نکل تو آئے لیکن اب اس بات پر شرمندہ اور خجل ہیں کہ ہائے اب ہم کو رونے پر بھی ذرہ برابر اختیار نہیں رہا یہ واقعہ ہے کہ مرزا صاحب کے کلام جس طرح آورد کم اور آمد زیادہ تھی اُسی طرح اُن کے رونے میں آمد زیادہ اور آورد کم تھی۔

قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے   وائے اگر عہد آستوار نہیں ہے

مرزا صاحب نے اس شعر میں اپنے اوپر رکھ کر جس عاشق کا تذکرہ کیا ہے اسکے بارے میں واحد متکلم کی ضمیر استعمال کرکے فرماتے ہیں کہ میں اپنی زندگی سے بیزار ہوں اور اس درجہ بیزار ہوں کہ خودکشی کرنے پر اتر آیا ہوں چنانچہ ان کو اس طرح معشوق کے پاس لے جایا گیا جس طرح بقرعید کے موقع پر جامع مسجد سے کوئی بھیڑ خرید کر لاتا ہے۔ اتفاق سے معشوق نے ان کو دیکھ کر ان کے قتل کا وعدہ کر لیا اور اس پر مرزا صاحب خوش ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ وہ یہ خطرہ بھی محسوس کر رہے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ معشوق ان کے ہاتھ پیر دیکھ کر یہ نہ کہہ دے کہ یہ قربانی کے قابل نہیں ہیں اور شرعاً ان پر قربانی جائز نہیں۔

غزل نمبر ۲۴

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی   سمجھیو مت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے

پاس : لحاظ، خیال

مرزا صاحب کو تکلیفیں اٹھاتے اٹھاتے، تکلیف کا احساس ہی جاتا رہا ہے، اب لوگ انھیں بے حسا کہنے پر اتر آئے ہیں چنانچہ مرزا صاحب جب محبوب کے جور و تشدد سے مجروح ہو کر ایک رفوگر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس سے بھاؤ تاؤ کر کے معاملہ طے کیا تو اس نے مرزا صاحب کے زخموں کی کھال برابر کر کے انھیں رفو کرنا شروع کیا مرزا صاحب کھال میں سوئی کی چبھن محسوس کئے بغیر اپنی جگہ پر ڈٹے رہے اور ذرہ برابر منھ سے اُف نہ کی۔

اس پر رفوگر کو حیرت ہوئی کیونکہ ابتک جتنے لوگ اس کے پاس رفو کرانے آئے تھے اُن کے زخموں کا رفو اس طرح پکڑ دھکڑ کر کیا جاتا تھا جس طرح بیلوں کی نعلیں ٹھونکی جاتی ہیں یا گھوڑے کے بال کاٹے جاتے ہیں۔ چنانچہ رفوگر نے کہا کہ صاحب یہ تو کچھ مجنوں سے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ ان کی کھال سی جا رہی ہے اور یہ ٹس سے مس نہیں ہو رہے ہیں اُس کے اس کہنے پر مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ یہ جملہ اپنی اپنی برداشت کا معاملہ ہے ہم پر اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کا اثر نہیں ہوتا چونکہ ہماری خود اک ہی محبوب کے تیر نظر اور تیغ ابرو رہی ہے۔ لہذا ہم پر اس کھال کے کھینچنے یا سوئی چبھونے کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ اس طرح رفو کرنے میں درد نہیں ہوتا۔

غزل نمبر ۳۴

دیکھنا حالت میرے دل کی ہم آغوشی کے وقت ہے نگاہِ آشنا تیرا سر ہر مُو مجھے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کے محبوب کے سارے بدن پر بڑے بڑے بال جمے تھے اور جب مرزا صاحب اُس سے ہم آغوشی فرماتے تو اُس کے بال مرزا صاحب کے جسم میں چبھنا شروع ہو جاتے۔ مرزا صاحب کو تکلیف تو ضرور ہوتی ہوگی کیونکہ اگر کسی کے معمولی سی پھانس لگ جاتی ہے تو وہ چلّا اٹھتا ہے۔ چہ جائیکہ اچھے بڑے، خاردار اور گھوڑے کی دم سے زیادہ سخت بال جس کی چبھن سے جانور تک بلبلا اُٹھے۔ مگر مرزا صاحب آدمی سیانے تھے اِس تکلیف کا اظہار دوسرے لفظوں میں

اس طرح فرماتے ہیں کہ بال زندہ محبوب سے مل کر بڑا مزا آتا ہے اور اُن کے بالوں کی نوکیں برچھی کی انی کی طرح دل میں اتر جاتی ہیں بہر حال ان سارے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کے بندے کی ساری کھال ان کی زندگی میں مردہ ہو چکی تھی جس کے سبب نہ رفوگر کی سوئی کاوہ کوئی اثر قبول کرتے تھے اور نہ محبوب کے بلم صفت بال اُن کو ہم آغوشی کے وقت برے معلوم ہوتے تھے۔

غزل نمبر ۴۴

آتش کدہ ہے سینہ مرا راز نہاں سے اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آئے

مرزا صاحب نے اپنے سینے کو عشق و محبت کا ایک آتشکدہ بنا رکھا تھا مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ راز جس کی وجہ سے وہ اس آتشکدے کے دارو غہ بنے ہوئے تھے اُس کا اظہار کسی سے نہ کر سکتے تھے اور کرتے بھی کس سے؟ یا تو گھر والوں سے یا محبوبہ کے گھر والوں سے۔ دونوں صورتیں ان کے لئے تکلیف دہ تھیں کیونکہ اگر بیوی سے بتاتے کہ ہم ایک سے عشق کئے ہوئے ہیں تو گویا بیوی کے یہاں سوتاپے کا آتشکدہ پورے جاہ و جلال کے ساتھ وجود میں آجاتا اور اُن کے لئے گھر دوزخ بن جاتا۔ اور سسرال والے ان کا جو حشر کرتے وہ صرف دو بیویوں والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ دوسری طرف اگر اس کی اطلاع لڑکی والوں کو ہو جاتی تو ظاہر ہے کہ اُن کی لڑکی کھٹائی میں پڑ جاتی اور وہ لاٹھی پونگے لے کر مرزا صاحب کے گھر پہنچ جاتے۔ لہذا مرزا صاحب بیک وقت کئی کئی بہانے کا بار اپنے اوپر لادے ہوئے تھے اور یہ مرزا صاحب ہی کا دل گردہ تھا جو اُس بار کو زندگی بھر سینے پر اٹھائے رہے اور کسی سے نہیں بتا سکے کہ اُن کے سینہ میں جو

آگ جل رہی ہے حقیقت ہے کہ اگر موجودہ دور کے اُن پہلوانوں سے مرزا صاحب کا مقابلہ کیا جائے جو اپنے سینوں پر موٹر چلواتے ہیں یا ریلیں وڑرواتے ہیں تو مرزا صاحب کو ان سب کا سپہ سالار قرار دینا بیجا نہ ہوگا۔

غزل نمبر ۸۴

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ　　جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

مرزا صاحب نے اس شعر میں اُس زمانے کا ذکر کیا ہے جب بجائے سکّے کے جنس سے خرید و فروخت ہوتی تھی۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ دل کی قیمت ایک بوسہ ہے بوسہ دیں اور دل لیں مثلاً آپ کو بازار سے کدو خریدنا ہے تو سیر بھر کدو خریدنے کے لئے اگر آپ پاؤ بھر اناج اُس کے معاوضے میں دیں تب سبزی فروش راضی ہو سکتا ہے مگر مرزا صاحب کا معشوق چونکہ مرزا صاحب کی طرح پیسے سے ٹوٹا ہوا تھا اس لئے وہ سکّہ رائج الوقت میں قیمت ادا کرنے کے لئے تیار نہیں تھا مگر ساتھ ہی ساتھ اُس کو مرزا صاحب کا دل بہت پسند تھا اور اُس کی وجہ یہ تھی کہ مرزا صاحب کا دل سینکڑوں تمناؤں اور ہزاروں آرزوؤں سے مالامال تھا۔ لہذا ہر شخص دیکھتے ہی اُس کے دام لگا دیتا تھا۔ اگر مرزا صاحب کے محبوب نے ایسا کیا تو کیا غلط کیا؟ دوسرے مرزا صاحب کے بوسہ سے بھی غالباً وہ کوئی خاص قسم کا خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ کیونکہ مرزا صاحب کا بوسہ ہمارا آپ کا ہلکا پھلکا بوسہ تو ہوتا نہ تھا جو ایک چٹخارے کے بعد ختم ہو جاتا۔ وہ اگر بوسہ لیتے تو ظاہر ہے کہ اصل معہ سود کے وصول کر لیتے تھے کیونکہ زندگی بھر بوسے کو ترسے ہوئے تھے۔ گھر میں بوسوں کا کال اس وجہ سے تھا کہ مرزا صاحب کے تعلقات بیوی

سے اس وجہ سے اچھے نہ تھے کہ وہ حد درجہ مذہبی واقع ہوئی تھیں اور بقول مرزا صاحب انھوں نے اپنی عبادت و ریاضت سے گھر کو مسجد بنا رکھا تھا ممکن ہے وہ شرعاً بوسے بازی کو ناجائز قرار دیتی ہوں ۔ لہٰذا مرزا صاحب جو بوسہ کے فاقہ میں زندگی بسر کرتے چلے آرہے تھے اگر وہ بوسہ لیتے تو وہ بوسہ بھی بحر طویل ہی میں ہوتا جس کے لئے اُن کا محبوب تیار نہ تھا۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا　　جام جم سے یہ میرا جام سفال اچھا ہے

اس شعر میں جو سادگی اور بے ساختگی ہے وہ تو بہر حال مرزا صاحب کا حصّہ ہے لیکن اس شعر سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مرزا صاحب جو شراب پیتے تھے کسی آبخورے یا مٹی کے برتن میں پیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اُن کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آتے کہ وہ روز روز بازار سے جام جم قسم کے ظروف خرید خرید کر لاتے اور اُس سے لطف اندوز ہوتے ۔ چونکہ مرزا صاحب کے گرد و پیش بچوں کا بھی ہجوم رہتا تھا لہٰذا مرزا صاحب اس وجہ سے بھی شیشے کے برتنوں میں شراب نہیں پی سکتے ہوں گے کہ ہر وقت شیشے کے برتنوں کے ٹوٹ پھوٹ کا خطرہ تھا ۔ تیسرے مرزا صاحب جس دور کے آدمی تھے اُس دور میں شراب کو حد درجہ معیوب سمجھا جاتا تھا لہٰذا وہ اس قسم کے ظروف رکھ بھی نہیں سکتے تھے ۔ کوزے یا مٹی کے برتن کا معاملہ ایسا ہے کہ پیا اور زمین پر لڑھکا دیا اور چار پیسے کے دو ڈھائی درجن کلھڑ بازار سے خرید لائے اور کام نکال لیا کم خرچ اور بالانشین درحقیقت اسی کا نام ہے ۔ اسی لئے مرزا صاحب جام جم سے اپنے اس کلھڑ کو ہزار گنا

بہتر سمجھتے تھے۔ مرزا صاحب نے اچھا ہی کیا۔ ورنہ خدا جانے کتنے جام ٹوٹتے اور روزمرہ کہاں سے اتنا پیسہ پاتے جو بازار سے خرید خرید کر لاتے رہتے۔

بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے   وہ گدا جسکو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

مرزا صاحب اس شعر میں فرماتے ہیں کہ سوال کرنے اور مانگنے میں بڑی ذلت ہے اور جو چیز ذلت کے ساتھ حاصل ہو۔ اُس میں مزہ نہیں آتا۔ یہ شعر حقیقتاً مرزا ہی صاحب کے کہنے کے لائق تھا۔ کیونکہ مرزا صاحب یہ چاہتے تھے کہ اگر محبوبہ کو طلب کیا گیا اور وہ تشریف لائیں تو ظاہر ہے کہ ڈولی کا کرایہ اور کہاروں کو انعام و اکرام کہاں سے دیا جائے گا لہذا انھوں نے یہ طریقہ مناسب سمجھا کہ بغیر مانگے ہوئے چیز حاصل ہو جائے اور اگر ان کی محبوبہ بھی اُن سے ملنے آئے اور مطالبہ کرے کہ ڈولی کا کرایہ دلوا دیجئے تو مرزا صاحب یہ کہہ دیں کہ صاحب میں نے کب آپ کے پاس آدمی بھیجا تھا کہ آپ تشریف لائیں۔ میں تو اس سلسلے میں پہلے ہی سے ایک شعر کہے بیٹھا ہوں کہ صاحب مزہ تو اس میں ہے کہ بغیر طلب کئے ہوئے چیز حاصل ہو۔ چنانچہ اب آپ تشریف لائی ہیں تو حرجہ خرچہ خود برداشت کیجئے میں تو بہر حال طلب کرنے اور سوال کرنے کو ہمیشہ سے اپنے لئے بُرا سمجھتا ہوں اور مانگنے کو ذلت سمجھتا ہوں۔

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق   وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ عشق و محبت کا شعر ہے یا بقول خواجہ الطاف حسین حالی۔ مرزا صاحب اس شعر میں فرماتے ہیں کہ شاعر کو پہلے سے یہ بات معلوم تھی کہ دوست کے ملنے سے خوشی ہوتی ہے اور بگڑی طبیعت بحال ہو جاتی ہے اُسے یہ بھی معلوم

تھا کہ محبوب کو جب تک عاشق ..... اپنی حالتِ زار اور اُس کی جدائی کا صدمہ نہ بتائے وہ اُس کی سچی محبت اور عشق کا پورا پورا یقین نہیں کرسکتا۔ اُنھیں یہ بھی معلوم تھا کہ بعض خوشیوں سے چہرہ پر جو بشاشت آجاتی ہے اُس سے رنج اور تکلیف کا کوئی نشان اور اثر چہرے پر باقی نہیں ہوتا۔ حالانکہ ہمیں خواجہ صاحب کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے بلکہ ہمارے خیال میں اس شعر میں مرزا صاحب نے اپنے قرض کے لین دین کے معاملات سے بحث کی ہے اور اُس میں یہ بات بتانے کی کوشش کی ہے کہ جب اپنے شاگرد جو مرزا صاحب کی دامے درمے سخنے امداد کیا کرتے تھے مرزا صاحب کی مزاج پرسی کے لئے پہنچ جاتے تھے تو مرزا صاحب کے چہرے پر بشاشت نمودار ہو جاتی تھی۔ اِس شعر کا صحیح مطلب یہ ہے کہ مرزا صاحب پیسے سے ٹوٹے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے اُن کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں اور ان کی صورت بیماروں جیسی ہو گئی ہے۔ قرض جہاں [illegible] مل سکتا ہے وہاں سے مرزا صاحب لے چکے ہیں اتنے میں اچانک مرزا صاحب کے وہ سب کے سب دوست پہنچ جاتے ہیں جو مرزا صاحب کی مدد کرتے رہے ہیں [illegible] ان کا چہرہ دیکھ کر مرزا صاحب کے چہرے سے مسرت عیاں ہونے لگتی ہے۔ [illegible] مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ "اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنہ پر رونق" مطلب یہ کہ ان کو دیکھ کر ساری مایوسی مسرت میں بدل گئی ہے۔ لہٰذا وہ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ مرزا صاحب کی مالی حالت بہتر ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ ان کے آنے کی خوشی سے چہرہ پر یہ کیفیت طاری ہوئی ہے اور ان سے مزید قرض لینے کی شکل نکل آئی ہے

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض اِک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

برہمن یہاں مُراد جوتشی سے ہے۔

مرزا صاحب چونکہ عشق کے مریض تھے اور ان کو زندگی بھر اس کی آرزو رہی کہ محبوب اُن پر مہربان ہو جائے۔ چنانچہ محبوبہ کی یاد میں یہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر غم میں لگا رہے تھے کہ اتفاق سے اُدھر سے ایک جوتشی گذرا جو "پانڈت، پانڈت" کی آواز لگا رہا تھا۔ مرزا صاحب نے سوچا کہ ایک پیسہ تو ضرور ضائع ہو گا لیکن ذرا اس سے پوچھ کر دیکھا تو جائے کہ آئندہ سال کے ۳۶۵ دنوں میں کوئی دن ایسا بھی ہے جب اُن کا محبوب کنڈی کھٹکھٹا کر خود اُن سے ملنے آئے گا اور ان کا سال معشوق سے ملاقات کے سلسلے میں اچھا گذرے گا۔ پنڈت نے مرزا صاحب کا ہاتھ دیکھ کر غالباً اُنھیں خوش کرنے کے لئے یا پیسہ وصول کرنے کی خاطر ایک چلتو بات کہہ دی کہ مرزا صاحب آپ کے ہاتھ کی لکیریں تو براہ راست محبوبہ کے گھر تک گئی ہوئی ہیں بلکہ بیچ میں دو ایک لکیریں تو ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ الٹے آپ کے گھر آئیں گی، ڈولی پر بیٹھ کر آئیں گی اور کرایہ اپنا گرہ سے ادا کریں گی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ آپ کے ہاتھ میں بعض لکیریں یہ بھی بتاتی ہیں کہ وہ آپ کے اس درجہ موافق ہیں کہ ستاروں کی چھاؤں میں وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گی مگر مرزا صاحب اپنے مقدر سے اس درجہ مایوس تھے کہ وہ سمجھتے تھے کہ جو کچھ برہمن کہہ رہا ہے وہ سب دل بہلاوے کی باتیں ہیں لہذا اس شعر کو اگر آپ بغور پڑھیں تو اس کے پہلے مصرعہ میں استفہام انکاری ہے یعنی عشاق بتوں سے کوئی فیض نہ پائیں گے باوصف اس کے کہ سال کے مبارک ہونے کی پیشین گوئی برہمن نے کی ہے مگر چونکہ وہ پیدائشی بدقسمت ہوتے ہیں۔ اس لئے

مرزا صاحب نے برہمن کی پیشین گوئی پر طنز کیا ہے اور انھیں محترمہ کے آنے کی طرف سے کامل مایوسی ہوئی ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ مرزا صاحب شراب بکثرت پیتے تھے اس لئے وہ دوزخ جنت کسی چیز کے قائل نہ تھے چنانچہ اس شعر میں بھی وہ جنت سے انکار کر رہے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ پہلے مصرعہ میں مرزا صاحب "ہم کو" پر زور دے رہے ہیں یعنی آپ جو مولویوں سے جنت کی حقیقت دریافت کئے بیٹھے تھے وہ غلط ہے نہ تو وہاں دودو ڈھائی ڈھائی سیر کے سیب اور انگور ہیں اور نہ آٹھ آٹھ نو نو سیر وزنی سنگترے اور ناشپاتیاں لگی ہوں گی یہ سب مولویوں کی اڑائی ہوئی باتیں ہیں جو اسکی چکر میں نمازیں پڑھتے اور روزے پر روزے رکھ کر اپنے آپ کو متقی اور پرہیزگار ظاہر کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز پڑھتے وقت ان سبھوں کے دماغوں میں جنتی وشتر خوان بسے ہوتے ہیں اور یہ جنتی تصرف محلات اور وہاں کی حوروں کا تصور رکھ کے اس غلط فہمی میں اپنے آپ کو مبتلا کئے ہوتے ہیں کہ وہاں دو دو چار چار حوریں عبادت کے انھیں بطور بانگی مل جائیں گی اور اس طرح وہ عالم بالا میں پہنچکر جلد میں عمل معہ سود اپنی عبادت کی قیمت وصول کریں گے۔ دوسرے مصرعہ میں مرزا صاحب واضح طور پر کہتے ہیں کہ یہ ساری باتیں مولوی اپنا اور دوسروں کا دل خوش کرنے کے لئے کہتے ہیں مگر یقین مانئے کہ ان کی ساری عبادت حرص وطمع وریاکاری کے جذبات کے تحت ہے۔ ورنہ جہاں تک جنت کی حقیقت

اور مایت کا تعلق ہے اُسے ہم جیسے رند مشرب اچھی طرح سمجھتے ہیں جو حرص و طمع لالچ اور تعصب سے بالا ہیں اور نہایت قناعت کی زندگی بسر کر رہے ہیں ہماری نیتوں میں کسی قسم کا فتور نہیں ہے۔ یہ ساری چیزیں مولویوں کو مبارک رہیں۔

غزل نمبر ۴۶

نہ ہوئی گر میرے مرنے سے تسلی نہ سہی   امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

مرزا صاحب کے معشوق نے اُن کو زندگی بھر سو سو طرح کی اذیتیں پہنچائیں اور اُن کی وفاداری کا ہزار ہزار طریقوں سے امتحان لیا اور آخیر میں وفاداری کے امتحان میں پورا اُترنے کے بعد کہہ دیا کہ صاحب آپ کا کام کچھ زیادہ اطمینان بخش نہیں ہے۔ مثلاً دن بھر چھلنی میں پانی بھروایا اور اُس کے بعد فرمایا کہ دکھایئے آپ نے دن بھر کیا کام کیا؟ مرزا صاحب نے فرمایا کہ آپ کے حکم کی تعمیل کی اور کیا کرتا؟ بولے پانی کہاں ہے؟ کہا حضور چھلنی میں پانی ٹکتا بھی ہے؟ اُس پر جواب ملا کہ صاحب آپ کا کام بالکل ہی اطمینان بخش نہیں ہے۔ آپ سے ایک معمولی پانی بھرنے کو کہا گیا تھا وہ تک آپ نہ بھر پائے۔ لہٰذا آپ عشق میں سوائے تضیع اوقات کسی کام کے معقول انجام دینے کے اہل نہیں ہیں۔ غرض ساری زندگی مرزا صاحب محبوب کے حکم کے غلام بنے رہے مگر اُن کی نظروں میں مرزا صاحب کوئی عزت حاصل نہ کر پائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا صاحب اسی غم میں مر گئے۔ اب مرنے کے بعد جیسا کہ تمام شاعر بولتے رہتے ہیں اور شعر کہا کرتے ہیں مرزا صاحب نے بھی کہا کہ صاحب وفاداری کا آخری امتحان تک ہم نے دیدیا یعنی اپنی جان تک قربان کر دی مگر اب بھی آپ کتے کی دم کی طرح ٹیڑھی کی ٹیڑھی نظر آ رہی ہیں۔ اب مرنے کے بعد تو

ہماری وفاداری کا سرٹیفکیٹ عنایت ہو ورنہ اس کے بعد بھی اگر امتحان اور آزمائش میں کوئی کسر باقی ہے تو وہ بھی پوری کر لیجئے کیوں اپنے دل میں کوئی حوصلہ رکھئے اب میت حاضر ہے کفن گھسٹوا دیجئے یا توپ پر رکھ کر اڑوا دیجئے ہم اُس کے لئے بھی حاضر ہیں ۔ مقصد یہ ہے کہ مرزا صاحب کی عشق میں جان گئی مگر اس کے بعد بھی اُن کے محبوب کو تسکین نہ ہوئی ۔ حقیقتاً مرزا صاحب پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ چڑیا اپنی جان سے گئی اور کھانے والوں کو مزہ نہیں ملا ۔

خار خارِ الم حسرت دیدار تو ہے   شوق گلچین گلستانِ تسلی نہ سہی

خار خارِ الم حسرت دیدار = حسرت دیدار کی تکلیف ۔ گلچیں ، گلستان تسلی : یعنی تسلی کو گلستان یا باغ تصور کیا ہے اس لئے مطلب ہوا تسلی کے پھول چننے والا یعنی جسے تسلی حاصل ہو ۔

مرزا صاحب کے جیسے تمام عشاق یہ چاہتے تھے کہ گھنٹہ گھر کی طرح اُن کا محبوب ہر وقت ان کے سامنے کھڑا رہے اور یہ اس کے حسن و جمال سے لطف اندوز ہوتے رہیں ۔ چنانچہ اس شعر میں بھی وہ اپنے شوق دیدار کی تشنگی کا ذکر فرماتے ہیں ۔ اور کہتے ہیں کہ اگر دیدار کی حسرت پوری نہ ہوئی اور اس کا غم رہا تو یہی کیا کم فائدہ ہوا کہ اُس کا غم ہی ہاتھ لگ گیا بھاگتے بھوت کی لنگوٹی بھلی ۔ عام طور پر تمام عشاق جو محبوب کے جور و تشدد سے کھائے ہوئے ہوتے ہیں اُن کو آخر میں کھمبا نوچتے ہی بن پڑتا ہے ۔ ایک صاحب کی کسی نے ناک توڑ دی ۔ کچھ لوگوں نے ناک کی تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ بڑا نقصان عظیم ہوا ۔ یعنی چہرے پر سے ناک ہی غائب ہو گئی ۔ اب آپ سونگھنے کا کام کس چیز سے لیں گے ۔ بولے کہ آپ نے ایک فائدے

پر نظر نہیں کی یعنی یہ کہ ناک ٹوٹی تو ٹوٹی مگر مکھیوں کے عذاب سے تو چھوٹی۔ اسی واقعہ کو مرزا صاحب شاعرانہ انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ارے صاحب ہمارے شوقِ دیدار کو تسلی نہ ہوئی تو نہ سہی اور دوست کا دیدار بھی نہ ہوا نہ سہی مگر غم دوست کی دُم تو ابھی ہاتھ میں ہے وہ کس میں دم ہے جو ہم سے چھین لے مقصد یہ حسرت دیدار کا غم ہی کیا کم غنیمت ہے جو ہم کو وصول ہو گئی اور یہ کھٹک محبوب کے تصور اور اس کی یاد کے لئے کافی ہے یعنی ع

گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا گر نہیں شمع سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

مجنوں علیہ الرحمۃ عشق و محبت میں گھلتے گھلتے ایک ایسے بلب کی شکل اختیار فرما گئے تھے کہ جس سے سارا بیابان روشن ہو گیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ وہ عشق کی آگ کھائے ہوئے تھے لہذا اُن کی ہر سانس سے انگارے برآمد ہوتے تھے اور ان انگاروں کی روشنی نے سارے صحرا کو روشن اور منور کر دیا تھا جہاں تک لیلیٰ کا تعلق ہے وہ بہر حال بقول شخصے "شب لیلتہ القدر کی رات" تو پہلے سے تھیں عشق و محبت میں پڑنے کے بعد ان کے نینڈے کی سیاہی کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ جس خیمہ میں وہ اور جناب قیس مقیم تھے وہ بھی سیاہی سے تاریک ہو کر رہ گیا تھا اب مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ یہ جو جناب قیس نے صحرا نوردی اختیار کی اور سارے صحرا کو اپنے عشق کے شعلوں سے منور اور روشن کر دیا۔ اس سے سب سے زیادہ فائدہ صحرا میں چلنے والے مسافروں کو ہوا۔ کیونکہ قیس صاحب کی دشت نوردی سے پہلے صحرا میں ہر طرف تاریکی رہتی تھی لیکن اب پورا صحرا اُن کی وجہ سے بقعۂ نور

بن گیا۔ اگر وہ لیلیٰ کے خیمہ میں پڑے رہتے تو زیادہ سے زیادہ جس جس زمین جس پر خیمہ نصب تھا۔ اسی میں روشنی رہتی لیکن بقیہ صحرا میں تاریکی رہتی لیکن اُن کی وحشت نوردی سے صحرا کو فائدہ پہنچ گیا اور اس کی تاریکی دور ہوگئی۔

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

مرزا صاحب چونکہ ہنگامہ کے قائل تھے اور چاہتے تھے کہ ہر وقت گھر میں ایک طوفان برپا رہے خواہ وہ شادی کی تقریب کے سلسلے میں ہو یا کسی پر مار پیٹ ہو رہی ہو۔ بات یہ ہے کہ عاشق کے پیچھے ہر وقت ایک ہنگامہ اور ایک طوفان بپا رہتا ہے گھر سے نکلا اور لونڈوں نے چہار طرف سے گھیر لیا اور اُن کا جلوس نکال دیا۔ مرزا صاحب چونکہ عشق فرماتے رہے ہیں اس لئے وہ بھی دھوم دھام کے قائل ہیں ممکن ہے کہ یہ شعر ان معنوں میں ہو کہ گھر میں بہر حال کوئی نہ کوئی تقریب کی صورت ہونا چاہئے یا تو محبوب جو ہمہ گھنٹے مار پیٹ کر کے گھر کو دوزخ بنائے رہے یا پھر سیدھا سادھا نکاح پڑھوالے اور اُس صورت میں بھی گھر میں گانے بجانے کی صورت میں ایک رونق ہو سکتی ہے۔ بہر حال اصل مقصد ہنگامہ سے ہے۔

ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ستائش = تعریف۔ صلہ = معاوضہ۔ انعام ۔

مرزا صاحب چونکہ اشعار نہایت ادق قسم کے کہتے تھے اس لئے وہ معمولی لکھے پڑھے والوں کی سمجھ سے باہر تھے اسی لیے وہ لوگ کہتے تھے کہ مرزا صاحب کے سارے کے سارے اشعار مہمل ہوتے ہیں چنانچہ جہاں کہیں مشاعرہ میں مرزا صاحب اپنا کلام سناتے لوگ ہوٹنگ کرتے اس پر مرزا صاحب جھلا کر فرماتے

ہیں کہ ارے صاحب اگر اِن اشعار کے سمجھنے کی صلاحیت آپ نہیں رکھتے اور اُن کی تعریف آپ کے بس سے باہر ہے تو خدا کے لئے اِن کو سُن ہی لیجئے مگر یہ جو آپ مشاعرہ کو بھانڈوں کی محفل بنائے ہیں اور یہ کہہ کر اپنی جہالت کے ثبوت فراہم کرتے رہتے ہیں کہ یہ سارے کے سارے اشعار مہمل ہیں تو خدا کے لئے اِن کو سُن ہی لیجئے یا دوسروں کو سننے کا موقع دیجئے۔ تھوڑی دیر کے لئے میں آپ کی اس بات کو مانے لیتا ہوں کہ میرے اشعار مہمل ہیں۔

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو ؎ نہ ہوئی غالب اگر عمرِ طبعی نہ سہی

طبعی = طبعی یعنی فطری۔ انسان کا فطری طور پر معمولاً ایک خاص عمر کو پہنچنا۔

اگر آپ اپنے گھر میں بجلی کا بلب جلاتے ہیں تو یہ بھی سوچتے ہیں کہ بجلی کم سے کم خرچ ہو اور بلب بھی ایسا ہو جس میں بجلی کی مقدار کم صرف ہو یہی حال انسان کی طاقت اور قوت کا ہے اگر وہ اپنی طاقت جلدی جلدی صرف کرتا ہے تو تھوڑے ہی عرصہ میں چار کے کندھوں پر سوار ہو کر تا دکھائی پڑتا ہے اور اپنی طبعی عمر تک پہنچنے سے پہلے اُس کی زندگی کا بلب فیوز ہو جاتا ہے اور وہ ڈھلک جاتا ہے۔ مگر مرزا صاحب نے ساری زندگی اِس کی پرواہ نہ کی اور اپنی طاقت اور قوت حسینوں اور معشوقوں کی صحبت میں ضائع کرتے رہے لاکھ لاکھ لوگوں نے کہا کہ مرزا صاحب اپنی طبیعت کو روکئے ورنہ فیوز ہو جائیے گا۔ مگر مرزا صاحب نے کہا آپ سب بکتے ہیں فیوز تو بہر حال جو پیدا ہوا ہے اُسے ایک دن ہونا ہے مگر اس فیوز ہونے کا خیال کروں یا محبوب کی صحبت کے مزے کو دیکھوں۔ ہم تو محبوب کی صحبت کو زندگی سے کہیں زیادہ عزیز سمجھتے ہیں اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی انرجی ضائع کر رہے ہیں

تو اُس ازجی کے ضائع ہونے پر محمول نہ کیجئے محبوب کی قربت کے ہزاروں زندگیاں قربان کی جاسکتی ہیں۔

غزل نمبر ۴۷

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے   کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

نشاط = خوشی۔

اِس شعر کا صحیح لطف وہ لوگ حاصل کرسکتے ہیں جو بقر عید کے موقعہ پر کوئی پالو بکرا قربانی کی غرض سے پالتے ہیں چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض اوقات قربانی کا بکرا آگے آگے خوش فعلیاں اور اچک پھاند کرتا چلتا ہے اور یہ نہیں سمجھتا کہ دوسرے دن اُس کو قصائی کی چھری کے نیچے بھیں کر کے گذر جانا ہے مرزا صاحب بھی اِس شعر میں عاشقانہ انداز میں اُس بکرے کی کیفیت اور اُس کی حالت کی منظر کشی فرمارہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ سر کٹانے کا شوق اس درجہ ہے کہ مقتل کو جلاد سے آگے دوڑے جاتے ہیں اور خوشی کا یہ عالم ہے کہ سر کا سایہ پاؤں سے دو قدم آگے ہے

قضا نے تھا مجھے چاہا خراب بادۂ الفت   فقط خراب لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے

قضا = حکمِ خدا۔ وہ حکم جو روزِ اجل جملہ کائنات کے لئے لکھ دیا گیا ہے۔ ہے یعنی مشیت ایزدی۔

بعض اوقات فرشتوں کی بھول چوک سے بھی سارا کام گڑبڑ ہوجاتا ہے معمولی قلم سے اگر آپ کچھ لکھئے تو قلم چلتے چلتے خراب ہوجاتا ہے اور بقیہ عبارت لکھنے سے رہ جاتی ہے مرزا صاحب کی تقدیر کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ مشیت ایزدی

تو یہ تھی کہ شراب محبت سے سرشار رہوں لیکن روز ازل جب سرنوشت لکھی گئی تو دستِ قضا نے صرف لفظ "شراب" لکھا تھا کہ قلم رک گیا اور بادہ الفت نہ لکھا جا سکا نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا صاحب تو یہ سوچ کر پیدا ہوئے کہ چلو ڈٹ کر محبت کی شراب اڑائیں گے اور خوب کس کس کے عشق بازی میں داؤں پیچ دکھائیں گے مگر یہاں پہنچ کر پکی ہوئی ہانڈی میں لینڈی نکل آئی یعنی یہ کہ یہاں بجائے مزے کرنے کے جب ایسے مصیبتوں سے دو چار ہونا پڑا اور شراب محبت نہ ملی تو سمجھ میں نہ آیا کہ یہ جو مشیت نے احکام صادر کئے تھے اُن کا کیا ہوا؟ بعد میں جب تحقیقات کی تو معلوم ہوا احکام قرو بے میں سترہ آنے بھر ہمارے نافذ ہوئے تھے مگر مصیبت یہ آپڑی کہ نہ جانے کس سڑے ہوئے قلم کو ہماری سرنوشت لکھنے میں استعمال کیا گیا کہ قلم لفظ "خراب" لکھنے کے بعد آگے نہ چل سکا اور بقیہ عبارت لکھنے سے رہ گئی اور بقول شخصے . . . مرے سو ہم یعنی مصیبتیں ہم کو برداشت کرنا پڑیں ۔

غم زمانہ نے جھاڑی نشاط عشق کی مستی ... وگرنہ ہم بھی اُٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

جھاڑی = دور کر دی :۔ لذت الم = لذت عشق یا لذت انتظار معشوق۔

مرزا صاحب جب تک شادی کے جھمیلے میں نہیں پڑے تھے اور گھر کی ذمہ داریوں سے آزاد تھے اُس وقت تک انھوں نے خوب ہی خوب مزے کئے آج یہاں عشق لڑائے بیٹھے ہیں کل وہاں عشق کی چلم تازہ کر رہے ہیں اور حقہ بھر بھر کر پی رہے ہیں غرض خوب ہی خوب مزے کرتے رہے مگر شادی کے بعد جب بیوی کی فرمائشوں اور گھر کے روز مرہ خرچ کی ذمہ داری اُن پر پڑی تو ساری مستی اور ساری عشق بازی خاک میں مل کر رہ گئی اور وہ جو جوانی میں بڑے

بڑے عاشقانہ خطوط لکھا کرتے تھے اور ڈاک سے محبوب کے خطوں کا انتظار کیا کرتے تھے وہ سب باتیں خواب و خیال ہو کر رہ گئیں چنانچہ اب لذتِ عشق اور انتظارِ معشوق کا جو کاروبار انھوں نے جوانی میں شروع کیا تھا وہ سب ختم ہو کر رہ گیا۔

خدا کے واسطے دل کو اس جنونِ عشق کی دنیا کہ اُس کے در پہ پہنچتے ہی نامہ بر سے ہم آگے

مرزا صاحب اس شعر میں اپنی جوانی کا ذکر کر رہے ہیں جب وہ دن میں درجنوں خطوط مختلف محبوباؤں کے لکھ لکھ کر روانہ کرتے رہتے تھے اور بے چینی سے اُن کے جواب کا انتظار کرتے تھے خط لکھا اور اپنے ملازم خدا بخش کو دیا کہ ابے جا اور جا کر فلاں نمبر کے معشوق کو دے آ اور ادھر خدا بخش خط لے کر روانہ ہوا اور یہ اُس کے پیچھے پیچھے اس خیال سے نکل پڑے کہ خدا بخش جو جواب لائے گا سے چل کر راستے ہی میں پڑھ لیا جائے۔ انتظار کی زحمت کون گوارا کرے آخر ایسا ہوا کہ خدا بخش خط لے کر بعد میں پہنچا اور یہ محبوب کے دروازے پہلے پہنچ گئے یا ایسا ہوا کہ خدا بخش کے گھر پہنچتے ہی آپ بھی پیچھے پیچھے تڑپ کی لگی نے محبوب کے دروازے پہنچ گئے اور ڈیوڑھی پر کھڑے خدا بخش کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ آئے اور یہ خط کا جواب فوراً اُس کے ہاتھ سے جھپٹ کر زور زور سے پڑھنا شروع کر دیں۔ اس سے زیادہ اور کیا دیوانگی ہوگی۔

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے تمھارے آئیو اے طرہ ہائے خم بہ خم آگے

تمھارے آگے۔ تمھیں بھی ایسی پریشانیاں لاحق ہوں۔ طرہ ہائے خم بہ خم یہ زلف ہائے پیچ بہ پیچ۔

مرزا صاحب جب محبوب کے تغافل سے جھک ہو گئے تو آخر میں سب دشنام پر اتر آئے اور انھوں نے محبوب کو کوسنا شروع کر دیا محبوب تو اُن سے زندگی بھر

مخاطب نہ ہوا تھا اس لئے اب آپ نے اُس کی زلفوں کو مخاطب کرکے ملّاحیاں سنانا شروع کر دیں اور زلف سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ ارے بھائی سنتی ہو! یہ تمہاری محترمہ جو تمھیں سر پر ڈالے ڈالے پھرتی ہیں انھوں نے ہم کو اس درجہ پریشان کر رکھا ہے کہ ہم مرے سے بدتر ہیں اب تو ہم یہی دعا دیں گے کہ خدا کرے کہ اِن کی جہاں کہیں شادی ہو وہاں جھوٹے جھٹول کی نوبت آئے اور اُن کا سارا بناؤ سنگار اور زلفوں کے خم خاک میں مل جائیں اور آخر میں وہ جھنوٹلے کھولے کھولے سارے جہاں میں ماری ماری پھریں۔

غزل نمبر ۴۸

پُر ہوں شکوہ سے یوں راگ سے جیسے باجا ایک ذرا چھیڑیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

چھیڑنا = تاروں کو حرکت دینا چھیڑ خانی کرنا۔

مرزا صاحب کو محبوب نے اس قدر ستا رکھا تھا اور اُن کے دل میں شکووں کے اتنے دفتر کے دفتر چھپے ہوئے تھے کہ اگر اُن کو ذرا سا موقع مل جاتا تو یہ دہیں کھڑے ہو کر اپنا بھی کھاتا کھول دیتے جس طرح کسی گھڑی میں چابی دیدی جاتی ہے اور اندر کوک بھری ہوتی ہے اور چابی ڈھیلی ہو جانے پر جوں ٹن کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو ایک اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے مرزا صاحب کا سینہ بھی کچھ اُسی نائپ کا تھا جس میں اُن کے شکووں اور شکایتوں کی کوک بھری ہوتی تھی بس ذرا سے چھیڑ دینے کی ضرورت ہوتی تھی اور مرزا صاحب اپنا سلسلہ شروع کر دیتے تھے جس سے سننے والے کانوں میں انگلیاں دے لیتے۔

گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو شکوۂ جور سے سرگرم جفا ہوتا ہے

حسن تلافی = اچھی پاداش یا نیک صلہ :-

اس شعر میں حسن تلافی کے دو مفہوم ہیں ایک تو طنز دوسرے طرب۔ آپ نے اکثر بچوں کو گھر میں کسی شرارت پر پٹتے دیکھا ہوگا اگر وہ خاموشی سے مار کھالیتے ہیں تو پیٹنے والا دو چار ہاتھ مار کر چھوڑ دیتا البتہ اگر ٹرّاتا رہتا ہے یا بڑبڑاتا رہتا ہے تو پیٹنے والے کو اور زیادہ غصّہ آتا ہے اور وہ دوگنی مار مارتا ہے مرزا صاحب اس شعر میں اسی کی منظر کشی فرما رہے ہیں مرزا صاحب کا عاشق معشوق کے ہاتھ سے اس وجہ سے چار چوٹ کی مار کھا رہا ہے کہ عاشق صاحب جگہ جگہ اُس کی شکایت کرتے پھرتے ہیں کہ وہ بدمزاج ہے اور حد درجہ جور و تشدد کرتا ہے مرزا صاحب کہتے ہیں کہ عاشق حقیقتاً معشوق کو حرکا دینے کے لئے یہ ساری شکائیتیں کرتا ہے اور اُس کا اِن شکایتوں سے یہ ہوتا ہے کہ محبوب اُس پر اور زیادہ جور و تشدد کرے اور عاشق چونکہ معشوق کے ہاتھ کی مار سے مزے لیتا ہے اس لئے وہ شکائیتیں کیا کرتا ہے بلکہ اس میں اُس کا ایک قسم کا حسنِ طلب ہوتا ہے اصل میں مرزا صاحب کہتے ہیں کہ چونکہ عاشق کو ظلم میں لطف آتا ہے اِس لئے معشوق کی مار اس کے حق میں حسن تلافی کی حیثیت رکھتی ہے۔

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوک بے داد کہ ہم آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

ہدف = نشانہ :- ناوک بے داد = تیرِ ستم۔

بعض لوگ بلا سبب مار کو دعوت دیتے ہیں اور اُن میں عشاق کا طبقہ تو گویا یہی کام ہی کرتا ہے کہ ہر وقت معشوق کے سامنے آکر مطالبہ

کرتا ہے کہ آ بیل تو مجھے مار، چنانچہ مرزا صاحب بھی اپنے عاشق کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا بتائیں صاحب وہ ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ کو اچھی بھلی غذا بنائے ہے۔ جس روز ڈانٹا ڈپٹا نہیں جاتا اُس روز گویا اُس کا کھانا ہی ہضم نہیں ہوتا اور جب محبوب اُس کی طرف مخاطب نہیں ہوتا اور اُس کو اُس کی طرف خون بھری نظروں سے نہیں دیکھتا تو وہ خود اُس کے اسباب فراہم کرتا ہے۔ تاکہ وہ اُسے خون بھری نظروں سے دیکھے اور اُس کے عشق کے دام وصول ہو جائیں مقصد یہ ہے کہ اُس کے جور و تشدد اور عتاب میں بھی لطف آتا ہے۔

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

مرزا صاحب نے جب تک محبت کا لنگوٹ نہیں اُتارا تھا اس وقت تک ان کے کس بل دیکھنے والے تھے۔ اُن کے نالوں میں اتنی زیادہ بار دو بھری تھی کہ جب وہ محبوب کی یاد میں اُن کو سر کرتے تھے تو وہ عرش کو پار کر کے نکل جاتے تھے مگر جب مرزا صاحب کے قویٰ مضمحل ہو گئے، تو اُن کی آہیں اور نالے بھی کمزور ہو گئے ... ہوائیوں کی طرح ہو کر رہ گئے یعنی یا تو اُن کے نالوں میں اتنا دم باقی نہ رہا کہ وہ سینہ میں کروٹ لیتے اور اگر کوئی آہ بڑی مشکل سے سینہ سے چلی بھی تو لب کی چوکھٹ تک آتے آتے دم توڑ دیتی تھی ورنہ ایک زمانہ میں مرزا صاحب کی آہیں اور نالے دلی میں حلیم شریف سے زیادہ مشہور تھے۔

رکھیو غالبؔ مجھے اس درد نوائی میں معاف   آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

درد نوائی = شیریں بیانی کی ضد۔ سوا = زیادہ

ایک مولوی صاحب کا یہ دستور تھا کہ جب وہ اپنی گھر والی سے لڑ کر آتے تو اُن کا غصہ لڑکوں پر اتارا کرتے اور ان کی جا اور بیجا پٹائی شروع کر دیتے گویا جب دھوبی سے نہ جیت پاتے تو گدھے غریب کے کان اینٹھتے۔

انگریزی کے مشہور شاعر گولڈ اسمتھ نے ایک دیہاتی اسکول ماسٹر کا نقشہ بھی اپنی ایک نظم میں کچھ اسی طرح کھینچا ہے کہ آج تک جب اسکول کے طلباء اسکول جاتے ہیں تو اُس نظم کو اپنے پیش نظر رکھ کر اپنے درجہ کے ماسٹر کے چہرہ کا اُتار چڑھاؤ دیکھتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اُس نے اس نظم میں یہ دکھایا ہے کہ اسکول ماسٹر اگرچہ آدمی اتنا زیادہ برا نہیں ہے لیکن جب اُس کا موڈ خراب ہے تو طلباء کی بات بات پر بے پناہ پٹائی کرتا ہے۔ مرزا صاحب یوں تو نہایت زندہ دل واقع ہوئے تھے مگر اس شعر سے پتہ چلتا ہے کہ بعض اوقات جب کسی بات پر وہ بھی گھر والی سے لڑے ہوتے تو اُن کے بیان میں تلخی پیدا ہو جاتی تھی۔ مثلاً اُن کی محبوبہ یعنی ڈومنی اگر حقہ تازہ کرنے آئی ہے اور اُس نے پوچھا کہ مرزا صاحب تمباکو کہاں رکھی ہے تو یہ تلخی سے جھڑک کر بولتے کہ "تمباکو میرے سر پر رکھی ہے" یا کسی نے پوچھا کہ مرزا صاحب شراب حاضر کر دوں مرزا صاحب آپے سے باہر ہو کر بولتے کہ زہر نہ پلا دیجئے جو کل کا مرتا آج ہی مر جاؤں" آپ تو چاہتے ہی ہیں کہ کسی طرح میں جان سے گذر جاؤں تو آپ کو آمدورفت میں جو زحمتیں ہوتی ہیں ختم ہو جائیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت مرزا صاحب

دردِ عشق میں مبتلا تھے تو کسی نے شاید اُن سے پوچھ لیا کہ کہیئے مرزا صاحب
کیا تکلیف ہے؟ اتنا پوچھنا تھا کہ مرزا صاحب آپے سے گذر کر بولے کہ "اجی
درد ورد خاک نہیں ہو رہا ہے میں بن رہا ہوں نکل جائیے یہاں سے اور
آئندہ سے اِس قسم کے خرافات سوال مت کیجیئے گا" اُس کے بعد جب درد
کم ہو گیا اور وہی صاحب مرزا صاحب کے پاس تشریف لائے تو مرزا
صاحب نے اُن سے معافی مانگنا شروع کی کہ حضت معاف کیجیئے گا اُس وقت
جو میرے کلام میں گستاخی اور تلخی پیدا ہو گئی تو وہ اُس وجہ سے تھی کہ مجھے درد
کی وجہ سے اس درجہ تکلیف تھی کہ میں آپ کی بات کا مقصد نہیں سمجھا اور میرے
منہ سے اُول فول نکل گیا ورنہ یقین مانئے کہ میں فطرتاً تلخ نوا نہیں ہوں
اور آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔

غزل نمبر ۴۹

ہر ایک بات پہ کہتے ہو کہ تو کیا ہے　　　تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

مرزا صاحب کا محبوب ہر وقت آستین چڑھائے رہتا تھا اور مرزا
صاحب سے تُو تکار اور جھلا کر سخت اور درشت لہجے میں بات کرتا تھا مثلاً
تیری حقیقت کیا ہے پھر اگر ایک وقت وہ ایسا کہتا تو کوئی بات نہیں تھی مگر
مگر اُس نے مستقل طور پر مرزا صاحب سے تو تکار شروع کر دی تھی اِس
پر مرزا صاحب جو بہر حال ترک النسل تھے اور جن کی رگوں میں مغل خون
دوڑ رہا تھا۔ ناراض ہو کر بولے "کہ یہ کیا آپ نے پنجابی لہجہ اختیار کر رکھا
ہے کہ ہمیشہ" تو کیا ہے؟ تیری حقیقت کیا ہے؟ تو کیا کر سکتا ہے؟ تو
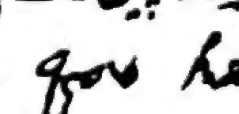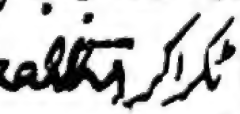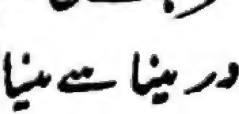
کیا بنا سکتا ہے؟ میں تو آپ اور جناب سے بات کرتا ہوں مگر آپ ہیں کہ تہذیب اور شائستگی کا دامن چھوڑ کر تو تکار کیا کرتے ہیں دوسری صورت یہ بھی ممکن ہے کہ مرزا صاحب نے ممکن ہے کسی پاکستانی خاتون سے عشق کر رکھا ہو جس کے یہاں "تو" کا لفظ محبت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور دلی والوں میں لفظ "تو" معیوب سمجھا جاتا ہے لہذا مرزا صاحب اس شعر کے ذریعے اس کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ اُن کا محبوب پنجاب کا رہنے والا تھا۔

نہ شعلہ میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا ۔۔۔ کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تندخو کیا ہے

اس شعر کا تعلق بھی پہلے شعر سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ محبوب کا مستقبل لب و لہجہ تو تکار تھا نہ کچھ تو مرزا صاحب کے بڑھاپے کی جھک سے تنگ آکر تو تکار پر اُتر آیا تھا اور کچھ اپنے شترِ غمزے ظاہر کرنے کے لئے مرزا صاحب سے بے رُخی سے پیش آتا تھا اس لئے مرزا صاحب اس شعر میں حاضرین سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ صاحب اس عورت نے تو ہم کو کُند چھری سے ذبح کر رکھا ہے اور اس کے لہجہ میں تندی اور تیزی ہے جو نہ تو شعلے میں نظر آتی ہے اور نہ برق میں ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر کہیں تو کیا کہیں ہم ہی ہیں جو اس بدمزاج اور بدتہذیب سے نباہ کر رہے ہیں اگر کوئی دوسرا ہماری جگہ ہوتا تو اسے گھاس نہ ڈالتا۔

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے ۔۔۔ وگرنہ خوفِ بدآموزیٔ عدو کیا ہے

بدآموزی = بہکانا یا سکھانا۔ بجھانا۔

مرزا صاحب کا رقیب جب اُن کے سامنے آجاتا ہے تو مرزا صاحب جل بھنکر کباب ہو جاتے ہیں اور اُن کی آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے ۔ خون اُتر آنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جب مرزا صاحب آتے دکھائی دیتے ہیں تو وہ چھیڑ چھیڑ کر محبوب سے باتیں کرتا ہے اور ایسی باتیں کرتا ہے کہ مرزا صاحب اور زیادہ گرم ہو جاتے ہیں مثلاً اُس نے مرزا صاحب کو آتے دیکھا اور کہا کہ "ارے بھئی آپ سے ملئے آپ ہیں مرزا صاحب آپ کے عاشق صادق جو دن میں سولہ سترہ بار آپ پر جان قربان فرماتے رہتے ہیں مگر مرنے کا نام نہیں لیتے اس کے بعد ان سے بے تکلفی جتانے کے لئے کبھی اُن کو گدگدا دیتا ہے اور کبھی اُن کے چٹکی لے لیتا ہے۔ مرزا صاحب اُس کی اِن حرکتوں کو دیکھ دیکھ کر خون کے گھونٹ پیتے رہتے ہیں اِس پر محبوب اُن سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے ۔ مرزا صاحب آپ اس غلط فہمی میں ہیں کہ رقیب آپ کے پیچھے آپ کی چغلی کھاتا ہے اور جھوٹی سچی باتیں مجھ سے لگایا کرتا ہے یقین مانئے ایسا نہیں ہے اِس پر مرزا صاحب اُس پر چوٹ فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نہیں صاحب ایسی کوئی بات نہیں کیونکہ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ آپ جب مجھ جیسے سچے عاشق کی بات کا بھروسہ نہیں کرتے تو اُس لپاڑئیے اور جھوٹے کی بات کا کیا یقین کریں گے البتہ میری آنکھوں میں خون اُس وقت اُتر آتا ہے جب میں اُس کو آپ سے چہلیں کرتے دیکھتا ہوں

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

مرزا صاحب کا عاشق محبوب کے کوچے سے اتنی چار چوٹ کی مار کھا کر آیا ہے کہ اُس کا جسم لہولہان ہے اور پیٹ میں سانس نہیں سما رہی ہے

لہو بہنے کے سبب اس کا کرتہ اُس کے پنڈے سے چپک گیا ہے۔ پٹنے سے پہلے وہ جن محترمہ کے ہاتھ سے پٹا ہے اُن ہی کی محبت میں اپنا گریبان چاک کر چکا ہے اور جنون اور وحشت کے عالم میں اُس نے اپنا سارا کرتہ چونی چونی کر ڈالا ہے جس کے لئے مرزا صاحب کو فکر ہے کہ رفو گر کو بلا کے ٹھیک کروا دیا جائے۔ مگر اب جب یہ پٹ پٹا کر مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو مرزا صاحب نے دیکھ کر کہا کہ چلو اس پٹائی سے کم از کم یہ فائدہ تو ہوا کہ رفو گر کو بلا سبب رفو کرنے کی ضرورت باقی نہ رہی اور رفو کے دام بچ رہے کیونکہ کرتہ پنڈے میں چپکا ہوا ہے لہذا پھٹے پرانے کا سوال ہی باقی نہ رہا۔

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز   سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے

بادۂ گلفام = سرخ رنگ کی شراب۔

مرزا صاحب اس شعر میں فرماتے ہیں کہ صاحب مولویوں کو جنت اس وجہ سے عزیز ہوتی ہے کہ وہاں خوبصورت حوریں اور غلمان ہوں گے کھانے کو بہترین غذائیں ہوں گی دونوں وقت ناشتہ میں انڈے پراٹھے حلوے اور اعلیٰ درجے کے ڈال کے ٹوٹے پھل ہوں گے مگر ہمارا معاملہ ان مولوی صاحبان سے بالکل مختلف ہے کیونکہ ہم تو بادۂ گلفام کے شیدائیوں میں ہیں ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ جنت میں جب جائیں گے تو ہم کو مہکتی ہوئی سرخ شراب ملے گی۔ دوست احباب گرد و پیش ڈٹے ہوں گے ساغر سے ساغر اور مینا سے مینا ٹکرا کر Good health کہکر پئیں گے اور سچ پوچھئے تو ہم کو اگر جنت عزیز ہے تو محض اسی وجہ سے ورنہ ہم کو حور د

وغلمان سے کیا واسطہ ایک نہیں دس حوریں فی کس تقسیم ہوں ہم سے کیا۔ ہم حرف شکایت زبان پر لانے والوں میں نہیں۔

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لو ... دو چار پہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

خم = بڑا مٹکا = قدح = بڑا پیالہ۔ سبو۔ ٹھلیا۔

متھرا میں ایک طبقہ چوبوں کا ہوتا ہے جو اس درجہ خوش خوراک اور پیٹو ہوتے ہیں کہ دو ڈھائی میل کی دوری سے اُن کا پیٹ باادب باملاحظہ ہوشیار کے نعرے لگاتا دکھائی پڑتا ہے پھر اُن کے پیٹوں میں جو معدہ فٹ ہوتا ہے وہ بھی ایسا لچک دار اور ٹوٹ کا ہوتا ہے کہ کھانا دیکھتے ہی معدہ فن فن کرنے لگتا ہے اور بیس بیس پچیس پچیس سیر رابڑی اور لڈو محض منھ کا ذائقہ بدلنے کے لئے آن واحد میں کھا کر رکھ دیتے ہیں۔ مرزا صاحب کی شراب نوشی کی ہوس بھی کچھ انھیں چوبوں جیسی تھی چنانچہ مرزا صاحب خود فرماتے ہیں کہ ہم اس پائے کے بلا نوش ہیں کہ ہماری پیاس تھوڑی سی شراب سے نہیں بجھتی شیشہ و قدح و کوزہ تو ہمارے لئے کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتے ہاں اگر دو چار یا دس بیس مٹکے شراب ہو تو بہر حال معمولی طریقہ پر ہم آدھا پیٹ پی کر گذر بسر کر سکتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کے یہاں بھی پیٹ میں فرشتوں کی فروگذاشت سے ایسا ہی معدہ فٹ ہو گیا تھا اور اِن کا معدہ کسی دوسرے صاحب کے لگ گیا تھا اِسی لئے مرزا صاحب معمولی قدح کو دھیان میں نہیں لاتے۔

غزل نمبر ۵۵

میں انھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں   چل نکلتے جو مے پیے ہوتے

چل نکلنا : حد سے بڑھنا یعنی گستاخ ہونا۔ یا چل پڑنا چل کھڑا ہونا۔

جوانی میں مرزا صاحب چونکہ آدمی بذلہ سنج اور شوخ مزاج واقع ہوئے تھے لہذا چلتے آدمی کو چھیڑتے تھے وہ محبوب کی نوک پلک کو بھی خوب سمجھے ہوئے تھے۔ معشوق کا کام آپ جانتے ہیں کہ عشاق پر تشدد کرنا اور ہر وقت ان کو صلواتیں سنانا ہوتا ہے۔ جس سے عشاق کو دن میں تارے نظر آجاتے ہیں مگر ایک دن نہ جانے محبوب کس دھن میں تھا کہ مرزا صاحب نے اُس کے چٹکی بگوٹے لینا شروع کئے مگر وہ خاموش رہا اس پر مرزا صاحب کو حیرت ہوئی کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ کچھ نہیں تو ہاتھ ہی جھٹک دیتیں مگر وہ خاموش بگوٹے لواتی رہیں۔ چنانچہ جب مرزا صاحب گھر پہنچے تو سوچے کہ معلوم نہیں آج انھوں نے کونسی جاتی دنیا دیکھی جو خاموش رہیں ورنہ اتنا چھیڑ دینے پر وہ پورا محلہ سر پر نہ اٹھا لیتیں تو کم تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شراب میں دھت تھیں ورنہ اگر وہ چل نکلتیں یعنی دو چار ہاتھ چھوڑ دیتیں تو ان کا کوئی کیا بگاڑ لیتا۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا   دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

مرزا صاحب کا ڈھانچہ جب ازل میں تیار ہوا اور انھیں قم باذن اللہ کہہ کر کھڑا کیا گیا تو آپ کئی ویگن غم لے کر وہاں سے چلتے ہوئے مگر اس عجلت میں انھیں اس کا خیال نہ رہا کہ وہ اس غم کو رکھنے کے لئے کوئی بڑا برتن یا دس پانچ دل

مانگ لیں نتیجہ یہ ہوا کہ جب خالی ہاتھ گھر پہنچے تو کہتے ہیں ارے صاحب جب غم اتنی مقدار میں دیا گیا تھا تو اُسے رکھنے کے لئے دو چار دل یا کوئی بڑا برتن بھی دیا گیا ہوتا اب بتایئے کہ اتنا بہت سا غم ہم کہاں رکھتے پھریں؟

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو　　　کاش کہ تم میرے لئے ہوتے

یہ شعر مرزا صاحب نے اپنے نکاح سے قبل کہا تھا جب وہ عشق و محبت کی زندگی بسر کر رہے تھے اور انھوں نے ایک حد درجہ بد مزاج لڑکی سے عشق فرمایا تھا چنانچہ فرماتے ہیں کہ یہ ضرور ہے کہ تم بے حد بد مزاج ہو اور جن کے ساتھ بھی تمھارا نکاح ہوگا اُس کی زندگی تلخ کردو گی مگر میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں ۔ اس کے یہ تم کو قہر و بلا سمجھنے کے باوجود چاہتا ہوں کہ کاش تمھارے ماں باپ مجھ سے تمھارا نکاح پڑھوانے پر تیار ہو جاتے اور تمھیں میرے لئے مخصوص کر دیتے ۔ ... میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ میری موجودگی میں تمھارے جور و تشدد کوئی دوسرا برداشت کرے ۔ مرزا صاحب کا کہنا ہے کہ میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں مگر رشک ہرگز برداشت نہیں کر سکتا ۔

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ　　　کوئی دن اور بھی جئے ہوتے

راہ پر آجاتا یہ ٹھیک ہو جاتا یعنی ہماری حسب مرضی ہو جاتا ۔

ایک صاحب کی بازار میں ایک چونی جیب سے گر گئی اُنھوں نے اُسے تلاش کرنا شروع کیا ایک صاحب نے جب اُن کو چونی تلاش کرتے دیکھا تو ایک دوسری چونی جیب سے نکال کر پیش کرتے ہوئے کہا کہ لیجیے اب وہ چونی اندھیرے میں کیا ملے گی مگر وہ صاحب گھر پر جا کر سوچنے لگے کہ

اگر کچھ دیر اور تلاش کرتے رہتے تو شاید وہ بھی مل جاتی یہی حال اِس شعر میں مرزا صاحب کا ہے فرماتے ہیں کہ کیا عرض کریں کہ ہم نے مرنے میں ذرا عجلت سے کام لیا اور اُن کے انتظار میں گھبرا کر جلدی جان دیدی ورنہ اگر کچھ عرصہ اور زندہ رہتے تو یقین کامل تھا کہ وہ ضرور تشریف لے آتیں۔

مرزا صاحب کی خوش فہمی ملاحظہ ہو کہ جب تک آپ زندہ رہے اُس وقت تک تو اس نے آپ پر نگاہ تک نہ ڈالی اور اب جب مایوس ہو کر مر گئے تو مرنے کے بعد قبر میں لیٹے یہ سوچ رہے ہیں کہ یار مرنے میں قدرے عجلت کی وہ آئے گی اور ضرور آئے گی۔ گویا ایک تو اُن کے نہ آنے کا غم تھا ہی دوسرا غم اِس کا کہ مرنے میں جلدی ہو گئی غرض دُہرے غم ساتھ لئے مرزا صاحب دنیا سے سدھارے

غزل نمبر ۵۱

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے　　ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

ہندو اور مسلمان تہواروں کے موقعوں پر سبیلیں لگا کرتی ہیں اور ان سبیلوں میں گڑ اور شکر کا شربت تقسیم ہوتا ہے۔ مرزا صاحب اپنے محبوب کے یہاں کی ایک سبیل کا ذکر اس شعر میں کر رہے ہیں۔ جہاں ہر بدھو نتھو کلو کو شراب پینے کی دعوت دی گئی ہے اور سب پہنچے ہوئے ہیں اور ڈٹ ڈٹ کر جام پر جام چڑھا رہے ہیں اور نشے میں چور ہو ہو کر رندہ پیش موریوں کو نواز رہے ہیں۔ جب یہ محفل ختم ہوئی اور مرزا صاحب نے ہر طرف موریوں اور سڑکوں پر شرابیوں کو پڑے دیکھا تو معلوم ہوا کہ آج اُن کے محبوب کے ہاں شراب پلانے کی کوئی تقریب تھی۔ مرزا صاحب کو اس پر جس قدر افسوس نہ ہو تا کم تھا۔ چنانچہ اس شعر میں

محبوب سے اسی کی شکایت کر رہے ہیں کہ صاحب رقیب ناہنجار کو تو ساغر پہ ساغر چڑھانے کو ملیں اور پھر ایرے غیرے کو بلایا جائے مگر ہم کو اطلاع تک نہ ہو اور ہم معمولی دعوت نامہ تک کو ترس جائیں

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

مطلب: لفافے کے اندر کا مضمون۔

جب مرزا صاحب کو ان کے محبوب نے بیحد تنگ کیا تو وہ بازار سے سادہ لفافوں کے کئی درجن پیکٹ خرید لائے اور محبوب کو محض پریشان کرنے کے لئے تابڑ توڑ اور مسلسل خط لکھنا شروع کر دیئے۔ کرتے یہ تھے کہ لفافے پر محبوب کا نام گلی اور مکان کا نمبر لکھا اور ڈاک میں ڈلوا دیا اور اندر ایک سطر بھی لکھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر لفافے پر محبوب کو چار چار چھ چھ آنے جرمانے کے ڈاک خانہ والوں کو دینا پڑے۔ اس طرح جب ان کا محبوب جھک ہو گیا تو اس نے مرزا صاحب سے کہا کہ جناب یہ آپ کی کونسی حرکت تھی۔ اس پر مرزا صاحب نے کہا کہ ارے صاحب ہمیں تو آپ کی محبت میں اس کا ہوش ہی نہیں رہتا کہ ہم نے لفافے میں کوئی مضمون لکھ کر رکھا ہے یا نہیں۔ ہمارا کام تو اب صرف آپ کے نام کی ضربیں لگانا اور لفافوں پر آپ کا نام لکھ لکھ کر روانہ کرنا رہ گیا ہے۔ اور وہ اس وجہ سے کہ ہم کو مضمون وضمون سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہم تو آپ کے نام کے عاشق ہیں۔ لفافے پر آپ کا نام لکھا اور پیسے وصول ہو گئے۔

مات پی زمزم پہ مے اور صبحدم دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

احرام باندھے ہوئے مرزا صاحب حج کو روانہ ہوئے۔ احرام باندھنے

کے بعد کسی گناہ کا ارتکاب ظاہر ہے بری بات ہے اور پھر زمزم جیسے مقدس
چشمہ کے پاس بیٹھکر شراب پینا تو اور بھی سخت گناہ ہے اُس سے بھدی حرکت
یہ کہ احرام کا شراب کے دھبوں سے نجس ہونا اور اُن دھبوں کو آبِ زمزم سے
دھونا ۔ بات یہ ہے کہ مرزا صاحب کو اپنی شراب نوشی کے سلسلے میں اچھائی برائی
کا ہوش نہ تھا اور نہ انھیں اس کی پرواہ تھی کہ شراب کہاں پینا چاہیئے اور
کہاں نہ پینا چاہیئے چنانچہ جب یہ خانہ کعبہ تشریف لے گئے تو وہاں چشمۂ زمزم کو دیکھکر
ان کے منہ میں پانی بھر آیا اور چونکہ یہ ایک بوتل چھپا کر لیتے گئے تھے اس لئے انھوں
نے جامہ احرام پہنے پہنے جو گھبرا کر پک پر پک چڑھانا شروع کئے تو بہت سی
شراب اس پر گر گئی ۔ سوچے اب کیا کیا جائے ۔ چنانچہ حکومت عربیہ کے خوف
سے آپ نے اُسی چشمہ پر بیٹھکر چھوُیا چھو شروع کر دی ۔ وہ تو کہئے کہ خیریت گذری
جو ابن سعود کا زمانہ نہ تھا ورنہ شاید مرزا صاحب ہندوستان پلٹ کر آ بھی
نہ پاتے تھے ۔ مگر مرزا صاحب کی جرأت ملاحظہ ہو کہ آپ نے شراب بھی پی ،
کپڑے بھی دھوئے اور اُنھیں کپڑوں کو پہنے پہنے ہندوستان واپس بھی آگئے ۔

عشق نے غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

مرزا صاحب کی صورت عشق نہ محبت نے بگاڑ دی تھی اور ان کو اس
درجہ نکما اور کاہل بنا دیا تھا کہ یا تو محبوب کے خیال میں بستر ہی پر پڑے
کروٹیں بدلتے رہتے تھے یا اُس کے کوچہ میں اُس کی چوکھٹ پر بیٹھے حقہ
پیا کرتے تھے ۔ حالانکہ عشق بازی سے پہلے ساری دنیا کے کام انجام دیتے
تھے یعنی گھر کا سودا سلف لانا ۔ بیوی کی فرمائشیں پوری کرنا اور گھر میں صفائی

ستھرائی وغیرہ غرض سویرے سے شام تک سیکڑوں کام کیا کرتے تھے مگر جب عشق بازی میں مبتلا ہوئے تو ساری توانائی ختم کرنے کے بعد آخر میں ان کا کام صرف محبوب کے فراق میں آہیں بھرنا اور رقیب کو صلوٰتیں سنانا رہ گیا۔

غزل نمبر ۵۲

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر   بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے یہ شعر نشہ کے عالم میں فرما دیا ہے کیونکہ ہر نشیلی چیز پینے والے کو نشہ کے عالم میں وہی چیز نظر آتی ہے مثلاً افیونی اگر خواب دیکھتا ہے تو خواب میں بھی اُسے پوستے کے کھیت ہی نظر آتے ہیں اور اُسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کائنات عالم نے افیون کھا رکھی ہے اور زمین و آسمان شجر و حجر خشکی اور سمندر غرض ساری فضا افیون کھائے نشہ میں سرشار ہے۔ چنانچہ مرزا صاحب کو بھی نشہ کے عالم میں ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے ہوا میں شراب کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور وہ ہوا کیا کھا رہے ہیں، شراب پی رہے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ شراب پینے کے بعد شرابی کے ہوش و حواس ہوا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ مرزا صاحب پر بھی یہ کیفیت طاری ہے۔

غزل نمبر ۵۳

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے   بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

مرزا صاحب جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ شراب نوشی کی اصطلاحات میں

کہتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اگر آپ کسی شراب خانہ میں جائیں اور وہاں تمام بوتلوں، صراحیوں اور قدحوں میں شراب بھری دیکھیں تو اس کے معنی آپ یہی سمجھیں گے کہ شراب خانہ پر دن بھر تکٹینگ رہی ہے اور کسی شرابی کو اندر جانے نہیں دیا گیا اسی وجہ سے شراب خانہ شراب پینے والے ظروف سے آباد ہے۔ مرزا صاحب اس سلسلے میں فرماتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام دولت مند طبقے کے لوگ دنیا سے انتقال فرما گئے ہیں کیونکہ پیٹ بھرے دنیا کی طرف التفات نہیں کرتے اور وہ اس کی طرف پیٹھ کر کے اللہ ہو، اللہ ہو، میں مبتلا ہو جاتے ہیں مگر یہاں آبادی کا یہ عالم ہے کہ ہر گلی کوچے میں ایک ایک عورت خدا جھوٹ نہ بلائے دس دس بارہ بارہ بچے پیدا کئے بیٹھی ہے جس سے دنیا میں تل رکھنے کی جگہ نہیں ہے اس سے پتہ چلا کہ دنیا پر جامع مسجد کے فقیروں کی حکمرانی ہے اور ان سب نے اہلِ ہمت کو مار بھگایا ہے۔

غزل نمبر ۱۲۵

کب وہ سنتا ہے کہانی میری　　　اور پھر وہ بھی زبانی میری

اس شعر میں مرزا صاحب نے اپنی محبوب کے تنفر کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ صاحب اُن کا عالم تو یہ ہے کہ اگر کوئی ان کے سامنے بھولے سے میرا نام لے لیتا ہے تو یا تو وہ اُس سے گھنٹوں اٹھا بیٹھی کراتی ہیں یا یہ کہ کر اُسے مرغا بناتی ہیں کہ صاحب آپ نے مرزا صاحب کا نام لینے کی جرأت کیسے کی جبکہ آپ کو معلوم ہے کہ اُن کا نام آتے ہی ہم جھاڑو پنجہ لے کر دوڑ کے

ہیں اور بالکل پاگل ہو جاتے ہیں۔ مرزا صاحب کی داستان محبت غالبًا کوئی ایسی داستان تھی جو اگر کئی جلدوں میں بھی شائع کی جاتی تو شاید پوری نہ ہوتی۔ اسی لئے مرزا صاحب کے محبوب نے کبھی مرزا صاحب کی داستان محبت غیروں کی زبان سے سننا بھی گوارہ نہ کیا یہ واقعہ ہے کہ جب مرزا صاحب نے ساری دنیا کے کام چھوڑ کر صرف عشق و محبت میں اپنا وقت صرف کرنا شروع کیا تھا تو ظاہر ہے کہ اگر وہ محض اپنے شکوہ و شکایت کے عنوانات ہی بیان کرنا شروع کر دیتے تو سننے والے بھاگ جاتے نہ کہ پوری مسلم داستان جس کے سننے کے لئے عمر نوح اور عمر خضر کی ضرورت ہے۔ اسی لئے مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ جب غیر مختصر طریقہ پر میری داستان بیان کرتا ہے تب تو وہ اُس کا سننا پسند نہیں کرتے چہ جائیکہ وہ میری زبان سے تفصیلی داستان سنیں، یہ کیسے ممکن ہے۔

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار　　مگر آشفتہ بیانی میری

مرزا صاحب کو اس کا پورا احساس تھا کہ گھر والے اُن سے سخت بیزار ہیں کیونکہ اُنھوں نے گھر کی کوئی ذمہ داری کبھی محسوس ہی نہیں کی رہے دوست احباب سو وہ مجھ کو کیا یاد کر کے روئیں گے کیونکہ سیکڑوں کا قرضہ اُن سب کا میرے ذمہ ہے اور اُن کی زندگیاں میں نے قرض لے کر اس درجہ تلخ کر رکھی تھی کہ اب وہ میری خوبی تو بیان کرنے سے رہے ہاں البتہ یا تو اپنے قرضہ کو روئیں گے یا پھر یہ کہہ کر روئیں گے کہ ہائے کس مفلسی کی حالت میں اور کس ناداری کے عالم میں مرزا صاحب دنیا سے

سدھارے ہیں کہ ہزاروں کا قرضہ لادے لئے چلے گئے اور اب کون ان کا قرضہ پاٹتا پھرے گا۔

دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا کھل گئی ہیچمدانی میری

معشوق کے دہن کو کبھی ہیچ کہتے ہیں اور اس کو نہ پانے والا ہیچمدان ہے۔ ہیچمدان کے دوسرے معنی کم علم اور جاہل کے بھی ہوتے ہیں۔ مرزا صاحب نے عام معشوقوں کی طرح اپنے معشوق کے بارے میں بھی سوچ رکھا تھا کہ ان کے بھی دہن نہ ہوگا مگر پھر خیال آیا کہ یار ٹٹول کر دیکھ لو۔ کیا عجب ہے جو عام معشوقوں پر افضلیت پیدا کرنے کی غرض سے فرشتوں نے ان کے کوئی بھا کھیجا دہن لگا دیا ہو۔ چنانچہ انھوں نے محبوب کے چہرے پر خوب ٹٹول کر دیکھا مگر معلوم ہوا کہ حسب دستور قدیم یہ بھی بے دہن کے پیدا ہوتی ہیں مگر مرزا صاحب کو سوچنا چاہئے تھا کہ دہن نہ ہونے کی شکل میں یہ جو ان پر نناوے میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گالیاں برسانی ہیں وہ سب کہاں سے آتی ہیں مگر ان کی آنکھوں پر عشق کے ایسے موٹے پردے پڑے ہوئے تھے کہ ان کو معشوق کا دہن نظر نہ آتا تھا اسی لئے فرماتے ہیں کہ آخر میں لوگ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مرزا صاحب بھی اس معاملہ میں عام انسانوں کی طرح جاہل ہیں

غزل نمبر ۵۵

نقش ناز بت طناز بآغوش رقیب پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

نقش = تصویر۔ طناز = شوخ طراز۔ مانی = ایک مشہور رومی نقاش کا نام ہے جو جھوٹی نبوت کا دعویٰ کرتا تھا اور نقاشی اپنا معجزہ قرار دے کر لوگوں کو بہکاتا تھا ارژنگ اس کی تصنیف ہے۔

مرزا صاحب کا محبوب یوں ہی کیا کم حسین تھا اُس پر نازکی کا یہ عالم کہ ہوا کے جھونکے سے اُسے غش آتا تھا دوسری طرف اُن کے جو رقیب صاحب تھے ان کی بدشکلی کا یہ عالم کہ ایک آنکھ میں پھلی، دوسری آنکھ غائب، داہنے کان کے نیچے بتوڑی، چہرہ پر چیچک کی خندقیں اور اُس پہ تارکول جیسا سیاہ چمکدار رنگ۔ ایک ٹانگ سے معذور، ایک ہاتھ غائب۔ غرض ایک طرف تو مرزا صاحب کے محبوب کا حسین تھا جو دلّی کے لال قلعہ میں بھی نہیں سما سکتا تھا۔ اور دوسری طرف رقیب کی بدصورتی دونوں چیزیں اجتماع ضدین کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اب مرزا صاحب کی سنئے کہ ایک روز مرزا صاحب نے اپنے رقیب کو کسی گلی میں بھینچ بھینچ کر محبوب کو لپٹاتے دیکھ لیا۔ اس منظر کو دیکھکر ان کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ لہٰذا اپنے رقیب کی مذمت اور محبوبہ کی تعریف میں مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ معشوق کا حسن، اس کی نزاکت، اُس کے نشتر غمزے اس کے متقاضی ہیں کہ مانی جیسا نقاش ہو تب کہیں ان کی تصویر بن سکتی ہے۔ البتہ رقیب کا حلیہ اور کارٹون تو صرف اُسی صورت میں بن سکتا ہے کہ سب سے پہلے موروں کے پیر کاٹے جائیں جو اُس کی   مقابلہ میں حد درجہ بدصورت ہوتے ہیں پھر اُن کا قلم بنایا جائے اور اس کے بعد مانی سے کہا جائے کہ ہاں بھیّا بناؤ رقیب کی شکل گویا رقیب کی بدصورتی کی مناسبت سے قلم بھی ہونا چاہئے مرزا صاحب نے رقیب کی گود میں اپنے محبوب کو اس طرح ہم آغوش ہوتے دیکھا ہے جیسے کسی ہُو مر دبیخام سانی ناے رکبدتر کا کسی قمری سے جوڑا لگا دیا جائے۔

غزل نمبر ۵۶

واں کنگرۂ استغنا ہر دم ہے بلندی پر یاں نالہ کو اور الٹا دعوائے رسائی ہے

کنگرہ = قلعہ کی فصیل یا شہر پناہ کے کٹے ہوئے طاقچے جو خوبصورتی کے لیے فصیل کی چوٹی پر بنائے جاتے ہیں۔

اس شعر میں مرزا صاحب صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ معشوق کی لاپرواہی میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے اور وہ اس غلط فہمی میں ہیں کہ شاید ان کی آہ وزاری سے وہ ان پر مہربان ہو جائے چنانچہ اس کے لئے وہ قطب مینار توڑ کر لے آتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہمارے محبوبہ کی بے نیازی اور لاپرواہی کا یہ عالم ہے کہ وہ روز بروز تاڑ کے درخت کی طرح لمبی ہوتی چلی جا رہی ہے اور ایک نہ ایک دن اس کا استغنا قطب مینار سے اونچا نکل جائے گا دوسری طرف مرزا صاحب جو اپنی آہوں اور نالوں کے فیر کرتے رہتے ہیں اور اپنی دنیا کی دور مار بندوق سے آسمان کی طرف نالے سر فرماتے ہیں ان کا خیال ہے کہ ان کے نالے محبوب کے استغنا کی بلندی تک پہنچ جائیں گے جو تخمینہ اپنے نالوں کی بلندی کا لگایا تھا وہ غلط نکلا اور محبوب کا استغنا دس پانچ انگل ان کے نالوں کی رسائی سے اونچا ہی رہا۔

غزل نمبر ۵۷

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی　　لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی

مرزا صاحب میں ایک طرف تو رقیب سے انتقام لینے کا جذبہ کارفرما تھا اور دوسری طرف ہر معاملہ میں وہ بڑھ کر بڑا حصہ لینے کے قائل تھے اکثر لوگ مجلسوں اور میلاد شریفوں میں جب جاتے ہیں تو مختلف عنوانات سے تقسیم کے وقت دوہرا حصہ مارنے کا داؤں پیچ جانتے ہیں مثلاً پھاٹک پر حصے تقسیم ہو رہے ہیں اور ایک پر ایک لدا ہوا حصہ بانٹنے والے کی طرف بے چینی سے ہاتھ بڑھا رہا ہے

دوسرا حصہ وصول کرنے والے عموماً یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ کسی کی بغل سے ہاتھ نکال کر ایک حصہ جیب میں رکھا اور دوسرا ہاتھ کسی کی ٹانگوں کے بیچ سے لیجا کر حصہ بانٹنے والے کے سامنے بلند کر دیا اور اُس نے خالی ہاتھ پا کر ہاتھ میں دوسرا حصہ دیدیا مرزا صاحب بھی کچھ اسی طبیعت کے انسان تھے روزِ ازل جب غموں کی تقسیم ہونے لگی تو وہاں سے یہ بھی غم کے درجنوں حصے وصول کر لائے اور زندگی بھر اُن کو اِن غموں کو کھاتے گذری چونکہ رقیب سے اور اِن سے ٹھنتی چلی آ رہی تھی اور وہ دو چار جگہ اُن کے زخموں کو رفو کراتے دیکھ کر اِن کی محبوبہ سے شکایت کر چکا تھا لہذا مرزا صاحب کو رقیب سے اس کا بھی بدلا لینا تھا۔ چنانچہ اس شعر میں فرماتے ہیں کہ اے خدا جتنے کاری اور نہ مندمل ہونے والے زخم تو نے عدو کی قسمت میں لکھ دیئے ہیں وہ میری قسمت میں لکھ دے۔ اور معمولی زخم جن کا رفو ہو سکتا ہو اور قابل علاج ہوں وہ رقیب کی قسمت میں لکھ دے تاکہ تکلیف نہ برداشت کرنے کی صورت میں وہ بوالہوس جب رفوگر کے پاس جائے تو مرزا صاحب محبوب سے شکایت کر سکیں کہ اے صاحب آپ نے بھی ایک بوالہوس کو زخمی کیا جس میں معمولی زخم کی برداشت کرنے کی تاب نہیں تھی اس طرح مرزا صاحب معشوق کے دل میں اپنی جگہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصور — دل میں نظر آتی تو ہے ایک بوند لہو کی

مرزا صاحب جس قدر خون کا ذخیرہ عشق کی خاطر مدارات کے لئے دنیا میں لے کر آتے تھے وہ سب اُن کی ضعیفی کی وجہ سے ختم ہو چکا ہے اور اب اُنکے دل کی شیشی خالی رہ گئی ہے لہذا اب مرزا صاحب نے گھوڑا نہ سہی اسکی بو باس سہی کے پیشِ نظر

معشوق کی سرانگشت حنائی کا تصور کرکے اپنا کام نکالنا شروع کر دیا اور اس سے
مرزا صاحب نے بغیر خون کا ایک قطرہ صرف کئے اپنا مقصد پورا کر لیا۔

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے — یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

مرزا صاحب کی محبوبہ نے جو مرزا صاحب پر جور و تشدد کیے ہیں اُس سے
محبوب کو خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ کہیں مرزا صاحب اپنا معاملہ سپریم کورٹ
یعنی داور محشر تک نہ لے جائیں جس سے اور لینے کے دینے پڑ جائیں اور داور محشر کے
سامنے اُن کو رسوا و شرمندہ ہونا پڑے۔ چنانچہ مرزا صاحب محبوب سے فرماتے
ہیں کہ یہ جو تم اس خوف سے منٹ منٹ پر اپنی کھال پھڑ کا رہی ہو کہ ہیں یا عشاق
داور محشر کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیں گے اس سے مت ڈرو کیونکہ میدان
حشر میں نفسی نفسی کا عالم ہو گا وہاں اگر عشاق نے فریاد بھی کی تو نقار خانے میں
طوطی کی آواز سننے والا کون ہے وہاں تو ایک سے ایک جلاد اور ایک سے ایک
جابر لوگوں کے مقدمے پیش ہوں گے حاکم کے پاس اتنے چھوٹے چھوٹے مقدمات
سننے کا وقت ہی نہ ہو گا بلکہ کہہ دیا جائے گا کہ فریقین پنچائت کے ذریعہ آپس میں
صلح نامہ کرائیں۔

غزل نمبر ۵۸

آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے — اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

جب مرزا صاحب کسی ذی روح یا غیر ذی روح چیز کو ہم آغوش
دیکھتے ہیں تو ان کے زخم ہرے ہو جاتے ہیں صورت حال یہ ہے کہ مرزا صاحب باغ
میں گل گشت فرما رہے ہیں کہ آپ نے بلبل کو گل کے قریب دیکھ لیا۔ اِس پر

فرمار ہے ہیں کہ صاحب یہ بلبل جب گل کے قریب پہنچتا ہے تو اس سے رخصت ہونے کے لئے اپنا آغوش وا کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ آؤ آخری بار بغلگیر ہولیں کیونکہ اس کے بعد تو تم کو واپس آنا نہیں مقصد یہ ہے کہ زندگی اور بہار دونوں کی حیثیت بالکل وقتی ہے اور دونوں کا انتقال برحق ہے کیونکہ اس کے بعد خزاں کا صلال خود بیار پر جھاڑو پھیرے گا اسی طرح جس طرح انسان زندگی بھر خوش مزگیاں کرتا ہے اور چند روزہ زندگی ختم کرنے کے بعد چار کے کندھوں پہ ہٹو بچو کرتا دکھائی پڑتا ہے۔

غزل نمبر ۵۹

اُس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں شوق فضول و جرأت رندانہ چاہیئے

فضول : حد سے زیادہ۔

مرزا صاحب عشق و محبت کے معاملے میں شرم و حیا کے قائل نہ تھے وہ اس بات کے قائل ہیں کہ جنگ اور محبت میں ہر چیز کو جائز قرار دینا چاہیے اور اگر کوئی صاحب محبوب کا بوسہ چاہتے ہیں تو اول تو اُن کو بلا تکلف اور بغیر نتائج پر غور کئے اللہ کا نام لے کر بوسہ لے لینا چاہیئے خواہ اس کے بعد محلہ والے یا محترمہ کے ماں باپ کتنا ہی بلوہ کیوں نہ مچائیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ صاحب عشق میں تو رندوں جیسا جذبہ ہونا چاہیئے رندوں کا معاملہ ایسا ہے کہ وہ ہر کام میں لاپتا ذگی سے بے پروا ہو کر کرتے ہیں۔ اگر انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم بوسہ لے کر رہیں گے تو ایک نہیں پچاس لوہے کی سلاخوں میں محبوب کے رخسار مقفل کر کے رکھ دیجئے مگر وہ کسی نہ کسی طریقہ سے بوسہ لے ہی لیں گے۔

کیونکہ بوسہ لینے کے لئے رندوں کا شوق اور کئی بارس پادر کی جرات کی ضرورت ہوتا ہے۔

غزل نمبر ۶۰

صحبت رنداں سے واجب ہے حذر — جائے میخانہ کو کھینچا چاہیئے

رند = مے خوار :- واجب ہے حذر = ڈرنا اور حذر کرنا ضروری -

جائے میخانہ - شراب کی جگہ -

مرزا صاحب بعض اوقات واعظ اور محتسب کو نئے نئے انداز میں چکمہ دیتے ہیں کبھی محتسب کو یہ کہہ کر ڈراتے ہیں کہ صاحب کسی رند کے پاس جانے کی جرأت نہ فرمایئے گا کیونکہ وہ بڑے بگڑے دل ہوتے ہیں کسی کے عزت و ناموس کی پرواہ نہیں کرتے اور نہ جانے کیوں جبہ و دستار کو دیکھتے الار ہو جاتے ہیں دوسرے اگر آپ کو ایسا ہی شراب نوشی کا شوق ہے اور بجائے نصیحت کرنے کے آپ ان کے ساتھ بیٹھ کر شراب پینا چاہتے ہیں تو بھی اس ناچیز کی رائے قبول فرمایئے اور تشریف نہ لے جایئے ورنہ وہ آپ کو گھسیٹ گھسیٹ کر مارنا شروع کر دیں گے اور آپ کا جبہ و دستار اتار پھینکیں گے یا اس شعر کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اس جگہ آپ کا جانا اس وجہ سے بھی مناسب نہیں کہ آپ کو دوسرے واعظ اور محتسب جب رندوں میں دیکھیں گے تو آپ کی ساری آمدنی جو ریاکارانہ پند و نصائح سے ہوتی ہے ۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی اور آپ کے بیوی بچے فاقوں مر جائیں گے۔ لہذا جس طرح آپ اپنے گھر میں تنہا شراب نوشی فرماتے ہیں اسی طرح شراب نوشی فرماتے رہیئے مصرع ثانی میں " جائے مے " ذو معنی ہے۔

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی   منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

وہ جو آپ نے ایک متبذل سا شعر سنا ہوگا کہ ؎

گر گدھی کے کان میں کہہ دوں کہ عاشق ہوں ترا
ہے یقیں اس دن سے وہ بھی گھاس کھانا چھوڑ دے

مرزا صاحب اس شعر میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جن محترمہ سے انھوں نے عشق فرمایا ہے وہ مرزا صاحب سے چھٹکی چھٹکی رہتی ہیں دوسرے طرف مرزا صاحب کو یہ بھی غلط فہمی ہے کہ ان کی محبوبہ جو ان سے منہ چھپائے چھپائے پھرتی ہے اس سے وہ اپنی بیگانگی کا اظہار کرتی ہے حالانکہ اس منہ چھپانے میں اُن کی محبوبہ کے والدین کی ڈانٹ ڈپٹ شامل ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محبوبہ کے والدین نے مرزا صاحب کو کسی موقعہ پر اشارے بازی کرتے دیکھ لیا ہوگا جس کی وجہ سے انھوں نے اپنی بیٹی کو بُری طرح ڈانٹا ہے اور مرزا صاحب سے پردہ کرا دیا ہے یا ممکن ہے کہ یہ کہہ دیا ہو کہ جب مرزا صاحب اتنہ ذکھن دیکھتے ہوں تو وہ پورب پچھم دیکھنا شروع کر دے مگر مرزا صاحب بچارے جو محبت کو بطور غذا استعمال کرتے رہے ہیں ہر موقعہ پر یہی خیال کرتے ہیں کہ جو لڑکیاں اُن سے بھاگی بھاگی پھرتی ہیں وہ سب اُن پر مرتی ہیں اسی لئے مرزا صاحب کی طرف سے دوسرے مصرعہ میں اس بات کا مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ صاحب جب آپ کی بیگانگی اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ہم سے محبت فرماتی ہیں تو ہم سے منہ چھپانا کیا معنے اور پھر جب کہ آپ باہر بھی نکلتی ہیں اور زید عمر بکر سے مخاطب ہوتی ہیں مگر ہم کو دیکھتے ہی آپ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے

اڑنے لگتی ہیں اور اب ہم سے منہ چھپانے لگتی ہیں۔

اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی　　　یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے

ہنگامہ آرا = لڑاکا یا تُند خو۔ بدمزاج۔ غصہ ور۔

مرزا صاحب عشق میں ہر طرف بدنام ہیں اور چونکہ اس سلسلے میں اُن کی بار بار رسوائی ہو چکی ہے اس لیے وہ چکنا گھڑا بن کر رہ گئے ہیں مرزا صاحب کی بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ شادی ہوئی تو ایسی جگہ کہ بیوی نے ان کو منہ نہ لگایا کیونکہ وہ جس قدر صوم و صلوٰۃ کی پابند تھیں اُسی قدر مرزا صاحب رند مشرب واقع ہوئے تھے آپ نے دیکھا ہوگا کہ اُن کو مرزا صاحب کی چہلیں تک پھوٹی آنکھوں نہ بھاتیں۔ چنانچہ اکثر یہ بیچارے مصلے پر سے اُن کی ڈانٹیں کھاتے تھے اور اپنی ڈیوڑھی پر قدم واپس آ جاتے تھے مگر جب مرزا صاحب کو عشق کی سوجھی تو معشوق بھی اُسی ٹکسال کی ملی۔ جیسی کہ ان کی گھر والی تھی بلکہ گھر والی تو صرف کریلا تھی مگر یہ نیم چڑھی بھی تھی۔۔ غالباً وہ مرزا صاحب نے گھر میں قدم رکھتے ہی گالیاں دینا شروع کر دیتی تھی اور جھاڑو پنجہ لیے تیار رہتی تھی عجب نہیں جو گھر سے ننگے پیر پیچھے دوڑتی ہو تی مگر مرزا صاحب اسی میں خوش تھے کیونکہ مرزا صاحب تو اُن عاشقوں میں سے تھے جن کو رسوائی میں مزہ آتا تھا ممکن ہے یہ سوچتے ہوں کہ شاید لڑکی کی بدمزاجی سے تنگ آ کر وہ مرزا صاحب کے ساتھ اُس کا نکاح پڑھوا دیں۔

غافل اُن مہ طلعتوں کے واسطے　　　چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ　　　آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

طلعت ۔ رُخ ۔ صورت ۔ مہ طلعت ۔ مہ رخ جبیں ۔

ان دونوں قطعہ بند شعروں میں مرزا صاحب کچھ اپنی ضعیفی کے سبب اس درجہ احساس کمتری میں مبتلا ہو گئے تھے کہ حسین عورتوں کو دیکھ کر بجائے اپنے کو اُن کا ہم پلہ سمجھنے کے اس تلاش میں رہتے تھے کہ اُن کے لئے اچھے تندرست مردوں کو فراہم کیا جائے تاکہ نسلاً بعد نسلاً حسین بچے پیدا ہوتے رہیں اسی لئے فرماتے ہیں کہ حسینوں کے لئے تو محبت آتی ہے۔ والا کبھی کوئی "گبرو" جوان ہی ہونا چاہئے ورنہ محبت کا سارا مزہ کرکرا ہو کر رہ جائے گا۔ دوسرے شعر سے دو قسم کے مطلب ظاہر ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ باوجود بڑھاپے کے آپ حسینوں پر جان دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ نہایت غلط قسم کا جوڑا لگ جائے خواہ بچے کیسے ہی بھیانک اور مریل قسم کے کیوں نہ پیدا ہوں دوسرے معنی یہ ہیں کہ ذرا آپ کی شکل ملاحظہ ہو، نہ سیٹھا اور نہ منتلی اور شکل و صورت جیسی کچھ ظاہر ہے مگر جوان جوان مہ جبینوں اور مہ طلعتوں پر جان دیتے پھرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اُن سے نکاح فرما کر اُنھیں اپنی زندگی ہی میں تمام عمر بیوہ رکھیں ۔

غزل نمبر ۱۶

درس عنوان تماشا بہ تغافل خوشتر ہے نگاہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

عنوان = مضمون ۔ تماشا = دیکھنا ، نظر کرنا ۔ رشتہ شیرازہ = وہ ڈوری جو پراگندہ اوراق کو یکجا کرتی ہے ۔

مرزا صاحب اس شعر میں فرماتے ہیں کہ محبوب اپنی کمین گاہ میں بیٹھا

عاشقوں پر جوابی حملے کر رہا ہے اور اپنی نگاہوں کے تیر مچان پر بیٹھے بیٹھے
اُن بدنصیبوں پر پھینک رہا ہے اور عشاق نہایت روانی کے ساتھ گھائل
ہو رہے ہیں گویا یہ بھی ایک مستقل فن ہے اور تاوقتیکہ کسی کو اس کے
ابتدائی اسباق کی مشق نہ ہو وہ اس فن میں کامیاب نہیں ہو سکتا غرض
جب در جنوں عشاق کو وہ گھائل کر چکا اور شہر بھر کے اسپتالوں میں تل
رکھنے کی جگہ نہ رہی تو اُس کو اندازہ ہوا کہ یہ طریقہ کچھ ٹھیک نہیں کیونکہ
یہ تمام زخمی اسپتال جا کر مرہم پٹی کرا کے پھر مچان کے سامنے آ کر بلوہ شروع
کر دیں گے لہٰذا اُنھیں بیٹھا زہر دے کر مارنا چاہئے اور سب سے زیادہ
موثر طریقہ نیم نگاہی یا تغافل ہے۔ چنانچہ اب اُس نے ایک نہایت بیہودہ
طریقہ ان عشاق کو دیکھنے کا اختیار کیا۔ یعنی آنکھیں دبا کر اُنھیں دیکھنا شروع
کیا یعنی اوپر اور نیچے کی پلکوں کو ملا کر اس طرح آنکھیں ملا لیں کہ بظاہر آنکھیں
بند معلوم ہوں اس کا اس طرح آنکھ بند کر کے دیکھنا بھی مرزا صاحب کو بیحد پسند ہے

غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموز بتاں   کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

سادگی آموز = سادگی سکھلانے والا۔ خانۂ آئینہ = آئینہ، اس لئے کہ
آئینہ ظرف اور عکس مظروف ہے۔ پس آئینہ ظرف مکاں ہوا اور خانہ بھی
ظرف مکاں ہے۔

مرزا صاحب کا محبوب بھی عجیب و غریب طبیعت لے کر پیدا ہوا ہے۔
کبھی مرزا صاحب اُس پر مرتے ہیں تو کبھی وہ اُن پر مرنے لگتا ہے کبھی وہ
مرزا صاحب کے انتقال پر ملال پر خوش ہوتا ہے اور کبھی بیوگی کا لباس پہن کر

مرزا صاحب کی یاد میں لپ اسٹک، پاؤڈر اور غازہ لگانا بند کر دیتا ہے۔ اپنے بالوں کو بکھرا لیتا ہے۔ یہاں تک کہ مرزا صاحب نے اس کے سنگار کے لئے جو آئینہ لا دیا تھا اُس میں اپنی صورت تک نہیں دیکھا جس کی وجہ سے آئینہ پر بھی ویرانی برسنے لگی مگر مرنے کے بعد جب اس کے اس طرح دانہ گھاس چھوڑنے کی اطلاع مرزا صاحب کو ہوتی ہے تو وہ بیحد ملول ہوتے ہیں اب بتائیے کہ وہ کرے تو کیا کرے ماتم کرتی ہے تو مصیبت اور مرنے پر اظہار مسرت کرے تو مصیبت ۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اگر دنیا کے تمام معشوقوں نے اسی طرح عشاق کے مرنے پر چوڑیاں بیس بیس کر پہننا شروع کر دیں اور ان کے معشوق کی طرح سفید اور سادہ لباس پہنا شروع کر دیا تو دنیا میں کوئی کشش اور جاذبیت باقی نہ رہے گی کیونکہ ساری دنیا رانڈوں اور بیواؤں سے بھر جائیگی لہذا آپ دعا فرماتے ہیں کہ اے خدا! غم عشاق سادگی آموز بتاں نہ ہو تاکہ دنیا ویرانی سے محفوظ رہے۔

شوق دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے ہو نگہ مثل گل شمع پریشاں مجھ سے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت مرزا صاحب نے یہ شعر نظم کیا اُس وقت یہ کسی قصائی یا بکر قصاب کی دکان کے سامنے سے گذر رہے تھے جس کے یہاں مختلف بکروں کی سریاں بڑی بڑی آنکھیں کھولے ٹنگی ہوئی تھیں۔ اُس خیال کو اپنی معرفت یوں ادا کرتے ہیں کہ میرا سر جدا ہونے کے بعد نگاہیں تیرے دیدار کے شوق میں اور زیادہ پھیل جائیں گی اور ان کی روشنی بڑھ جائے گی۔ مقصد یہ کہ بحالت شوق دیدار اگر گردن ماری جائے تو شوق دیدار

اور زیادہ ہو جائے گا اُسی طرح جس طرح کہ گل شمع کو کترنے سے شمع کی روشنی تیز ہو جاتی ہے یا یوں سمجھئے کہ بکرے کی گردن کٹنے سے اس پر سات طبق روشن ہو جاتے ہیں ۔

نگہ گرم سے اِک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

خس و خاشاک = معمولی لوگ ۔ گلستاں = دنیا ۔

مرزا صاحب اس شعر میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عشق نے ان کی نگاہوں کی پتلیوں کو آتشیں شیشے میں منتقل کر دیا ہے یعنی جو چیز ان کی نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے ، جل کر بھسم ہو جاتی ہے اس طرح سارے شہر کا کوڑا کرکٹ جلتا رہتا ہے گویا اس طرح کی صفائی ستھرائی کا کام اس خاکسار کے سپرد ہے ۔ اور گلیوں اور سڑکوں پر کوڑے کرکٹ کی وجہ سے جو تاریکی اور گندگی پھیلی رہتی ہے ۔ اسے آپ روشن اور منوّر کرتے ہیں یعنی جلاتے رہتے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ یہ کام بڑے بڑے سینٹری انسپکٹر اور صفائی کے داروغہ انجام نہیں دے سکتے ۔ جو مرزا صاحب ... جیسے عاشق انجام دیتے ہیں حقیقتاً مرزا صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ صاحب عشق نے ہم میں وہ کشش اور جذبہ پیدا کر دیا ہے کہ اگر ہم کسی بدھو نتھو کلو کو بھی دیکھ لیں تو وہ مجنوں دوران اور فرہاد زماں بن جائے ۔

غزل نمبر ۶۲

نکتہ چیں ہے غم دل اُسکو سنائے نہ بنے کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

نکتہ چیں = اعتراض کرنے والا ۔ بننا = ممکن ہونا ۔ بات بنانا ۔

کامیاب ہونا۔ مراد بر آنا، جھوٹ بولنا، سخن سازی کرنا۔

مرزا صاحب کی محبوبہ غالباً کسی یونیورسٹی کی ایم۔ اے کی طالبہ تھی جو اردو میں تنقید کا بھی ایک پرچہ (Criticism) لیے ہوئے تھی مرزا صاحب اور اُن کے عام ساتھی عشاق کا اُس نے تنقید کرتے کرتے دیوالہ کھسکا دیا تھا۔ عشاق کا معاملہ یہ ہے کہ یہ جہاں جاتے ہیں اپنی بھیرویں چھیڑ دیتے ہیں یعنی اپنی داستانِ عشق اور اپنی غم کی کہانی سنانا شروع کر دیتے ہیں۔ مرزا صاحب نے بھی عجب نہیں جو اپنی دو ایک کہانیاں اُس کے سامنے پڑھی ہوں، اس پر اُس نے آل احمد سرور کی تنقید کیا ہے؟ والی کتاب پڑھ کر ایسی کڑی تنقید کی کہ مرزا صاحب کے دانت کھٹے ہو گئے، چنانچہ ایک دن جب ایک تنقیدی نشست میں تمام عشاق شرکت کرنے جا رہے تھے تو مرزا صاحب پھاٹک پر کھڑے ہوئے ہر عاشق کو روک رہے تھے کہ اماں کیا کرو گے ایسی جگہ کہانی سنا کے جہاں وہ تنقید ہو گی کہ طبیعت جھک ہو جائیگی پھر ستم یہ ہے کہ آپ کا جھوٹ سچ سخن سازی اور لفاظی جو آپ فرما کر کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے؛ کامیاب نہ ہوں گے۔ کیونکہ جو کچھ میری کہانی کا حشر ہوا وہ میرا ہی دل جانتا ہے۔

میں بتاتا تو ہوں اُس کو مگر اے جذبۂ دل اُس پہ بنجائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

بنجائے = بیت جائے یا گذر رہے۔

مرزا صاحب نے بار بار اپنے محبوب کے نام دعوت نامے بھیجے مگر انھوں نے تمام دعوت ناموں کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا مگر مرزا صاحب اس کے

بعد بھی نہایت پابندی سے رقعہ بازی فرماتے رہے اور یہی اُمید کرتے رہے کہ شاید وہ تشریف لے آئیں۔ زرا ایک مرتبہ جب وہ نہ آئیں تو مرزا صاحب کسی صاحب سے ایک "نقش" بیس تے لے آئے اُس نقش کا یہ اثر تھا کہ وہ محبوب کو بے چین کر دیتا تھا معلوم نہیں کہ "درد قولنج" اٹھانے والا تعویذ تھا یا پیٹ میں کوئی شدید درد پیدا کر دینے والی چیز تھی بہر حال کوئی ایسا ہی تڑپا دینے والا تعویذ تھا کہ جس کو لانے کے بعد مرزا صاحب خدا سے دعا کر رہے ہیں کہ اے خدا بدل اس تعویذ کے ذریعے اُن کے ایسا درد اٹھے کہ بغیر ہم تک آئے اُن کو چین نہ پڑے۔

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر ہر کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

مرزا صاحب کے رقیب کو انھیں ذلیل کرنے میں بڑا ملکہ تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ رقیب کو محبوب کا خط نجانے کہاں سے مل گیا ہے کہ وہ فخریہ طور پر اپنی عزت اور توقیر بڑھانے کے لئے اس طرح خط کو لئے پھر رہا ہے کہ خود بخود لوگ اُسے دیکھ کر پوچھیں کہ صاحب یہ کیا چیز ہے، اور اس طرح وہ چھپانے کی بناوٹی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بس یہیں سے رقیب کا گھٹیا پن ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس کا خیال نہیں کرتا کہ اگر محبوب کے ماں باپ نے کہیں اس طرح خط لیجاتے دیکھ لیا تو وہ صاحبزادی کا کیا حشر کریں گے اور اُن کی شادی بیاہ میں کیسے لالے پڑ جائیں گے۔ یہ محبوب کا خط اس طرح چھپا کر لے جاتا ہے جس طرح کوئی قصائی کی دوکان سے دامن میں چھپا کر گوشت لے جاتا ہے جس سے چیلوں کی اگر نگاہیں نہ بھی پڑتی ہوں تو بھی پڑ جائیں۔

اس نزاکت کا برا ہو، وہ بھلے ہیں تو کیا ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

ہاتھ آنا = حاصل ہونا، ملنا

مرزا صاحب نے اس شعر میں اپنے محبوب کی جس نزاکت کو ظاہر کیا ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کوئی "بڑھیا کا کاتا" قسم کی ... چیز تھی یا چھوئی موئی کا درخت۔ مقصد یہ کہ کسی نے پنڈے پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ بس کر سُرمہ ہوگئیں۔ کسی نے ڈانٹ دیا اور وہ بیہوش ہوگئیں غرض وہ کچھ ایسی گئو طبیعت لے کر آئی تھیں کہ مرزا صاحب تک اُن کے بلانے پر آن کے گھر پہنچ جاتی تھیں مگر اُن کا جانا نہ جانا مرزا صاحب کے لئے یکساں تھا کیونکہ بجا نے کس درجہ مریل اور مدقوق تھیں کہ مرزا صاحب اُن کو چھوتے ڈرتے تھے کہ ادھر اِن کو چھوا، اور اُن کے قلب کی حرکت بند ہوئی اور مرزا صاحب پر دفعہ ۳۰۲ کا مقدمہ قائم ہوگیا

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

مرزا صاحب آخر عمر میں چونکہ ضعیف ہوگئے تھے اور گھر کا سودا سلف اُنھیں کے ذمہ تھا اس لئے ایک دن وہ بازار سے جھلی والے کے سر پر برادے کی بوری خرید کے آگے آگے خود اور پیچھے پیچھے جھلی والا چلے آرہے تھے کہ اچانک بوری کسی شخص کے دھکا لگ جانے سے جھلی والے کے سر سے گر گئی چنانچہ فرماتے ہیں کہ بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے یعنی اتنی ڈھائی تین من وزن کی بھاری بوری سر پر سے گر کر زمین پر آرہی ہے کہ اب اُس کا اٹھانا ایک مصیبت ہے۔ جھیکی پر تو دو چار دوسرے

جھلی والے اور موجود تھے اس لیئے انھوں نے جھلی والے کے سر پر ہاتھ لگا کر اسے رکھ دیا تھا مگر اب یہاں راستے میں ہماری کون مدد کرے گا کیونکہ ہمارے اور جھلی والے دونوں کے بس کی بات نہیں کہ اسے دوبارہ اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دیں بہر حال یہ ایک ایسا کام آن پڑا ہے کہ بنائے نہیں بنتی کہ کس سے جاکر کہیں کہ بھیا ذرا ہاتھ لگا کر اسے سر تک پہنچا دو کیونکہ لونڈے لاڑی بوڑھے کی بات نہیں سنتے ۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

یہ واقعہ ہے کہ عشق کی حیثیت بجلی کے کرنٹ سے کم نہیں ہوتی چونکہ اس کا سوئچ قضا اور قدر کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس لئے جہاں ایک مرتبہ اسے آن کر دیا گیا پھر کسی کے بس کی بات نہیں جو اسے "آف" کر دے یعنی کھٹ کا گرا دے اور بجلی بند ہو جائے نتیجہ یہ ہے کہ اس "اے سی" کرنٹ سے نجات حاصل کرنا مصیبت ہے یہ واقعہ ہے کہ عشق کا ترکش کسی محبت بھرے دل پر لگ جاتا ہے تو پھر اے کی طرح محبت سے پیچھا چھڑانا دشوار ہو جاتا ہے ۔ سوائے اس کے کہ انسان نیوز ہو کر رہ جائے اس کے بنائے کچھ نہیں بنتی ۔

غزل نمبر ۶۳

خط عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد
یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

خط عارض ۔ سبزۂ رخسار ۔ وہ سیاہی جو آغاز جوانی پر رخساروں پر نمودار ہوتی ہے ۔

مرزا صاحب کے لئے مصیبت یہ تھی کہ وہ ہر کام میں باقاعدگی کو دخل دیتے تھے مکان کرایہ پر لیتے تو سب سے پہلے اس کا سرخط لکھواتے کسی سے قرض لیتے تو اس کی پہلے سے لکھا پڑھی کرا لیتے چنانچہ اس چیز نے انکی ساری عادتیں اس درجہ خراب کر رکھی تھیں کہ جب انھوں نے اپنے آپ کو عشق کے حوالے کیا اور اپنا بیعنامہ معشوق کے نام کرایا تو اس میں محبوبہ کی زلفوں کی معرفت یہ بھی لکھوا لیا کہ جتنے جور و تشدد محبوب ان پر توڑے گا یہ اسے نہایت صبر و ضبط کے ساتھ برداشت کریں گے دوسری بات یہ کہ مرزا صاحب پرانے لوگوں کی طرح ہمیشہ سیاہ روشنائی سے ہر چیز لکھتے تھے چنانچہ ان کی الفت کا جب سرخط لکھا جانے لگا تو مرزا صاحب کے پاس قلم دوات نہیں تھی اس لئے آپ نے ایرانی وضع کی روشنائی دوست کے رخسار سے لے کر اقرار نامہ پر دستخط فرمائیے ستم یہ کیا کہ اس اقرار نامے میں اس بات کو بھی لکھوا دیا کہ محبوب کی زلفوں کی لائی ہوئی ساری بلائیں نہ برضا و رغبت برداشت کریں گے اور ہر جور و تشدد اُن کو سر بہ سر منظور ہے۔ عشق کا سرخط لکھنے کے بعد اب جو محبوب نے اپنی زلفوں کے بال بکھیر کر مرزا صاحب اور دوسرے عشاق پر مظالم شروع کئے تو سبھوں کو دن میں تارے نظر آگئے اگر سرخط نہ لکھ چکے ہوتے تو عدالتی عدالتا اور پولس سے مدد لے کر اپنی جان بچا سکتے تھے مگر وہاں تو پہلے سے عہد نامہ لکھ بیٹھے تھے اور یہ سب کچھ مرزا صاحب کو اس وجہ سے کرنا پڑا کہ انھوں نے ایک دن معشوق کو بال کھولے دیکھ لیا تھا اور یہ ادا ان کو اس درجہ پسند آگئی کہ یہ ہر قسم کی مصیبتیں برداشت کرنے کو تیار ہو گئے۔

غزل نمبر ۶۴

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا ۔۔۔ تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

لگاوٹ : معشوق کا خوش اختلاطی اور محبت آمیز باتوں سے عاشق کو اپنی طرف مائل کرنے کا انداز یعنی میلِ خاطر :۔ آب دینا : تلوار کو باڑھ دینا
مرزا صاحب کا محبوب یا تو اُن کا قطعی طور پر بائیکاٹ کئے رہتا تھا یا اگر کبھی ملتا تو مختلف انداز میں گھائل کر دیتا کبھی محبت کی باتیں کرتے کرتے ایک دم سب ذخم پر اُترآتا کبھی باتیں کرتے کرتے ان کی پنڈلی پر زور سے ہاتھ مار کر خود ہی چلا دیتا "ارے صاحب یہ آپ کیا کر رہے ہیں" اور یہ کہہ کر رونا شروع کر دیتا کبھی اُن سے باتیں کرتے کرتے آنکھوں میں بناوٹی آنسو بھر لاتا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مرزا صاحب سے اسے غیر معمولی محبت ہے حالانکہ یہ ساری فریب کی باتیں تھیں۔
اس لئے مرزا صاحب پر جور و تشدد کرنے کے یہ نئے نئے طریقے نکال رکھے تھے کبھی تو زور سے بھالے بھونکتا اور کبھی قریب سے اگر اُن کے ساتھ ایسی حرکتیں کرتا کہ مرزا صاحب کی جان پہ بنجاتی۔

دکھاکے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو ۔۔۔ نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

مرزا صاحب کو اُن کا محبوب اپنی محبت کی ڈوگن میں لٹکائے ہوئے ہے نہ جان بخشی کرتا ہے اور نہ اپنی جنبشِ لب سے کام ہی تمام کرتا ہے۔ مرزا صاحب اُس سے ایک بوسہ کی فرمائش کر رہے ہیں اور یہ جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہیں مگر وہ مرزا صاحب کو کورا جواب دے کر کہتا ہے کہ مرزا صاحب بہتر یہی ہے کہ آپ فوراً چلے جائیے ہمارے یہاں اس قسم کا کوئی کاروبار نہیں ہوتا دوسرے

اُس وقت تک بوسہ نہیں دیا جا سکتا جب تک کہ ہمارے والدین کی لکھی ہوئی تحریر یہ آپ ہم کو لا کر نہ دکھا دیں۔ غرض وہ مرزا صاحب کو اس طرح بلا سبب گھر دار رکھتی جو مرزا صاحب جیسے نحیف الجثہ انسان کے لئے بے حد پریشان کن تھا۔ چنانچہ مرزا صاحب عجیب کشمکش میں مبتلا ہیں۔ مرزا صاحب کا باوا آدم ہی نرالا ہے کہ ان کا محبوب کے جنبش لب سے جیتا ہے مگر مرزا صاحب اُس کی اس ادا پر مرتے ہیں نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن اگر وہ یہی کہہ دیتی کہ مرزا صاحب اس وقت پھر آئیے کسی دوسرے وقت آئیے گا تو بھی مرزا صاحب مطمئن ہو جاتے مگر اس نے ایسا بھی نہیں کیا۔

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے ۔ پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اوک = ایک ہاتھ یا دونوں ہاتھ منہ کو لگا کر پانی پینا عموماً اعلیٰ ذات کے ہندو، پست اقوام کے کسی آدمی کو نہیں چھوتے اور نہ اپنا برتن اُن کو چھونے دیتے ہیں۔ پلانا ہوتا ہے تو لٹیا سے یا چلو میں پلا دیتے ہیں۔

مرزا صاحب کا محبوب اُن کو نہ جانے کس درجہ اچھوت سمجھے ہوئے تھا کہ نہ تو مرزا صاحب کو اپنے پنڈے میں ہاتھ لگانے دیتا اور نہ اس کا روادار ہوتا کہ وہ اُس کے کسی برتن کو چھو لیں۔ ایک دن نہ جانے کس تقریب میں وہ عام لوگوں کو شراب پلا رہا تھا کہ مرزا صاحب بھی پہنچ گئے اور وہ بھی چلو لگا کر ایک کونے میں کھڑے ہو گئے اور چلا چلا کر کہنے لگے کہ حضور ادھر بھی ایک نظر ادھر بھی حالت یہ ہے کہ مرزا صاحب چلو باندھے بیٹھے ساقی کی طرف دیکھ دیکھ کر اُس سے کہہ رہے ہیں پلائیے مگر وہ ان کی طرف پیٹھ موڑے کھڑا ہے۔ مرزا صاحب چونکہ

آدمی کنجوس قسم کے تھے اس لئے انھوں نے کلھڑ تک کے دام بچانے کی کوشش کی ورنہ دو پیسے کے کلھڑ کی کونسی بات تھی یا پھر ممکن ہے کہ یہ سوچے ہوں کہ استاد اگر کلھڑ لے کر گئے اور اس نے صرف کلھڑ بھر شراب دے کر ہاتھ روک لیا تو بڑی چوٹ ہوگی لہذا چل کر چلو ہیں کیوں نہ شراب پی جائے تاکہ خوب ڈٹ کر اور سیر ہو کر پئیں مگر اس نے سرے سے شراب ہی مرزا صاحب کو پلانے سے انکار کر دیا۔ اسدؔ خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو سے

خوشی سے ہاتھ پاؤں پھولنا = خوشی کے مارے بدحواس ہونا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کی پہنچ زیادہ سے زیادہ محبوب کے پیروں تک تھی اور محبوب نے صرف مرزا صاحب کو قدموں پر گرنے پڑنے کی اجازت دے رکھی تھی ایک دن مرزا صاحب کی جو قسمت جاگی اور نہ جانے محبوب کو کیا شیطان نے کیا انگلی دکھائی کہ اس نے مرزا صاحب کو پیر دابنے کی اجازت دیدی اس پر مرزا صاحب مارے خوشی کے گل گل ہو گئے اور سوچے کہ چلو بھاگے بھوت کی لنگوٹی بھلی۔ یہ واقعہ ہے کہ ہر عشق دودھری گائے کی دولاتیں بھلی کے مصداق معشوق کے پیر دبوانے کو بھی اپنے لئے بڑی عزت سمجھتا ہے۔

غزل نمبر ۶۵

خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے ہو فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

خوشا = کلمہ تحسین و مسرت۔ اقبالِ رنجوری = بیماری کی خوش نصیبی۔

عیادت = مزاج پرسی۔ فروغ = روشنی۔ طالعِ بیدار = خوش نصیبی۔

مرزا صاحب محبوب کے فراق میں جاڑے اور بخار میں مبتلا ہیں اس کی اطلاع

جب محبوب کو ہوتی ہے تو اُس نے یہ سوچ کر کہ چلو مرزا صاحب پر ایک احسان لادتے چلو مرزا صاحب کی عیادت کو آنے کا فیصلہ کیا اور پہنچ گیا مرزا صاحب کہاں تو بیمار تھے اور کہاں یہ سوچ کر بے حد خوش ہوئے کہ چلو بیماری کے بہانے وہ عیادت کو تشریف تو لائے اور اُن کا سوکھا ہوا مقدر مارے خوشی کے ڈنڈ پیلنے لگا اور جب وہ چلے گئے تو مرزا صاحب نے مصلیٰ بچھا کر دعائیں دینا شروع کیں اے پاک بے نیاز اپنی رحمتوں کے صدقے میں زندگی بھر مجھے جوڑی بخار میں مبتلا رکھ تاکہ وہ روز روز مجھے دیکھنے تشریف لایا کریں گویا مرزا صاحب کی بیماری ان کے لئے فال نیک ثابت ہوئی اور شمع بالیں کی روشنی طالع روشنی بن گئی ۔

ابھی آتی ہے بو بالش سے اس کی زلف مشکیں کی
ہماری دید کو خواب زلیخا عار بستر ہے

اس شعر میں مرزا صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حضرت زلیخا کا خواب ہمارے خواب کے سامنے لونڈا ہے جب حضرت زلیخا نے اپنے محبوب حضرت یوسف کو خواب میں دیکھا تو مرزا صاحب نے بھی حضرت زلیخا کے خواب کے جواب میں اپنے محبوب کو اس طرح خواب میں دیکھا کہ وہ مرزا صاحب کے پہلو میں دراز ہونے کے بعد اپنی زلفوں کی خوشبو بستر پر چھوڑ گیا۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو مرزا صاحب کے خواب کے سامنے زلیخا کا خواب بے حقیقت اور پھُس پھُسا رہا اس لیے ... مرزا صاحب کی نظروں میں خواب زلیخا یعنی حضرت یوسف کا دیدار مرزا صاحب کے خوشبودار بستر کے لئے موجب ننگ و عار ہے کیونکہ حضرت یوسف آئے بھی اور گئے بھی اور ختم فسانہ ہو گیا مگر مرزا صاحب کا

معشوق اس کے برعکس آیا اور صبح تک ڈٹا رہا اور چلتے وقت بستر پر اپنی زلف مشکیں کی خوشبو بھی چھوڑ گیا۔

غزل نمبر ۶۶

خطر ہے رشتۂ الفت رگِ گردن نہ ہو جائے
غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے

رشتۂ الفت = دوستی ۔ محبت کا تعلق = رگِ گردن: علامت غرور و تکبر کی

نجانے مرزا صاحب کی محبوب کو اس کے ماں باپ نے گھر سے نکال باہر کیا تھا یا وہ لڑ بھڑ کر خود ہی مرزا صاحب کی جان پر مسلط ہو گئی تھی کہ مرزا صاحب مارے خوشی کے آپے سے باہر تھے مگر مرزا صاحب کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس درجہ ان پر مہربان کیوں ہے اور یکایک کونسی افتاد آ پڑی جو وہ مرزا صاحب سے اپنے رشتۂ الفت کو استوار کرنے پر [illegible] ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ مرزا صاحب کے دل میں ایک چور تھا اور وہ یہ سوچ رہے تھے کہ کہیں اس خوشی و مسرت پر اور ان کے اس گھمنڈ کو دیکھ کر اس کی گردن کی رگ پھر نہ بھڑک جائے اور وہ پھر غرور اور تکبر کے ہیضہ میں مبتلا ہو کر مرزا صاحب پر جور و تشدد شروع کر دے کیونکہ کبھی کبھی زیادہ دوستی بھی خطرناک ہوتی ہے اور دشمنی میں بدل جاتی ہے ۔ غرض مرزا صاحب کو کسی پہلو چین نہ تھا اس کی ملاقات سے ان کو یہ خطرہ رہتا تھا کہ کہیں رقیب اس کو بھڑکا کر پھر اسے ان کا دشمن نہ بنا دے مرزا صاحب صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عاشق کی جان ہر وقت چڑیا تو چن میں پڑی رہتی ہے اگر محبوب مہربان نہ ہو تو گھر بھر اپنے نالوں اور فریادوں پر اٹھائے

رہتا ہے اور اگر محبوب مہربان ہو جاتا ہے تو اس اندیشہ میں گھلا کرتا ہے کہ کہیں لگائی بجھائی کرنے والے رشتۂ الفت کاٹ کر نہ کھسک جائیں۔

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے　　نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

لَے = دھن ۔ آواز ۔ سُر:۔ نَے = بانسری

ایک صاحب نے ایک رونے والے سے پوچھا کہ آپ روتا کیوں ہے؟ بولا صورت ہی ایسی ہے۔ اس شعر میں مرزا صاحب بھی رونے کے جواز میں فرماتے ہیں کہ صاحب رونے میں سب سے زیادہ آسانی یہ ہے کہ اس میں نہ کوئی سُر کی قید ہوتی ہے اور نہ لَے کی، نہ اُس میں دادرا اور ٹھمری کی دھنوں کو سیکھنے کے لئے میوزک کالج میں داخلہ لینا پڑتا ہے اور نہ اس کے لئے موسیقی کے ساز و سامان فراہم کرنا پڑتے ہیں اس میں آسانی یہ ہے کہ جگہ تُک بے تُک جیسا رونا آیا رو لئے نہ کوئی یہ دیکھتا ہے کہ رونے والے کی دھن ٹھیک ہے اور نہ تال ڈھمری درستی پر نگاہ رکھتا ہے۔ لہٰذا مرزا صاحب نے جو ہر وقت نالہ و فریاد کیا کرتے تھے اپنی زندگی کا مشغلہ اس رونے کو قرار دے کر نہ جانے کتنی محبوباؤں کی جانوں کو رو "ڈالا تھا۔

غزل نمبر ۶۸

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی　　وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کا محبوب کچھ کھنچ تان کر کھنچا دیکھتا تھا اسی وجہ سے مرزا صاحب کو اس کی شکایت ہے کہ وہ اُن کی طرف کامل التفات نہیں برتتا اور تغافل سے کام لیتا ہے حالانکہ مرزا صاحب کی یہ شکایت بالکل

بجا ہے کیونکہ بھینگے کے بارے میں اس کا فیصلہ کرنا ہی دشوار ہے کہ وہ دیکھ
کدھر رہا ہے کیونکہ جب وہ دوسروں کی طرف دیکھتا ہے تو بالکل ایسا محسوس
ہوتا ہے کہ وہ آپ کی طرف دیکھ رہا ہے اور جب وہ آپ کی طرف دیکھتا ہے
تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کو دیکھ رہا ہے۔ مرزا صاحب اس شعر
میں فرماتے ہیں کہ معشوق ایک عرصہ سے تغافل یا نیم نگاہی بلکہ یوں کہیئے کہ
یعنی بھینگے پنے کی مشق کر چکا تھا۔ چنانچہ برسوں کی کوشش اور ریاض کے بعد اُس
کے تغافل نے غمزے کی صورت اختیار کر لی یعنی وہ مستقل طور پر بھینگا ہو گیا اور اُس
کی یہ نیم نگاہی یعنی بھینگا پن جو بظاہر کامل التفات یعنی بھرپور دیکھنے سے کم
ہے جگر کے پار ہو جاتی ہے مقصد یہ کہ اگر کوئی شخص براہ راست دیکھے تو اس
کے دیکھنے میں وہ لطف نہیں آتا جو ترچھی نظر سے دیکھنے میں حاصل ہوتا ہے
اور بھینگا چونکہ کھینچ تان کر اپنے نوکس کو نشانہ پر لاتا ہے اس لئے اس
کا آدھا دیکھ لینا بھی اُس کے پورے دیکھ لینے کے برابر ہوتا ہے اور عاشق کو
عشق کے پورے پیسے وصول ہو جاتے ہیں مطلب یہ ہے کہ معشوق کا التفات سے
دیکھنا اتنا متاثر نہیں کرتا جتنا کہ تغافل کی کم نگاہی مسحور کرتی ہے۔

غزل نمبر ۶۹

در پردہ انھیں غیر سے ہے ربطِ نہانی   ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردہ نہیں کرتے

ہمارے محلّے میں ایک سماۃ رہتی تھیں جو عجیب و غریب قسم کا پردہ فرماتی
تھیں یعنی ہم دروازے پر کھڑے ہیں اور وہ دونوں دروازوں سے اپنا پورا منہ
اور دھڑ نکال کر ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فرماتی ہیں کہ اے ذرا اُدھر

ہٹ جایئے، ہم اُدھر جائیں گے۔ یہی حالت مرزا صاحب کے محبوبہ کی ہے یعنی مرزا صاحب رقیب کے ساتھ اس کے دروازے پر کھڑے ہیں اور وہ مرزا صاحب پر یہ جتانے کے لئے کہ اُنھیں رقیب سے کوئی سروکار نہیں رقیب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی ہیں اے آپ ذرا ان سے کہئے کہ ذرا اُدھر منہ پھیر لیں ہم کو مرزا صاحب کے ساتھ جانا ہے۔ چنانچہ مرزا صاحب اس شعر میں یہی کہنا چاہتے ہیں کہ معشوق کے پوشیدہ تعلقات تو رقیب کے ساتھ ہیں لیکن بظاہر مرزا صاحب کو یہ دکھانے کے لئے کہ وہ رقیب سے پردہ کرتی ہیں رقیب کی پیٹھ مڑوا دیتی ہیں۔ اِس سے پتہ چلتا ہے کہ رقیب سے اور اُن سے جو تعلقات ہیں اُس پر پردہ ڈالنا چاہتی ہیں۔

یہ باعث نوامیدی ارباب ہوس ہے　　غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

مرزا صاحب کے اِس حسنِ طلب کی داد دیجئے کہ وہ کس خوبی سے محبوبہ کو اپنے اوپر صلواتیں سنانے سے روکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم غیروں کے سامنے غالب کو برا نہ کہا کرو نہیں تو غیر مایوس ہو جائیں گے اور دل میں کہیں گے کہ جو شخص گھر بھر کا اور پاندان کا خرچ اٹھائے ہے اس کے ساتھ جب اِن کا یہ برتاؤ ہے کہ سیدھے منہ اس سے بات نہیں کرتیں تو خدا جانے ہم لوگ جو نہ تو لے شخصے نہ خان میں ہیں، اور نہ خان کے اونٹوں میں محض اعزازی عاشق ہیں اُن پر نہ جانے کتنی صلواتیں دن رات پڑیں گی اور ان کی کیا درگت ہو گی بات یہ تھی کہ مرزا صاحب چونکہ سچے عاشقوں میں تھے اس لئے وہ عشق بازی پر خاصے پیسے خرچ کرتے تھے اور اپنی محبوبہ کی ہر فرمائش کو

پورا کرتے تھے مگر وہ اتنی بڑی چالاک تھیں کہ جس برتن میں کھاتی تھیں اُسی میں چھید کرتی تھیں مقصد یہ کہ پیسے تو مرزا صاحب دیتے تھے اور اعزازی کام کرنے والوں پر جان چھڑکتی تھیں۔

غزل نمبرہ،

کرے ہے بادہ تیرے لب سے کسب رنگ فروغ   خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گل چیں ہے

فروغ = روشنی۔ نور۔ کسب کرنا = حاصل کرنا۔ خطِ پیالہ = پیالہ کا حلقہ نما۔ نشان جو شراب کی مقدار بتاتا ہے۔

مرزا صاحب کے محبوب کا چہرہ بالکل ٹماٹر اور گلاب جیسا سُرخ تھا اور چہرہ پر جھریوں کا نام نہ تھا لوگ جب ان کو دیکھتے تو یہ تصور کرتے کہ شراب پینے کے سبب شاید چہرہ سُرخ ہے۔ مرزا صاحب کا فرمانا ہے کہ شراب پیتے وقت ان کے گلاب سے رُخسار کا عکس پیالہ میں پڑتا ہے تو حلقۂ ساغر چشمِ گلچیں بن جاتا ہے یعنی جس طرح سے پھول چنتے وقت چشمِ گلچیں میں پھولوں کا عکس پڑتا ہے اُسی طرح محبوب کے رُخسار کا عکس حلقۂ ساغر میں پڑتا ہے حالانکہ اگر مرزا صاحب نے غور کیا ہوتا تو شاید اُن کی سمجھ میں آتا کہ وہ اول تو مرزا صاحب سے چھپا کر لپ اسٹک لگاتی تھیں دوسرے اپنے دونوں گالوں پر غازہ کا لیپ کرتی تھیں جس کی وجہ سے لپ اسٹک کا رنگ گھل گھل کر شراب میں ملتا تھا جس سے شراب کا رنگ سرخ ہوجاتا ورنہ پیالے سے حلقہ نما نشان کا رخساروں سے کیا تعلق ہے

اسدؔ ہے نزع میں چل بیوفا برائے خدا   مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

مرزا صاحب بڑھاپے میں جس لڑکی سے عشق فرماتے تھے ان کے والدین مرزا صاحب
کو بالکل بے ضرر قسم کا انسان سمجھتے تھے چنانچہ جب مرزا صاحب پر نزعی کیفیت
طاری ہوئی تو انھوں نے لڑکی کے والدین کو لکھوا کر بھیجا کہ خدا کے لئے صاحبزادی
کو تھوڑی دیر کے لئے بھیجدیجئے کیونکہ دم رکا ہوا ہے وہ آجائیں تو اس
مصیبت سے نجات مل جائے مگر لڑکی نے جب سنا کہ مرزا صاحب پر نزعی کیفیت
طاری ہے تو اس کی گھگھی بندھ گئی اور وہ سوچی کہ اس وقت جانا ٹھیک نہیں
کیونکہ وہ مرنے والے کی شکل پر نظر ڈالتے ڈرتی تھی اس کے والدین یہ سمجھ
رہے تھے کہ لڑکی شرم و حیا کی بنا پر ایسا کر رہی ہے چنانچہ اس کی والدہ نے
کہا کہ اری نگوڑی خدا کے لئے چھوڑ اس حجاب وجاب کو، وہاں بڈھا مر رہا ہے
اور تو اپنے نشتر غمزے لئے کر چلی ہے۔

غزل نمبر ۲

کیوں نہ ہو چشم بتاں محو تغافل کیوں نہ ہو ۔ یعنی اس بیمار کو نظارے سے پرہیز ہے
شعراء حسینوں کی آنکھ کو نرگس بیمار یا چشم بیمار باندھا کرتے ہیں بیمار کے لئے
پرہیز ضروری ہے لہذا چشم بتاں کو نظارہ سے پرہیز ہے اور اسی وجہ سے
حسین اپنے عاشقوں کے ساتھ تغافل برتتے ہیں اور انھیں آنکھ اٹھا کر نہیں
دیکھتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب مرزا صاحب نے یک طرفہ عشق فرمایا اور فریق
مخالف نے اُن کو کسی قسم کا لفٹ نہ دیا تو مجبوراً مرزا صاحب نے کہا کہ اس کے
جواز کی صرف ایک ہی صورت ہو سکتی ہے کہ محبوب کی آنکھ کو چشم نرگس قرار دو
اور شہر بھر میں ڈگی پٹوا دو کہ وہ آشوب چشم میں مبتلا ہیں اس لئے وہ آشوب چشم

کے سبب کسی چیز کو نہیں دیکھتیں مصیبت یہ ہے کہ عشاق اپنے محبوب کی آنکھوں کو خواہ وہ ٹبن ہی کیوں نہ ہوں کبھی میخانہ سے تشبیہ دیتے ہیں اور کبھی انھیں چشم نرگس بتاتے ہیں لہذا مرزا صاحب نے بھی اپنی عزت کو بچانے کے لئے یہی مشہور کر دیا تاکہ لوگ مرزا صاحب کو احمق نہ سمجھیں۔

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی　　وائے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

مرزا صاحب کا محبوب جھٹکا کرنے پر آمادہ ہے اور مرزا صاحب چاہتے ہیں کہ وہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں رک رک کر ان کو ذبح کرے، کیونکہ مرزا صاحب زندگی بھر بیکار رہے۔ لہذا وقت کی قیمت سے وہ بالکل ہی ناواقف تھے اس لئے ان کو اس کی کیا خبر کہ اُن کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ ڈیڑھ گھنٹہ صرف ذبح کرنے میں لگائیں مگر مرزا صاحب چاہتے ہیں کہ وہ جس وقت ان کو ذبح کرتے ہوں مرزا صاحب کی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوں اور وہ مزے لے لیکر اپنی جان دے رہے ہوں۔

غزل نمبر ۷۲

دیلہے دل اگر اُس کو بشر ہے کیا کہیئے　　ہوا رقیب تو ہونا مہ بر ہے کیا کہیئے

دل دینا : عاشق ہونا۔

مرزا صاحب ایک طرف تو رقیب کو حد درجہ مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ موقع پاتے ہی ان کی محبوبہ کو اغوا کرلے گا اور دوسری طرف اپنے گھر کے آدمی جنوں اور نامہ و پیام پہنچانے والوں پر اس درجہ مہربان تھے کہ اگر ان کا قاصد اُن کے محبوب کو دیکھ کر تھوڑا بہت اس سے عشق

کر لیتا تو مرزا صاحب یہ کہہ کر اپنی فراخ دلی کا ثبوت دیتے کہ صاحب کیا کیا جائے آخر مرد ہی تو ہے اُس کو بھی میری طرح اللہ نے دل دیا ہے اور اُس کے دل میں تھوڑی بہت محبت کرنے کی صلاحیت ہے لہذا اگر بطور کمیشن وہ تھوڑا بہت عشق کر لیتا ہے تو کوئی حرج نہیں۔ مرزا صاحب حقیقتاً عربوں والی محبت کے قائل تھے۔ عربوں میں اگر کسی کی بیوی کے ہزار دو ہزار عاشق ہوتے ہیں تو وہ اس بات پر فخر کرتا ہے کہ وہ ایک ایسی عورت کا شوہر ہے جس پر انسانوں کی ایک پوری پلٹن عاشق ہے مگر ان عشاق پر ایک بندش ضرور لگی ہوتی ہے اور وہ یہ کہ وہ محبوبہ کے پنڈے پر ہاتھ نہیں دھر سکتا اور غالباً وہ رقیب سے اسی سبب سے بگڑے رہتے ہیں کہ عموماً رقیب نہایت پنڈا کھسوٹ قسم کے انسان ہوتے ہیں اور اسی لئے وہ تمام رقیبوں کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں ورنہ جو شخص اپنی محبوبہ کے حسن پر گھر کے آدمی جنوں کے دروازے کھول سکتا ہے اس کو رقیب سے کیا انکار ہو سکتا ہے۔

رہے ہے یوں گہہ و بیگہ کہ کوئے دوست کو اب   اگر نہ کہیئے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیئے

گہہ و بیگہ = یعنی ہر وقت

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کے رقیب نے محبوب کے کوچے میں کوئی لکڑی کی دکان (کیبن) خرید کر اسی میں رہنا شروع کر دیا تھا اور سویرے سے شام تک وہ اپنی کیبن (یعنی لکڑی کی دکان) میں بڑا محبوب پر مسمریزم کی مشق کیا کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ مرزا صاحب کو اُس کی یہ حرکت کیسے ناگوار نہ ہوتی کیونکہ اُس نے مرزا صاحب کو براہ راست چوٹ دینے کے لئے کوچۂ محبوب کو

اپنا گھر بنا لیا تھا۔

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب　　کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے کیا کہیے

زہے = حرفِ تحسین ہے :- کرشمہ = مجازاً کرامات و اعجاز (لغوی معنی آنکھ اور ابرو کا اشارہ یا غمزہ)

عشق میں انسان کی شکل پر ہر وقت بارہ بجے رہتے ہیں سنا ہے کہ ایک مرتبہ مجنوں صاحب کو کسی صاحب نے لاکر اُن کی جوانی سے پہلے والی تصویر دکھائی اور کہا کہ آپ اِن صاحب کو پہچانتے ہیں؟ تو مجنوں نے جواب دیا کہ یہ کوئی اچھے بھلے شریف انسان معلوم ہوتے ہیں اُس کے بعد جب اُن کے مجنوں ہونے کے بعد کی تصویر اُن کو دکھائی گئی اور پوچھا گیا کہ اور حضور! ان صاحب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ تو بولے "یہ تو کسی مدقوق یا مرحوم جانور کا ڈھانچہ ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ عاشق کا چہرہ عشق میں اتنا مسخ ہو جاتا ہے کہ اُس پر ہر وقت مکھیاں بھنکا کرتی ہیں۔ اس شعر میں مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ صاحب ہمیں تو اِس عورت نے ایسے چرکے دے رکھے ہیں اور ایسا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غلط بیانی سے کام لیتی ہے کہ ہمارے لئے مرجانے کا مقام ہے یعنی یہ خیال فرماتے کہ جب کبھی ہم ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی دُکھ بھری کہانی سنانا چاہتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ آپ کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں آپ کے امراض کا حال تو ہمیں پہلے ہی سے معلوم ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کا محبوب کچھ حکمت میں بھی دخل رکھتا تھا چنانچہ شکل دیکھتے ہی مرض کی صحیح صحیح تشخیص کر لیتا تھا۔ اور مرزا صاحب سمجھتے تھے کہ وہ بہت بڑا روشن ضمیر ہے

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسش حال کہ یہ کہے کہ سرِ رہ گذر ہے کیا کہئیے

مرزا صاحب کے مزاج اور اُن کی افتادِ طبیعت سے محبوب بخوبی واقف ہے چنانچہ مرزا صاحب جب گھر سے باہر پالکی پر نکلتے تو وہ کہاروں کو روک کر مرزا صاحب کا حال پوچھتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ مرزا صاحب گلی کوچوں میں جھوکریوں سے ملنا اپنی وضع داری کے خلاف سمجھتے ہیں دوسرے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ مرزا صاحب کے گھر پر جا کر اُن کے حال سننے کے معنی یہ ہیں کہ دس یا پانچ گھنٹے وقت ضائع کیا جائے کیونکہ مرزا صاحب کے پاس ان کے حال سے متعلق ایک پوری مجلد داستان امیر حمزہ سرہانے رکھی رہتی ہے جسے سنانے کے لئے وہ ہر وقت بے چین رہتے ہیں اور اُن کے محبوب کے پاس ظاہر ہے کہ نہ اتنا وقت ہے اور نہ اتنا فارغ کہ وہ مرزا صاحب کی اس ساری کتھا کو ڈٹ کر اُن کے سامنے سنے ۔

تھیں نہیں ہے سررشتہ وفا کا خیال ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا؟ کہئیے

مرزا صاحب ہر وقت دل کو بٹیر کی طرح موٹھ کیا کرتے ہیں اور محبوب کی بیوفائی ظاہر کرنے کے لئے ہر شخص کے سامنے پہیلیاں بجھاتے رہتے ہیں چنانچہ ایک دن مرزا صاحب نے اپنی مٹھی بند کرکے اپنی محبوبہ سے کہا بتائیے اس مٹھی میں کیا ہے اور جب اُنھوں نے کہا ہاتھی ہے تو بولے بس رہ گئیں ۔ ارے صاحب اس کے اندر سررشتۂ وفا بند ہے اس شعر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب آخر عمر میں ایسی بچکانی باتوں پر اُتر آئے تھے جو صرف بچوں ہی کو زیب دیتی ہیں ۔

غزل نمبر ۲۰۷

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی ۔ لکھ دیا منجملۂ اسباب ویرانی مجھے

مرزا صاحب اللہ میاں کے ہاں سے جب اپنی قسمت کی دستاویز لے کر چلے تو اس میں ہزاروں میل جنگل بیابان اور کوہ و دشت کے نام درج تھے اور آخر میں یہ بھی لکھا تھا کہ گھر کی تباہی کی ساری ذمہ داری ان ہی حضرت پر عاید ہوتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی پیمائش سے متعلق کسی پٹواری کے کاغذات فرشتوں کے پاس رکھے ہوئے تھے انھیں مرزا صاحب عجلت میں اپنا خط تقدیر سمجھ کر اٹھا لائے اور جب وہاں تلاش ہوئی کہ وہ جنگل اور بیابانوں کی پیمائش کے کاغذات کیا ہوئے تو معلوم ہوا کہ مرزا صاحب اُسے اپنا خط قسمت سمجھ کر اٹھا لے گئے ہیں چنانچہ حکم ہوا کہ اگر انھوں نے یہ حرکت کی ہے تو زندگی بھر اس کی سزا یہ ہے کہ آوارہ گردی اور ویرانی میں بسر کریں۔

اسی سبب سے دنیا میں آنے کے بعد مرزا صاحب کا گھر خود انھیں کے ہاتھوں تباہ ہو کر رہ گیا۔

نہ عدم آنے کا وفا کیجئے یہ کیا انداز ہے ۔ تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب ہر وقت گھر سے غائب رہتے تھے اس لئے اُن کی بیوی نے اُن کی محبوبہ کے پاس لکھ کر بھیجا کہ بہن کچھ دیر تو مرزا صاحب کو گھر میں رہنے دیا کرو ورنہ گھر کا سودا سلف کون لائے گا تین چار روز ہوئے جب سے ماما بھی نہیں آ رہی ہے جو کھانے پینے کا سامان گھر کے لئے لادے اس کے جواب میں ان کی محبوبہ نے مرزا صاحب کی بیوی کو لکھ بھیجا

کہ آپ گھبرائیں نہیں میں ایک ایسا انتظام کئے دیتی ہوں کہ اس کے بعد
سے مرزا صاحب گھر کے باہر قدم نہ رکھیں گے چنانچہ اُس نے مرزا صاحب
کو ایک علیحدہ خط لکھ بھیجا کہ آپ گھر سے کہیں نہ جائیے۔ میرا انتظار کیجئے میں کسی وقت
بھی آسکتی ہوں۔ چنانچہ مرزا صاحب نے اُس خیال سے کہ نہ جانے کس وقت
وہ تشریف لے آئیں گھر سے باہر نکلنا بند کر دیا اور چوبیسوں گھنٹے گھر کے دروازے
بیٹھے محبوبہ کا انتظار کرنے لگے جب مرزا صاحب کو ہفتوں اس انتظار میں گذر
گئے تو انھوں نے لکھ بھیجا کہ واہ حضرت واہ آپ نے تو چرخ کے بازی کی انتہا
کر دی اور ہم کو ہفتوں سے اچھا بھلا گھر میں قید کر رکھا ہے نہ آج آتی ہیں اور نہ
کل، ہماری حیثیت تو اب خود اپنے گھر کے دربان کی سی ہو کر رہ گئی ہے۔

غزل نمبر ۲۴

یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہئے
رشک آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

آشفتگی = دیوانگی - پریشانی۔

مرزا صاحب عشق و محبت کے ہاتھوں جب اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے
اور دیوانگی پر اُتر آئے تو اُن کو رقیب نے پکڑوا کر قید کرا دیا زندان
میں کچھ عرصہ قیام فرمانے کے بعد جب طبیعت میں لاؤ لاؤ پیدا ہوئی تو وہاں
بھی ایک ہنگامہ بپا کر دیا جس کے سبب وہاں سے بھی نکالے گئے اور وہاں
سے نکلنے کے بعد آپ نے پھر زمین کا گز بنکر صحراؤں اور جنگلوں کی پیمائش
شروع کر دی اور ادھر ادھر گھومتے رہے مگر زنداں کے قیام میں یہ فائدہ
تھا کہ دونوں وقت پیٹ بھر کھانا مل جاتا تھا اب یہاں جو صحرا نوردی ہاتھ لگی

اور بھوک نے پریشان کیا تو پھر ان کو زنداں یاد آنے لگا اور سوچے کہ اس صحرا سے تو بہر حال زنداں کی زندگی ہزار گنا غنیمت تھی کہ کھانے پینے کو تو کچھ مل جاتا تھا مگر یہاں صحراؤں میں کون ایسا سگا بیٹھا ہے جو کھانا لا کر دے گا۔ غرض مرزا صاحب کی اس زنداں نوازی پر ہم کو دو افیمیوں کا ایک قصہ یاد آگیا۔ دو افیمی ایک جگہ مار پیٹ کر رہے تھے پولیس والوں نے پکڑ کر دونوں جھاپڑ رسید کئے اور دونوں کو جیل بھیج دیا۔ ایک دن ان دونوں نے جیل میں لڑنا شروع کر دیا۔ اس پر ایک افیمی نے بگڑ کر کہا "اب کیا یہاں سے بھی نکلوائے گا" یہی حال مرزا صاحب کا ہوا کہ انھیں آشفتگی کے ہاتھوں زنداں کی اچھی بھلی زندگی سے دست کش ہونا پڑا۔

دل لگا کر آپ بھی غالبؔ مجھ ہی سے ہو گئے　　عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

مرزا صاحب اس شعر میں خود اپنے کاندھے پر رکھ کر اپنے خلاف بندوق پھڑا رہے ہیں۔ عشق کرنے سے پہلے مرزا صاحب عشاق کو چٹکیوں پر اڑاتے تھے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر عشاق کو شیطان انگلی دکھاتا ہے تو انھیں چاہئے کہ شادی بیاہ کر لیں اس عشق کی حماقت میں تو مبتلا نہ ہوں لیکن جب جوان ہونے کے بعد خود عشق کے چکر میں مبتلا ہوئے تو اب خود اپنے سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ کیئے مرزا صاحب پہلے تو آپ عشاق کا مذاق اڑاتے تھے اور اب جو آپ پہ عشق جوڑی بخار کی شکل میں مسلط ہوا ہے تو سٹی بھی گم ہے اور خیال یار کا بھار الئے بغیر کسی کروٹ چین نہیں مل رہا ہے۔

غزل نمبر ۷۵

قدِ گیسو میں قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے   جہاں ہم ہیں، دار و رسن کی آزمائش ہے

رسن = ڈوری۔ یہاں مراد پھانسی سے ہے۔ دار = نوکدار لکڑی جس کو زمین میں گاڑ کر مجرم کی جان لی جاتی ہے مگر اب یہ لفظ سولی اور پھانسی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

مرزا صاحب زندگی بھر مجنوں و فرہاد کو اپنے عشق کے مقابلے میں لونڈا سمجھتے رہے اور اُن کو نہایت گھٹیا اور چھوٹے درجے کے عاشقوں میں شمار کرتے رہے قیس اور کوہ کن کے عشق کا معیار اتنا لیلیٰ اور اتنا شیریں تک محدود تھا اور ان کے عشق کی لمبائی چوڑائی صرف محبوبہ کے قد و قامت اور اس کی زلفوں تک محدود رہی دونوں اپنی اپنی محبوباؤں کی زلفوں میں جھولے ڈال کر پینگ لیتے رہے مگر مرزا صاحب کا عشق اُن کے عشق سے زیادہ سنگین تھا اور یہ ہمیشہ اپنے عشق کی پیمائش پھانسی پانے والی ڈوری یا اُس نوکدار لکڑی سے کرتے تھے جس کو زمین میں گاڑ کر سولی دی جاتی ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اِن معنوں میں مرزا صاحب نے فرہاد اور مجنوں دونوں کی دُموں پر پیر رکھ دیا مقصد یہ کہ مجنوں اور کوہ کن کا عشق محض مجازی تھا اور ہم عشق حقیقی کے گھوڑے پر سوار ہیں۔

پڑا رہ اے دلِ وابستہ بیتابی سے کیا حاصل   مگر پھر تابِ زلفِ پُر شکن کی آزمائش ہے

وابستہ = بندھا ہوا۔ تاب = طاقت :۔ مگر

جس طرح لکڑی کے گٹھر کو رسی سے باندھ دیتے ہیں اسی طرح عشاق

کا دل معشوق کی گھوڑی کی دُم سے زیادہ بڑی اور مضبوط زلفوں سے کسا پڑا رہتا ہے عشق کرنے کے بعد مرزا صاحب کا دل بھی عام عشاق کی طرح ایک زلف گرہ گیر سے بندھا پڑا ہے مرزا صاحب دل سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ اب جب تجھ سے ہزار بار ہم اُچک پھاند کرنے کو منع کر چکے تھے تو اس وقت تو نے ہماری بات کو گدھے کی لات سمجھا اب تیری یہی سزا ہے کہ بندھا پڑا رہ اب چیخنے چلانے اور کلا بازی سے کوئی نتیجہ نہیں اب تو تیری اُچک پھاند سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تو اگاڑی پچھاڑی تڑا کر بھاگنے کے چکر میں ہے اور زلف یار کے بالوں کی مضبوطی کی آزمائش کر رہا ہے مگر تجھ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان حرکتوں سے جو تو کر رہا ہے زلف کے بندھن ٹوٹ نہیں سکتے ۔

رگ و پے میں جب اترے زہر غم تب دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

رگ و پے ۔ رگ و ریشہ پورا جسم :-

جس طرح افیونی بسر دن افیون کھا جاتا ہے مگر اس پر زہر کا ذرہ برابر اثر نہیں ہوتا اسی طرح عشاق ہر وقت اپنی جیبوں میں جملہ غموں کے زہر کی پڑیا ڈالے رہتے ہیں اور اسے پھانکتے رہتے ہیں بلکہ ان کا کہنا ہے کہ وہ اسی زہر کے سہارے زندہ رہتے ہیں مگر یہ زہر معمولی قسم کا زہر نہیں ہوتا اتنا تیز ہوتا ہے کہ اگر رستم جیسے بھی کھالیں تو انتقال فرما جائیں اس کی تلخی اور اس کے زہریلے پن کو صرف عاشقان صادق ہی برداشت کر سکتے ہیں مرزا صاحب کو

جب اناڑی عاشقوں نے اِس قسم کا زہر کھاتے دیکھا تو اُنھیں بھی شیطان نے انگلی دکھائی اور دو چار بوالہوسوں نے دم کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہونے کی کوشش کی لیکن انھیں ابھی چند ہی روز عشق بازی کرتے گذرے تھے اور عشق کی تلخی صرف کام و دہن تک محدود تھی کہ اُن کا پیٹ پھولنا شروع ہوا اور انھوں نے چلانا شروع کیا "ارے مرے۔ ارے کوئی بچاؤ"۔ مرزا صاحب رقیب کو اِس طرح تڑپتے دیکھ کر فرماتے ہیں کہ ابے ابھی کیا ہے ابھی تو صرف زبان پر تلخی ہی محسوس ہو رہی ہے جب یہ تلخی حلق کے نیچے اترے گی تب دن میں تارے نظر آجائیں گے۔ کوے اگر ہنس کی چال چلنے لگیں تو اُن میں اور ہنس میں فرق ہی کیا رہے۔

غزل نمبر ۹۰

وہ بدخو اور میری داستانِ عشق طولانی — عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

مرزا صاحب اِس شعر میں اپنی داستانِ عشق کا حجم واضح طور پر بیان کر رہے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معشوق مرزا صاحب کو اذیتیں پہنچانے میں بالکل حق بجانب تھا کیونکہ مرزا صاحب کی داستان غالباً طلسم ہوشربا اور داستانِ امیر حمزہ دونوں کو ملانے کے بعد بھی اس سے کچھ زیادہ طویل و ضخیم تھی جس کے سننے کے لئے عمر نوح بھی ناکافی ہے ظاہر ہے کہ محبوب اگر اپنی پیدائش کے وقت سے لیکر جوانی تک اور جوانی سے لے کر بڑھاپے تک اُس شیطان کی آنت کو سنتا تو بھی صرف دیباچہ تک پہنچ پاتا اور اصل داستان اُس کے مرحوم ہونے کے بعد ہی شروع ہوتی اسی لئے وہ اُسے سننے کو کبھی

تیار نہ ہوتا تھا کیونکہ اُس کو دنیا میں علاوہ مرزا صاحب کی داستان سننے کے اور بھی بہت سے کام تھے چنانچہ جب مرزا صاحب قاصد سے کہتے کہ بھیا ذرا ہماری مختصر سی داستان ان کو پہنچا دو تو وہ بے حد گھبراتا کیونکہ اوّل تو وہ مرزا صاحب کی محبوبہ کی بدمزاجی سے واقف تھا۔ اس لئے یونہی اُس کا سامنا کرتے اس کی روح فنا ہوتی تھی دوسرے مرزا صاحب جو چیز مختصر کہہ کر بھیجتے وہ ان کی داستان کے صرف چند عنوانات ہوتے جو تھیلے میں بھی بمشکل سما پاتے اور جن کو دیکھتے ہی ان کی محبوبہ آپے سے باہر ہو جاتی اور منہ سے نہ جتنے کی صورت میں گدھے کے کان امیٹھنا شروع کر دیتی اپنی قاصد پر برس پڑتی کہ یہ کہاں کی خرافات روز روز لایا کرتے ہو

اُدھر وہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

مرزا صاحب کا معشوق اُن سے پہلے نفرت کرتا تھا اور اب اس کی طرف سے بدگمان بھی ہے اور مرزا صاحب عشق میں گھلتے گھلتے اس درجہ کمزور ہو چکے ہیں کہ ان کے منھ سے ٹھیک طریقہ پر بات نہیں نکل پاتی نتیجہ یہ ہے کہ جب وہ آتی ہے اور مرزا صاحب پر قہر آلود نگاہیں ڈال کر بیٹھ جاتا ہے تو مرزا صاحب چونکہ گھنٹہ گھنٹہ دو دو گھنٹے کے بعد ایک بات کر پاتے ہیں اس لئے وہ جھک ہو کر اپنے گھر چلی جاتی ہے نتیجہ یہ ہے کہ مرزا صاحب نہ اُس سے کچھ کہہ پاتے ہیں اور نہ وہ مرزا صاحب سے مخاطب ہوتی ہے۔ مرزا صاحب اس شعر میں اسی کا رونا روتے ہیں کہ صاحب جب محبوبہ آتی ہے تو ہم دونوں گم ترد دکھن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں کیونکہ وہ بدگمانی کے سبب ہم سے کچھ پوچھتی نہیں

اور ہم ناتوانی کے سبب اُس سے کچھ کہہ نہیں پاتے۔

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن   وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

نظارگی = دیدہ بازی۔ نظارہ کرنے والا۔

مرزا صاحب نے چونکہ بیعنامہ اپنے نام کرا لیا ہے اس لئے انھوں نے شہر بھر میں ڈگی پٹوادی ہے کہ خلق خدا کا مالک ہندوستان ہر خاص و عام عشاق کو بہ بانگ دہل اطلاع دی جاتی ہے کہ وہ آئندہ سے ہماری محبوبہ پر کسی طرح کی نیک و بد نگاہ نہ ڈالیں ورنہ اگر وہ ان حرکات کے مرتکب ہوں گے تو اُنھیں قرار واقعی سزا دی جائے گی اس میں ہما شما کی قید نہیں۔ یہاں تک کہ اگر ما بدولت بھی کسی وقت اس قسم کی نظریں ڈالتے دکھائی دیں گے تو وہ بھی مجرم قرار دیئے جائینگے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے عشق کرنے کے بعد اپنی محبوبہ کو کسی گھڑے یا مٹکے میں بند کر دیا تھا تاکہ چرند پرند انسان اور حیوان کسی کی نظر اُن پر نہ پڑنے پائے۔ اس میں رشک کی انتہا دکھائی ہے اور خود اپنی ذات کو بھی نہیں بخشا ہے۔

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبرد عشق میں زخمی   نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

اس شعر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے جس لڑکی سے محبت شروع کی تھی اُس کی اطلاع اس کے والدین کو ہو گئی اور ایک اچھی کھلی فوجداری کی نوبت آ گئی جس میں مرزا صاحب چونکہ تنہا تھے لہٰذا ان کے پیر شدید طور پر زخمی ہو گئے اور نہ جانے پیر کے کس جوڑ پر کاری ضرب لگی کہ نہ تو وہ بھاگ سکتے تھے اور نہ ان کے والدین کی موجودگی میں محبوبہ ہی کو اطلاع کرا سکتے تھے

کہ ملاحظہ ہو وفاداری کہ اس حالت میں بھی اپنی جگہ پر اسی طرح ڈٹے ہوئے ہیں۔ غرض عجیب نہ جائے ماندن، نہ پائے رفتن والی منزل میں پھنسے پڑے ہیں۔

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

مرزا صاحب اس بری طرح اپنی محبوبہ پر جان دیئے ہوئے تھے کہ اس کو اپنا پیچھا چھڑانا دشوار تھا حالت یہ تھی کہ اگر وہ بد نصیب کبھی مرزا صاحب کی سو طرح خیریت دریافت کرنے آتی یا اپنے کلام پر اصلاح لینے پہنچ جاتی تو مرزا صاحب اس خوف سے کہ بانی امان اللہ کا لفظ تک زبان پر نہ لاتے کہ انھیں معاذ اللہ اللہ میاں پر بھی شک تھا کہیں وہ اٹھا نہ لیں، اور مرزا صاحب اصل سے سود کے ان سے محروم ہو جائیں۔ چنانچہ ایک طرف تو شک و شبہ کا یہ عالم اور دوسری طرف محترمہ کچھ ایسی رنگین مزاج واقع ہوئی تھیں کہ دن بھر رکشا پر لدی لدی ایک سینما سے دوسرے سینما اور دوسرے سینما سے تیسرے سینما صدقے ہوتی پھرتی تھیں اور رقیب کو بغل میں بٹھائے بٹھائے گھومتی رہتی تھیں ان حالات میں مرزا صاحب واقعتاً جس قدر بھی رشک و حسد کی آگ میں نہ جلتے کم تھا کیونکہ جو شخص محبوبہ کو خدا تک کو سونپتے ڈرتا ہو وہ بھلا رقیب کے بغل میں انھیں کیسے دیکھ سکتا ہے

غزل نمبر ۷

نہ جانوں کیسے مٹے داغِ طعنِ بدعہدی ... تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے

ورطہ: مقامِ ہلاکت۔ گرداب: بھنور۔ آئینہ: مراد اس سے آئینہ کی آب و جلا ہے۔

خدا جانے مرزا صاحب کا محبوبہ کس تعلقدار گھرانے کی تھی کہ اگر وہ بدعہدی کے الزام کا ... اور دور کرنا چاہتی تھی تو آپ آئینہ سے اُن دھبوں کو دھوتا تھا مگر آئینہ کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ وہ بجائے اس کے کہ بدعہدی کے داغ مٹائے معشوق کے حق میں دربطہٗ ملامت بن جاتا تھا یعنی دھبوں پر چمک پیدا کر دیتا تھا مقصد یہ کہ مرزا صاحب کی محبوبہ جب کنگھی چوٹی اور بناؤ سنگھار کر کے آئینہ کے پاس کھڑی ہوتی ہے اور اپنی صورت دیکھتی ہے تو اس کو اپنا عہد جو اس نے مرزا صاحب سے کیا تھا یاد آ جاتا ہے اور اس پر اس کو جدو رجہ ندامت ہوتی کہ دیکھو تو میں نے مرزا صاحب کے یہاں جانے کا وعدہ کیا تھا اور انھوں نے اس سلسلے میں چائے اور ناشتہ کا انتظام بھی کیا ہو گا مگر اتفاق سے یہی سینما کا وقت ہے اور ایک اچھی فلم آئی ہوئی ہے جس کی وجہ سے مجھے اپنا وعدہ ترک کرنا پڑ رہا ہے اب سیرے وہ جانے سے مرزا صاحب نجانے اپنے دل میں کیا خیال کریں گے مگر بہر حال حرج نہیں فلم بھی مرزا غالبؔ ہی کی ہے مرزا صاحب سے کہہ دیں گے کہ صاحب آپ سے ملاقات گھر پر نہیں کی تو اسکرین پر تو بہر حال ہو ہی گئی کیونکہ جس وقت آپ کے یہاں آنا تھا اُسی وقت آپکی فلم "مرزا غالبؔ" لگی ہوئی تھی اس لئے ہم سوچے کہ چلو ایک پنتھ دو کاج ۔ مرزا صاحب کی بات بھی رہ جائے گی اور فلم بھی دیکھ لیں گے ۔

غزل نمبر ۸۷

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے   میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

مرزا صاحب عشق میں اس قدر لاغر ہو گئے ہیں کہ اب خردبین سے بھی نہیں دیکھے جا سکتے ۔ لہٰذا مرزا صاحب اپنے محبوب کو ایک خط میں لکھتے ہیں

کہ ارے صاحب اب تو آپ مجھے اپنی بزم میں آنے کی اجازت مرحمت فرمائیں اور یہ خیال اپنے دل سے بالکل نکال دیجئے کہ آپ کی رسوائی ہوگی اس وجہ سے کہ میں اب آپ کے عشق میں اس درجہ نحیف و لاغر ہو گیا ہوں کہ اگر آپ کی محفل میں پہنچ جاؤں تو لوگ مجھے دیکھ بھی نہ پائیں گے مگر محبوب غالباً مرزا صاحب کا خون اپنی گردن پر لینا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اگر مرزا صاحب آ گئے اور کسی کا پیر و یر پڑ گیا تو مرزا صاحب کا خون بلا سبب میری گردن پر ہوگا۔

یاں تلک میری گرفتاری کا سے وہ خوش ہے کہ میں　　زلف اگر بنجاؤں تو شانہ میں الجھا دے مجھے

مرزا صاحب کی محبوبہ کے سر پر غالباً بال اتنے گھنے اور اتنے لمبے ہیں کہ وہ اُن بالوں سے مرزا صاحب کی مشکیں کسے ہوئے ہے اور مرزا صاحب جھٹکے پر جھٹکے دے رہے ہیں مگر وہ چھوڑنے کا نام نہیں لے رہی ہے۔ اب مرزا صاحب کی رہائی کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ یا تو وہ یعنی انکی محبوبہ سر پر استرا پھروا لے اور اپنے سر کو ٹینس لان بنوا لے یا پھر زلفوں کو جھٹک کر مرزا صاحب کو اس طرح نکال کر پھینک دے جس طرح بال سے جوں نکال کر پھینکی جاتی ہے مگر مرزا صاحب اس بری طرح اُس کی زلفوں میں الجھے پڑے ہیں کہ ان کی آزادی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور اُن کی حیثیت مثل ایک شانے کے ہوگئی جو اُس کے بالوں میں الجھا پڑا ہے۔

غزل نمبر ۹۷

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے　　تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

اس شعر کے دونوں مصرعوں میں "آگے" اور "پیچھے" کے الفاظ میں ایک

طرح کا مرزا صاحب نے شاید اس شعر کی اگاڑی پچھاڑی پر غور نہیں کیا ورنہ وہ اس طرح نہ کہتے۔ بہرحال مرزا صاحب کی محبوبہ ان کے قریب آتے گھبرا کیونکہ مرزا صاحب اس کے سامنے اپنی طویل داستان لے کر بیٹھ جاتے تھے جس سے وہ حد درجہ پریشان اور مضطرب ہو جاتی مگر اس کے اضطراب اور بے چینی کا مطلب مرزا صاحب یہ لیتے تھے کہ جیسے وہ خود مرزا صاحب پر ہزار جان سے عاشق ہے اور ان کے لئے مضطرب اور بے چین رہتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ مرزا صاحب اس کے چلے جانے کے بعد اس کے فراق میں بے چین اور مضطرب رہتے تھے چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے دوست اپنی غیر موجودگی میں میرے اضطراب اور پریشانی کی حالت مجھ سے مت پوچھ جس طرح تو میرے سامنے اگر بے چین ہو جاتا ہے اسی طرح میرا بھی حال ہے کہ میں تیری عدم موجودگی میں مسلسل پھیکے نالے اور سیٹھی آہیں نشر کیا کرتا ہوں۔

نفرت کا گماں گذرے ہے میں رشک سے گذرا کیونکر کہوں لو نام نہ اس کا میرے آگے

مرزا صاحب نے محبوبہ کو اپنی ملکیت سمجھ رکھا ہے اور اب چاہتے ہیں کہ کوئی دوسرا شخص اس کا نام تک اپنی زبان پر نہ لائے اور اگر کوئی اس کا نام لیتا ہے تو مرزا صاحب کو سخت ناگوار ہوتا ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ چونکہ ابھی نکاح نہیں ہوا ہے اس لئے مرزا صاحب اپنی اس رجعت پسندی کا ذکر دوسروں سے کر بھی نہیں سکتے کیونکہ اگر اس قدامت پسندی کی اطلاع لڑکی والوں کو ہو گئی کہ مرزا صاحب ابھی سے دوسروں کو لڑکی کا نام لینے سے روکتے پھرتے ہیں تو وہ یہ خیال کریں گے کہ جب نکاح سے پہلے وہ نام لینے تک کے روادار نہیں ہیں تو ظاہر ہے

اُس کے بعد تو وہ عزیز و اقارب سے ملنا جلنا بند کرا دیں گے۔ سینما بازی اور کھیل تماشے تو دور رہے۔

غزل نمبر ۸

کہو جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے   تمھیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے

مرزا صاحب کی داستانِ عشق کیا ایک اچھی بھلی امیر حمزہ کی داستان تھی جسے وہ ہر وقت لئے بیٹھے رہتے تھے اور اس انتظار میں رہتے تھے کہ محبوبہ آئے تو یہ اس کے سامنے اپنی ساری کتھا بیان کرنا شروع کر دیں ظاہر ہے کہ محبوبہ کے پاس علاوہ مرزا صاحب کے عشق کے اور دنیا کے ہزار کام تھے مثلاً گھر میں جھاڑو دینا برتن مانجھنا۔ اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو کپڑے بدلوانا اور چھوٹی بچی کو کھلانا چنانچہ مرزا صاحب جب داستان بیان کرتے تو سب سے پہلے ترکوں کا حال بیان کرتے جہاں سے اُن کے ماں باپ چلے تھے اس کے بعد ماں باپ کا حدود اربع اور اُن کے ہندوستان آنے کا واقعہ اور اُن کے قیام کے بعد اپنی ولادت اور ولادت کے بعد جوانی کا ذکر اور اس کے بعد اپنا عاشق ہونا۔ ظاہر ہے کہ وہ اس طول طویل داستان کو سُن کر بیزاری کے انداز میں کہتی کہ ذرا مختصر فرمائیے تو سُنا جائے اِس پر مرزا صاحب بگڑ جاتے اور فرماتے کہ جب آپ کی بیزاری کا یہ عالم ہے کہ داستان شروع کرتے ہی آپ کی طرف سے مطالبہ ہوتا ہے کہ مدعا بیان کیا جائے اور بغیر حالات اور واقعات کو علم میں لائے یہ کہہ دیا جائے کہ میں آپ سے نکاح کرنا چاہتا ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے۔

یہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں   مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ عاشق تو بہرحال خوشامدی ہوتا ہی ہے وہ ہر بات پر جا اور بے جا معشوق کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے مثلاً اس نے کہا کہ آپ کو مہینہ ہوگیا تھا بولے بجا فرمایا اُس نے کہا آپ احمق ہیں اور عقل سے قطعی بے گانہ ہیں بولے بالکل درست فرمایا۔ ایسی صورت میں اگر معشوق ان کو ظالم ستمگر۔ احمق کہہ کر ان سے اقرار لے لے کہ واقعی آپ احمق ہیں تو اس صورت میں عاشق صاحب فرماتے ہیں کہ ہم کریں تو کیا کریں کیونکہ ہم یہ تو سمجھتے ہیں کہ معشوق غلط کہہ رہا ہے مگر اس کا معاملہ یہ ہے کہ وہ زبردستی ایک غلط بات کی خود ہم ہی سے تائید کراتا ہے تو اس کے حکم کے غلام ہونے کی صورت میں ہم کریں تو کیا کریں سوائے اس کے کہ کہہ دیں کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں ٹھیک ہی ہوگا۔ حالانکہ ہم نہ چور ہیں اور نہ اُچکے نہ احمق ہیں اور نہ پاگل مگر اُس نے ہم کو ایسے ادب میں ڈال رکھا ہے کہ ہم سے انکار کرتے بن نہیں پڑتا۔

رہے نہ جان تو قاتل کا خوں بہا دیجے   کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

خوں بہا : خون کی قیمت۔ وہ رقم جو قاتل سے مقتول کے ورثہ کو دلائی جاتی ہے۔

اس شعر میں مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ صاحب دنیائے الفت کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے کہ جس میں تجربہ کی مار کی مار کھائیے اور الٹے پٹوائی کے دام گرہ سے دیجئے ورنہ عام دستور تو یہ ہے کہ قاتل کو مقتول کے

پس ماندگان کو خون بہا ادا کرنا پڑتا ہے مگر عشق کی دنیا میں قاتل اگر مقتول کا پھر سا بھی کھینچ دے تو الٹے مقتول سے خوں بہا وصول کیا جاتا ہے یعنی مار کی مار کھائیے اور پیٹنے والے کے ہاتھ پیروں میں مالش کرائی کر دام بھی ادا کیجیے۔

غزل نمبر ۱۸

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے ۔ دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

دھو یا جانا = بے شرم و بے باک ہونا۔ پاک = آزاد

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ جب تک عشق میں رونی صورت بنائے رہیے اور پورے نظم و ضبط کے ساتھ محبوبہ کی ڈانٹ ڈپٹ کھاتے جائیے اس وقت تک کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ آپ بیچتے کیا ہیں؟ چنانچہ مرزا صاحب نے جب دنیائے عشق میں قدم رکھا تو اپنا دل مسوسے بیٹھے رہے لیکن جب ان سے ضبط نہ ہو سکا تو انھوں نے رونا شروع کر دیا مگر اس کے بعد بھی جب محبوبہ نے کوئی اثر قبول نہ کیا تو وہ روتے روتے بے حیائی پر اتر آئے اور انھوں نے بغیر اس کی پروا کیئے کہ ان کے رونے سے محبوبہ کی رسوائی ہوگی انھوں نے گلی کوچوں اور چوراہوں پر ڈوگی ہیبٹ پیٹ کر آہ و بُکا شروع کر دی مقصد یہ کہ جب تک مرزا صاحب دل ہی دل میں گھُولتے رہے اُس وقت تک کسی نے نہیں پوچھا لیکن اب جب انھوں نے رونا شروع کیا تو ان کا عشق واضح ہو گیا اور جب لوگوں نے جا کر محبوب کو اس کی اطلاع کی تو اس نے کہا کہ ہمارے پاس ان کے اِس شہدپن اور ریچھ پن کا کیا علاج ہے وہ جو کچھ کر رہے ہیں کرنے دیجیے وہ اب شرم و حیا کے حدود سے آگے بڑھ چکے ہیں

اور ان کی آنکھ کا پانی مر چکا ہے۔

صرف بہائے مے ہوئے آلاتِ مے کشی تھے یہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

بہا = قیمت :- آلاتِ مے کشی = ساغر و مینا و صراحی

مرزا صاحب کے پاس شراب نوشی شروع کرنے کے بعد کچھ نہیں رہا تھا بیوی کے پاندان سے لے کر انھوں نے مے کشی کے آلات تک بیچکر شراب پی ڈالی تھی لہذا فرماتے ہیں کہ اللہ کا شکر ہے کہ آلاتِ مے کشی اور شراب والے کے دام نکل گئے اور دونوں حساب پاک ہو گئے۔

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

رسوائے دہر = زمانے میں بدنام :- طبیعتوں کا چالاک ہونا = تیز و طرار ہونا

وہ جو مثل مشہور ہے کہ ناک ٹوٹی تو ٹوٹی نکھٹوں کے عذاب سے تو چھوٹی۔
یہ شعر اسی قسم کا ہے مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اگرچہ دنیا بھر میں بدنام ہوئے لیکن عشق میں اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ بڑے بڑے ریگستانوں اور جنگلوں کی سیر کر ڈالی اور ان کی لمبائی چوڑائی معلوم ہو گئی اور تجربات اور معلومات میں اضافہ ہونے کے علاوہ طبیعت میں ایک قسم کی شوخی اور طراری پیدا ہو گئی اور رگ و پٹھوں میں چستی آ گئی۔

کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گلہ کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کی محبوبہ نہایت سخت آتشیں شیشوں کی عینک اپنی آنکھوں پر چڑھائے رہتی جس سے ہر سامنے کی چیز جل کر خاک ہو جاتی تھی چنانچہ ایک دن مرزا صاحب دوپہر میں لٹھیا ٹیکتے اس کے گھر روانہ ہوئے تاکہ وہاں

پہنچکر اُس سے کہیں کہ صاحب آپ ہمارے یہاں نہیں آئے کب سے آنکھیں آپ کے دیدار کو ترستی ہیں اور اس سلسلہ میں یہ بھی چاہا تھا کہ محبوب سے کہیں کہ صاحب آپکے تغافل اور بے توجہی کا عالم اب یہ ہے کہ آپ دکھائی نہیں دیتے لیکن جب مرزا صاحب اس کے قریب پہنچے اور اُس نے اپنی آتشگیر شیشوں والی عینک لگا کر مرزا صاحب کو دیکھا تو مرزا صاحب اُس شیشے کی آگ برداشت نہ کرسکے اور جلکر خاکستر ہو گئے۔

غزل نمبر ۸۲

ہمنشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزم عیش دوست وہاں تو میرے نالہ کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ایک عاشق صاحب اپنے محبوب کی بزم میں جہاں نوٹنکی قسم کی کوئی چیز ہو رہی تھی پہنچ گئے اور انھوں نے رو رو کر زمین و آسمان سر پر اٹھا لیا لوگوں نے چلانا شروع کیا ابے بیٹھا کیا ہلڑ مچا رہا ہے سارا نوٹنکی کا مزہ کرکرا کئے دے رہا ہے اُدھر محبوب کا یہ عالم کہ وہ مارے غصّہ کے دانت پیس رہا ہے اور بس نہیں کہ یہ عاشق صاحب پکڑ لیں تو ان پر کتے چھوڑ وادے۔

چنانچہ ایک صاحب از راہ ہمدردی عاشق کے پاس آکر کہنے لگے کہ ابے کیا ہلڑ مچا رہا ہے اور سارا مزہ کرکرا کئے ہوئے ہے اس پر عاشق صاحب فرماتے ہیں۔

اماں: کہاں کی باتیں کر رہے ہو تم کو نہیں معلوم کہ اُن کو میرے رونے پیٹنے سے مزہ آرہا ہے اور اُن کی دلی خواہش ہے کہ میں زندگی بھر اسی طرح روتا رہوں۔ میں چونکہ معشوق کی فطرت سے واقف ہوں اس لئے میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ میرے رونے پیٹنے سے اُن کو نوٹنکی کے گانے سے زیادہ لطف آرہا ہے اور میرے نالے افزائشِ نشاط کا موجب ہیں واقعہ یہ ہے کہ میرے نالوں سے اور نوٹنکی کی تانوں سے

مل کر جو نغمہ پیدا ہو رہا ہے اس سے وہ بہت زیادہ لطف اندوز ہو رہا ہے۔

غزل نمبر ۸۳

عرضِ نازِ شوخیٔ دنداں برائے خندہ ہے   دعویٔ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے

عرض : ظاہر کرنا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب جن محترمہ سے محبت فرماتے تھے اُن کے پورے چہرے میں سے دیگر صرف دانت ہی خوبصورت تھے اور بقیہ چہرہ تو جیسا کچھ بھیانک تھا وہ تھا ہی۔ چنانچہ مرزا صاحب ظاہر ہے کہ اُن کے ناک کان اور آنکھ کی کیا تعریف کرتے تھے لے دے کر صرف ان کے دانتوں کی خوبصورتی اور شوخی ہی کی تعریف کرتے جس پر وہ خود بھی اتراتی مرزا صاحب ان کی اس اتراہٹ پر ہنس کر اکثر فرماتے کہ یہ جو تم دانتوں پر اتنا گھمنڈ کرتی ہو یہ گھمنڈ اس وجہ سے مضحکہ خیز ہے کہ ایک دن یہ سارے کے سارے دانت گر جائیں گے اور تم میری طرح پوپلی ہو کر رہ جاؤ گی اور اُس کے بعد یہ سارے غمزے اور شوخیاں خاک میں مل جائیں گی لہذا ان دانتوں پر اترانا ویسا ہی احمقانہ فعل ہے جس طرح کہ لوگ آپس میں بیٹھ کر اپنی یکجائی پر خوش ہوتے ہیں کیونکہ دانتوں کی طرح دوست احباب کی جمعیت بھی ناقابل بھروسہ ہے اور وہ بھی دانتوں کی طرح درہم برہم ہو کر رہ جائیگی۔

غزل نمبر ۸۴

تا کجا اے آگہی رنگِ تماشہ باختن   چشمِ وا گردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

آگہی : آگاہی۔ غفلت کی ضد ؛۔ رنگ : یہ لفظ فارسی میں اکیس معنوں میں آتا ہے۔ اور فارسی میں اس لفظ کے ایسے بھی معنی ہیں جو ایک دوسرے

کی ضد واقع ہوئے ہیں جیسے لطف و سرور اور رنج و غم ۔
باختن = کھیلنا۔

مرزا صاحب نے غالباً یہ شعر اپنی آخری عمر میں کہا ہے جب وہ عشق و محبت کی دنیا سے کنارہ کش ہو چکے تھے اور دنیا کی ہر چیز کو وہ عارضی سمجھتے تھے چنانچہ فرماتے ہیں کہ جب تک انسان دیکھا کرتا ہے اور اس کی آنکھوں کی بینائی کام کرتی ہے وہ سمجھتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔ آنکھ کا بند ہونا موت کی علامت ہے۔ اب مرزا صاحب کہتے ہیں کہ اے انسان کب تک تو اس دنیا میں لطف اور خوشی کے تماشہ میں مصروف رہے گا یعنی یہ نوٹنکی یہ فلم اور یہ سرکس جو آئے دن دنیا میں ہوتے رہتے ہیں یہ سارے کے سارے تماشے عارضی ہیں اور انسان کی آنکھ جو کھلی ہوئی ہے وہ بھی نوٹنکی دیکھنے یا کسی فلم اسٹار کے دیکھنے کے خاطر ورنہ انسان کو ایک دن وداع کہنا ہے۔ تھوڑی دیر بعد جب اُس کا انتقال ہو جائے گا تو سارے فلم اور کھیل تماشے خواب و خیال بنکر رہ جائیں گے۔

غزل نمبر ۸۵

رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے آخر کبھی تو عقدہ دل وا کرے کوئی

مرزا صاحب کو عشق میں رونے کے اکثر دورے پڑا کرتے تھے چنانچہ حسب دستور ایک مرتبہ جب اُن کو رونے کا دورہ پڑا تو دوست احباب نے اُن سے کہا کہ مرزا صاحب بیوی بچوں والے ہو کر اب آپ کو یہ رونا زیب نہیں دیتا کتنے افسوس کا مقام ہے اگر ناتی نواسوں نے کہیں پوچھ لیا کہ نانا جان کیوں

رو رہے ہیں تو اُن سے کیا بتایا جائے گا۔ کیا اُن سے یہ کہا جائے گا کہ تمہارے نانا جان تمہاری ایک باہر والی نانی جان پر مرتے تھے اور تمہاری پیدائش سے لے کر اس وقت تک گریہ وزاری کے پوٹ کے پوٹ جمع کرتے رہے اب بڑھاپے میں باسی کڑھی میں اُبال آیا ہے اور وہ اپنی بوڑھی محبوبہ کو یاد کرکے رو رہے ہیں مگر مرزا صاحب کا اصرار ہے کہ انھیں رونے دیا جائے تاکہ اُن کے دل پر جو سالہا سال کے غموں کا بوجھ لدا ہوا ہے وہ دور ہو جائے۔

چاک جگر سے جب وہ پرسش نہ دا ہوئی   کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

مرزا صاحب چونکہ طب اور جراحی سے بھی واقف تھے اس لئے ہر وقت آلاتِ جراحی جیب میں ڈالے رہتے تھے اور چیر پھاڑ کے کام میں تو اس بلا کا تجربہ رکھتے تھے کہ جب کہئے دل چیرے بیٹھے ہیں پھر کمال یہ کہ اس کے بعد فوراً اُسی طرح اُسے اپنے مقام پر فٹ کر دیا کرتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ جب محبوب نے آزمانے کے لئے ان سے کہا کہ معاف کیجئے گا مرزا صاحب آپ کے جگر میں خاک میری محبت نہیں تو مرزا صاحب نے فوراً جیب سے اوزار نکالے اور جھٹ چیر کر اپنا دل دکھا دیا کہ یہ دیکھئے محبت کے کیڑے کس بری طرح کل بل کل بل کر رہے ہیں مگر اس کے باوجود ان کے محبوب صاحب نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور ہنستے ہوئے دوسری طرف چل دیئے اور اس کا بھی خیال نہ کیا کہ مرزا صاحب ٹانکے وانکے لگالیں اور اُن کے حواس درست ہو جائیں۔ ایسی صورت میں مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ دو چار دفعہ میں نے اُن کی محبت میں اپنا گریبان چاک کیا مگر یہ سوچ کر کہ کیا فائدہ اپنے اوپر مجنوں کا الزام لینے سے جس بے رحم کو جگر کے

چاک ہونے پر رحم نہ آیا وہ کیا خاک گریبان کے چاک ہونے سے متاثر ہوگا۔

لختِ جگر سے ہے رگِ ہر شاخ شاخِ گل تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی

لختِ جگر = جگر کا ٹکڑا۔ مگر یہاں اس سے مراد خونِ جگر ہے اس لئے کہ خون بھی جگر کا جزو ہے۔

مرزا صاحب کو جب ایک باغات کے مالک نے جنون اور وحشت کی حالت میں کانٹوں پر لوٹتے دیکھا اور یہ دیکھا کہ مرزا صاحب کے جسم میں کانٹے چبھ گئے ہیں اور کانٹوں کی ٹہنیاں شاخِ گل کی طرح لہولہان ہو کر سرخ ہوگئی ہیں تو انھوں نے مرزا صاحب سے عرض کیا حضور ہمارے یہاں کا باغبان چھٹی پر چلا گیا ہے جس سے پودے کمھلائے جا رہے ہیں لہذا اگر زحمت نہ ہو تو جو کام آپ صحراؤں اور بیابانوں میں دکھاتے ہیں اگر کچھ عرصہ ہمارے باغ میں آ کر دکھا دیں تو ہمارے باغ کے پودے خشک ہونے سے بچ جائیں گے اس لئے کہ درختوں میں خون ڈالنے سے پودے تندرست اور سرسبز ہو جاتے ہیں چنانچہ مرزا صاحب نے ان کی درخواست منظور کر لی۔

اب مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنے خون سے باغ کو گلستان بنا دیا ہے یعنی جگر کا پورا خون باغبانی میں خرچ کر دیا مگر اس کاوش کے باوجود محبوب نے اُن پر ترس نہ کھایا۔ لہذا جب یہ کام کرتے کرتے مرزا صاحب کا دل بھر گیا تو اب آپ فرماتے ہیں کہ آخر کب تک ہم صحرا کو اپنے خون سے سینچتے رہیں گے کیونکہ اس کے بعد بھی محبوب ہماری محبت کا قائل نہیں۔

غزل نمبر ۸۶

ابن مریم ہوا کرے کوئی میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

مرزا صاحب اس شعر میں ایسی بات کہتے ہیں جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ اجی ہوں گے لاٹ صاحب اپنے گھر کے ہم تو جب جانیں جب وہ لال قلعہ ہمارے نام لکھ دیں اسی طرح کہتے ہیں ہوں گے اپنے گھر کے ابن مریم۔ ہم تو جب جانیں جب وہ ہمارے عشق کا علاج کر دیں جس کی دوا حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں اور اگر دونوں مصرعوں میں کوئی کا اشارہ معشوق کی طرف ہو تو اس کے معنی یوں لئے جا سکتے ہیں کہ اجی اگر ابن مریم مشہور ہیں تو آئیں اور آ کر ہمارے عشق کا علاج کر کے ہمیں اچھا کر دیں ورنہ دور کے ڈھول تو سہانے ہوا ہی کرتے ہیں۔ مقصد یہ کہ اگر وہ ابن مریم بنکر آئیں اور ہمیں اچھا کر دکھائیں تب ہم جانیں کہ ہاں اپنے قول کے سچے ہیں ورنہ ایسی ہوائی اڑانے والے ہم نے ہزاروں دیکھے ہیں۔

شرع و آئین پر مدار سہی　　ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

آئین = قانون۔

محبوب کے بارے میں عام شہرت یہی ہے کہ وہ تیر و کمان سے عاشق کا شکار نہیں کرتا اور عشاق کے سروں پر لٹھ نہیں مارتا بلکہ اس نے ایک نظر عشاق کو دیکھ لیا اور سب کے سب آناً فاناً غفیل ہو گئے گویا کہ اس نے جسم کا خون ایک نظر میں چوس لیا۔ ذرا سے چشم ابرو کا اشارہ کیا اور عشاق کی تجہیز و تکفین کے انتظامات شروع ہو گئے لہذا دنیائے عشق میں نہ تو کوئی اس قتل و غارت گری پر کھانا چوں کر سکتا ہے اور نہ شرع و آئین کی رو سے محبوب کے قاتلانہ حملوں پر کوئی پابندی عائد کی جا سکتی ہے کیونکہ شرع اور قانون تو اس

وقت کام میں لایا جا سکتا ہے جب کسی اسلحہ سے قتل کیا جائے۔

چال جیسے کڑی کمان کا تیر　　　دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

کڑی کمان = سخت کمان۔

مرزا صاحب سے نہ جانے دنیا کی ان حسیناؤں اور محبوباؤں کو کون سا للہی بغض تھا کہ انھیں دیکھتے ہی وہ نناوے میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگتی تھیں۔ اور ان میں ان کی محبوبہ بھی شریک تھی جس کے دل میں یہ جگہ کرنا چاہتے تھے مگر وہ بھی کمان سے نکلے ہوئے تیر کی مانند محبوباؤں کے پورے گلے کے پیچھے نوک دم ہو جاتی تھی اس بھگدڑ میں ظاہر ہے کہ ان کے دل میں کوئی کیسے جگہ پیدا کر سکتا ہے سوائے اس کے کہ دل گھسیٹ کر مار دیا جائے اگر کسی کے پڑ جائے تو فبہا نہیں تو کوئی پریشانی کی بات نہیں اپنا دل اٹھا کر دوبارہ اپنی جگہ پر لگایا جا سکتا ہے۔

بات پر واں زبان کٹتی ہے　　　وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

مرزا صاحب کے محبوب کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے وقت کا سلطان بلبن ہے جس کے دربار میں کسی کو مسکرانے یا بولنے تک کی اجازت نہیں اگر کوئی بولتا یا اس کی بات پر اعتراض کرتا تو اس کی زبان کی گھوڑے چڑھائی کردی جاتی اور اُسے ڈانٹ کر اور گردن میں ہاتھ دے کر نکال باہر کیا جاتا ایسی حالت میں سب لوگ اُس کے سامنے اس طرح دَم سادھے بیٹھے رہتے تھے کہ جیسے بھیڑیئے کے سامنے بندر نہ کوئی اپنی جگہ سے جنبش کر سکتا تھا اور نہ بول سکتا تھا اور پھر مصیبت یہ کہ اُس کی ہر بری بھلی بات کو سننا پڑتا۔

غزل نمبر ۸۷

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے ۔۔۔ غلامِ ساقیٔ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

مرزا صاحب نے اِس شعر میں لفظ "ساقی" سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر تمام لوگوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے گھروں میں شراب کشید کروا کے اُسے دونوں وقت کھانے کی جگہ استعمال کریں اور دنیا کے غموں پر لعنت بھیجیں مزے سے غم غلط کریں کیونکہ حشر کے روز ساقیٔ کوثر کی موجودگی میں کس میں دم ہے جو اُن کی طرف ہاتھ بڑھائے اور ان کو دوزخ میں بھیجے چونکہ ساقیٔ کوثر کے غلام ہیں لہٰذا ان کی موجودگی اِس کی ضمانت ہے کہ غم غلط کرنے کے لئے ہم جس قدر شراب نوشی دنیا میں کر رہے ہیں وہ سب جائز ہے۔ اگر پوچھا گیا کہ شراب کیوں پی تھی؟ کہہ دیں گے حضور غموں کو رد کرنے کے لئے دوا پیتا تھا اور تابعدار ساقیٔ کوثر کا غلام رہ چکا ہے۔

تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے ۔۔۔ رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے؟

کسی کو اگر دُکھ پہنچانا ہو تو اُس پر مار پیٹ کرنے یا لاٹھی پونگے چلانے کے بجائے بہترین صورت یہ ہے کہ اُس کے دشمنوں کے ساتھ آپ دوستانہ طریقے پر پیش آنا شروع کر دیں۔ مرزا صاحب کے ساتھ اِن کے محبوب نے تشدد کا ایک نیا طریقہ اختیار کر رکھا تھا اور وہ یہ کہ وہ شام کو مرزا صاحب کے سارے دشمنوں اور رقیبوں کو لے جا کر دودھ والے کی دکان پر ۔۔۔ قطار در قطار کھڑا کر دیا جاتا اور خوب ڈٹ ڈٹ مفت دودھ پلواتا اور پیسے اپنے جیب سے دیتا۔ ظاہر ہے کہ مرزا صاحب کے لئے اِس سے زیادہ تکلیف دہ بات اور کیا ہو سکتی تھی

چنانچہ ایک دن جب مرزا صاحب سے اُس کی ملاقات ہوئی تو اُس نے کہا کہ مرزا صاحب کہیئے مزاج تو بخیر ہیں اب تو آپ کو ہم سے جور و تشدد کی شکایت نہیں اس پر مرزا صاحب نے کہا کہ حضور والا آپ نے جور و تشدد کا جو نیا طریقہ اختیار کیا ہے اُس کو ہم خوب سمجھتے ہیں، اب آپ ہم کو میٹھا زہر دے کر مارنے کی کوشش کر رہے ہیں چنانچہ آپ نے اب ہمارے دشمنوں کو دودھ پلا پلا کر ہمارا خون کھولانا شروع کیا ہے یقین مانئے یہ طریقہ ہم پر آپ کے براہ راست تشدد سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہے۔

کٹے تو شب کہیں کاٹے تو سانپ کہلائے   کوئی بتائے کہ وہ زلف خم بخم کیا ہے

کٹنا دطے ہونا۔ یعنی انجام کو پہنچانا۔

مرزا صاحب کی محبوبہ کی لٹوں کی طوالت کی کوئی حد و انتہا نہ تھی یوں سمجھ لیجئے کہ محبوب دتی میں ہے تو اس کی لٹوں کا سلسلہ قطب شمالی و قطب جنوبی سے آگے تک گیا ہوا ہے اُس کا ناپنا محال ہے شب ہجر اگر ہزار دو ہزار یا اُس سے زیادہ طویل ہو تو بہر صورت اُس کو کسی نہ کسی طریقہ سے سو دو سو آدمی اپنی عمر میں ملا کر ناپ سکتے ہیں اگر مرزا صاحب کی عمر وفا نہ کرتی تو حضرت خضر سے کہہ دیا جاتا کہ حضنت تکلیف تو ضرور ہوگی مگر بڑا کرم ہوگا اگر آپ مرزا صاحب کی طرف سے یہ کام کر دیجئے اگر اس کی درازی طے ہو سکتی تو اُس کو شب ہجر کہا جا سکتا تھا لیکن وہ عجیب زہریلی ناگن ہے جس کے سامنے سانپ کا کاٹنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا کیونکہ سانپ کاٹ کر ہلاک کر دیتا ہے مگر یہ ناگن ایسی ہے کہ دل و دماغ کو بغیر کاٹے مسموم کر دیتی ہے اگر سانپ کی طرح یہ بھی ڈستی ہوتی تو

سانپ کہہ سکتے تھے لیکن مصیبت یہ ہے کہ نہ تو وہ کاٹتی ہے اور نہ اپنے کو منڈوانے پر آمادہ ہے۔ اب مرزا صاحب کہتے ہیں خدارا بتایئے کہ اُس زلف کے خم بہ خم کو آخر ہم کہیں تو کیا کہیں؟ مرزا صاحب اگر اس ناچیز کے مشورے کو قبول فرمائیں تو اُس کو دُم دراز ناگن کہہ کر اپنے قلب کو تسکین دے سکتے ہیں۔

نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے

حشر: اٹھنا:۔ نشر: پراگندہ ہونا:۔ حشر و نشر: قیامت: کیش: مذہب۔ ملت: میل جول۔ صحبت: جتھا: قوم:۔ خدا کے واسطے خدا کے واسطے بتاؤ۔

مرزا صاحب نے بجانے کس ملحدہ کے ساتھ محبت کر رکھی تھی جس کی کوئی کل درست نہیں۔ نہ تو وہ حشر کی قائل تھی اور نہ اس کی قائل کہ مرزا میں وہ جو کچھ زیادتیاں فرما رہی ہیں اُس کا حساب کتاب خدا کے سامنے ہوگا اور بے پناہ مار پڑے گی ایک طرف تو الحاد کی یہ انتہا اور دوسری طرف بات بات پر جھوٹی قسمیں کھاتی تھیں ظاہر ہے کہ ایک ایسے شخص کی قسم کا کیا اعتبار کیا جا سکتا ہے جس کا تکیہ کلام ہی قسم ہو۔ مرزا صاحب اب دنیا والوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ ارے بھائی بتاؤ کہ ایسے شخص کا ہم کیا علاج کریں؟ کسی طرح اس ڈائن سے ہمارا پیچھا چھڑاؤ۔

غزل نمبر ۸۸

زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے ہیں
دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

مرزا صاحب کہتے ہیں کہ محبوبہ ..... کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ جب زندہ جان ہم اس کی محفل میں جاتے ہیں تو وہ کھڑے کھڑے ہم کو وہاں سے نکلوا دیتی ہے اور اس کو گوارا نہیں ہوتا کہ ہم بھی دوسروں کی طرح بیٹھ کر تھوڑی دیر طبلہ اور سارنگی سُن لیا کریں مگر جب کوئی اور پروردی کا کام ہوتا ہے تو ہماری پکار ہوتی ہے۔ سوچتے سوچتے مرزا صاحب نے سوچا کہ چلو ایک ترکیب کرنا چاہیے کہ اب ان کی محفل میں مر کر دیکھا جائے کہ یہ مرنے کے بعد بھی ہماری اٹھوائی دیتی ہیں یا نہیں۔ مرنے کا معاملہ یہ ہے کہ اول تو اس میں تجہیز و تکفین کا پورا پورا خرچہ برداشت کرنا پڑتا ہے دوسرے نعش کو اٹھا کر قبر تک لے جانے میں کندھا دیتے چلنا پڑتا ہے اور اگر نہ جایئے تو لوگ انگشت نمائی کرتے ہیں چنانچہ مرزا صاحب نے جب ان کی محفل میں پہنچکر انتقال فرمایا تو محبوبہ کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا کیونکہ پیسے کے پیسے دینا پڑے اور قبرستان تک گھاتے میں جانا پڑا۔ غرض مرزا صاحب نے اپنے عشق کے دام معہ اصل سود کے وصول کر لئے۔

غزل نمبر ۸۹

بھوکے نہیں ہیں سیر گلستاں کے ہم ولے کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

بھوکے نہیں ہیں یعنی خواہشمند نہیں ہیں۔ اس میں بھوکے ہونا اور کھانا دو مصدروں سے مرزا صاحب نے لطف پیدا کیا ہے۔ چنانچہ اس شعر میں فرماتے ہیں کہ ہم کو سیر گلستاں کی خواہش نہیں ہے لیکن موسم بہار کی ہوا صحت افزا اور خوشگوار ہوتی ہے اس لئے ہوا خوری کے لئے سیر گلستاں کیا کرتے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ مرزا صاحب جو زندگی بھر عشق و محبت کے ہاتھوں صحرا نوردی کر چکے ہیں

اور بڑے بڑے صحراؤں میں زمین کا گز بن چکے ہیں ان کو بھلا اب بڑھاپے میں اس کی کیا ضرورت تھی کہ وہ چھوٹے چھوٹے اور معمولی باغوں اور پھلواریوں میں جاکر سیر و تفریح کرتے مگر چونکہ اب عشق و محبت کے کوچہ سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے اور صحت بالکل جواب دے چکی ہے لہذا اب بجائے عشق و جنون کی حالت میں صحرا نوردی کے محض تندرستی بحال کرنیکی غرض سے قریب کے باغوں میں سیر کرنے چلے جاتے ہیں۔

غزل نمبر ۹۰

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

خواہش پر دم نکلنا = اس کے پورے ہونیکی جلدی کرنا۔

مرزا صاحب نہ جانے کے ہزار ارمان اور کے لاکھ خواہشیں لے کر دنیا میں پیدا ہوئے تھے کہ ساری زندگی ٹوٹ ٹوٹ کر نکالنے کے بعد بھی ہزاروں ارمان پورے ہونے سے رہ گئے چنانچہ فرماتے ہیں کہ جسقدر ارمان نکلے ہیں ان سے کئی ہزار گنا ارمان تو ابھی نکلنا باقی ہیں چنانچہ اور جو بقیہ ارمان ہیں وہ ایسے لحیم و شحیم اور ہاتھ پیروں کے تگڑے ہیں کہ ان کے نکلنے میں جان پر بن جانے کا امکان ہے اسی خیال سے شاید مرزا صاحب نے صرف دبلے پتلے ارمان جو آسانی سے نکل سکتے تھے انھیں نکالدیا اور بقیہ کو جان جانے کے ڈر سے روکے رکھا۔

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہے گا اس کی گردن پر
وہ خوں جو چشم تر سے عمر بھر یوں دم بدم نکلے

گیا رہے گا؟ = استفہام انکاری یعنی نہیں رہے گا۔

مرزا صاحب نے رو رو کر اپنے سارے جسم کا خون نکال دیا ہے اور اب یا تو جسم پر گندہ سا بہت گوشت رہ گیا ہے یا ہڈیاں اسی حالت میں مرزا صاحب محبوب کی خدمت میں حاضر ہو کر فرماتے ہیں کہ بھئی اب تو آپ کو قتل کرنے میں کسی قسم کا پس و پیش نہ ہونا چاہیے کیونکہ جب تک جسم میں خون تھا اس وقت تک آپ کا یہ کہنا حق بجانب تھا کہ صاحب ہم آپ کو قتل نہیں کر سکتے کیونکہ اس میں تھانہ چوکی اور تین سو دو کا (302) مقدمہ قائم ہو جانے کا خطرہ ہے اور آپ کا یہ کہنا بالکل درست بھی تھا کیونکہ ہر شریف آدمی تھانے چوکی سے ڈرتا ہے مگر اب آپ پنڈا چھو کر دیکھ لیجئے جو جسم میں ایک قطرہ خوں بھی ہو لہذا اب آپ کو ہمارے قتل کر دینے میں کوئی پس و پیش نہ ہونا چاہیئے کیوں کہ جب خون ہی نہیں نکلے گا تو آپ کی گردن پر خون ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن   بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے

مرزا صاحب کو کچھ اس ذلت کے ساتھ محبوب نے اپنے کوچہ سے نکالا ہے کہ مرزا صاحب کو حضرت آدم علیہ السلام کا جنت سے نکالا جانا یاد آگیا چنانچہ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم کو تو بہر حال جنت سے نکالا گیا وہ ایک   طویل داستان ہے اور کسی نے نہ ان کو نکالتے دیکھا اور نہ ان کو وہ ذلت اور خواری دیکھنا پڑی جو ہم کو دیکھنا پڑی دوسرے یہ کہ جنت سے حضرت آدم کا نکالا جانا اس وجہ سے تکلیف دہ نہیں تھا کہ حضرت آدم کی دل بستگی کے لئے دنیا میں بی حوا کو بھیج دیا گیا تھا مگر ہم کو اس بری طرح بیک بینی و دو گوش محبوب نے کوچہ سے نکلوایا ہے کہ

اُسے خدا ہی سمجھے کیونکہ ہم کو وہاں سے نکلنے کے بعد نہ تو کوئی خواہش اور نہ ہماری دل بستگی کے لئے انھوں نے اپنے گھر کی کوئی لونڈی باندی ساتھ کی ہم تو جن حالات میں نکالے گئے ہیں وہ ایسے حالات ہیں جو خدا کسی دشمن پر نہ ڈالے

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا   اگر اُس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

مرزا صاحب اگرچہ خود زیادہ دراز قد واقع نہ ہوئے تھے لیکن محبوب کے طویل قد ہونے سے وہ خوش تھے عالم یہ تھا کہ جس قدر محبوب لمبا چلا گیا تھا اُس سے زیادہ اُس کے سر پر بال تھے جو زلفوں کی صورت بندھے ہوئے تھے مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اگر ان بالوں کی چوٹی کو کھول دیا جائے تو جناب اُن کے مقابلہ میں ادھا معلوم ہوں گی اور قد کی درازی پر انکا سارا گھمنڈ خاک میں مل جائے گا۔

مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط تو ہم سے لکھوائے   ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھکر قلم نکلے

مرزا صاحب جن تحریر پر عاشق تھے اُن پر خدا جانے کتنے بدھو نتھو اور نفاقی قسم کے لوگ بھی بیک وقت عاشق تھے چونکہ مرزا صاحب ان سب میں پڑھے لکھے تھے اور معشوق کے القاب و آداب سے بھی بخوبی واقف تھے اس لئے اُنھوں نے اس طرح گلی اور کوچوں میں کان پر قلم رکھ کر نکلنا شروع کیا تھا جس طرح کہ چارپائی بننے والے گلی کوچوں میں "چارپائی بنوالو۔ چارپائی" کے نعرے لگاتے گذرتے ہیں دوسرے مرزا صاحب سوچے۔ اُن جاہل عاشقوں کے خطوط لکھنے میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ لکھوائی کی لکھوائی وصول ہوگی اور وہ بدنصیب لکھوائیں گے کچھ اور یہ لکھ کچھ دیں گے اور اس طرح رقیبوں کو ذلیل و خوار کرنے کا موقعہ مل جائے گا اسکے علاوہ ان کا خط بھی درست ہو جائے گا اور محبوب کے القاب و آداب کی مشق بھی

ہو جائے گی۔ پھر اُن سے اور محبوب سے جو بھی تعلقات ہوں گے ان کی بھی مرزا صاحب کو اطلاع ہوتی رہے گی۔

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی　　پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جام جم نکلے

مرزا صاحب چونکہ شراب نوشی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اس لئے آپ کا یہ دعویٰ تھا کہ جمشید کے بعد اگر کوئی جام جمشید میں شراب پی سکتا ہے تو وہ صرف مرزا صاحب کی ذات ہے جام جمشید کے بارے میں ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ وہ بہت بڑا تھا اور بجز جمشید کوئی دوسرا شخص اُس کا پورا جام نہیں پی سکتا تھا۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ جمشید کے مرنے کے بعد وہ جام اسی طرح بیکار پڑا ہوا ہے جس طرح نمائش میں ایک لمبا سا جوتا ٹانگ کر اُس پر لکھ دیا جاتا تھا کہ جس کے پیر میں ٹھیک ہو لیجائے۔ چنانچہ اس جام جم میں زنگ لگتا جا رہا ہے کیونکہ کوئی ایسا بلانوش جمشید کے بعد پیدا ہی نہیں ہوا جو اُس میں شراب پی سکتا۔ لیکن اب مرزا صاحب کے پیدا ہونے کے بعد جام جم کا مقدر جاگا اور وہ وقت آگیا کہ جام جم اپنی جگہ سے نکل کر مرزا صاحب کو پیش کر دیا جائے تا کہ مرزا صاحب دو چار خم اُس میں انڈیل کر اُس سے اپنی تسکین فرمالیں۔

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی　　وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغ ستم نکلے

خستگی کی داد پانا = دکھ درد کا مداوا ہونا۔

مرزا صاحب کا یہ خیال تھا کہ اُن کی تنہا ذات ایسی ہے جو سارے جہان کا غم اٹھائے ہوئے ہے اور اُن سے بڑھ کر غموں کا بوجھ اٹھانے والا کوئی کیا دلی سے باہر کہیں پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب مرزا صاحب نے اپنے غموں کے

علاج کے سلسلے میں دوست واحباب سے مشورہ کیا اور غم کا مداوا چاہا تو معلوم ہوا کہ اُن کے دوست واحباب خود ہی غموں کے پہاڑ کے نیچے کچلے پڑے ہیں یہ واقعہ ہے کہ عشاق میں یہ پتہ لگانا بہت مشکل ہے کہ سب سے زیادہ مظالم کس پہ ہو رہے ہیں کیونکہ عشق نام ہے پٹاپٹ کے جتے جانے کا۔ لہذا عشق کی مار مختلف قسم کی ہوتی ہے بعض محبوب اندرونی مار ایسی دیتے ہیں کہ عشاق کو چھٹی کا دودھ یاد آجاتا ہے چنانچہ مرزا صاحب اپنے ظاہری مصائب کو اپنی جگہ پر بہت بڑی چیز سمجھے ہوئے تھے۔ اور اُن کا خیال تھا کہ اُن سے بڑھ چڑھ کر کسی دوسرے پر مظالم نہیں ہوتے ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ مرزا صاحب اس معاملہ میں بھی بہت سے عشاق سے پیچھے ہیں۔

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

مرزا صاحب تو بہر حال ایک رند مشرب انسان تھے ہی اور کھلم کھلا شراب نوشی کرتے تھے اور اُس پر فخر کرتے تھے مگر مرزا صاحب کے دوستوں میں ایک صاحب جو ہر وقت قال رسول اللہ کی ضربیں لگاتے تھے اور اپنے زہد اور تقویٰ کی دھونس میں لوگوں کو مرعوب کئے ہوئے تھے ایک دن جب مرزا صاحب اپنے اس کارِ خیر کے سلسلے میں میخانے سے نکل رہے تھے تو وہ صاحب جاتے دکھائی پڑے اس پر مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ زیادہ حد ادب اب میں واعظ اور محتسب کی شان میں کیا عرض کروں کہ وہ کس پائے کے بزرگ ہیں اور میرے آنے کے بعد اُنھوں نے کیسی کیسی رنگ رلیاں منائی ہوں گی مگر صاف کہیے گا وہ جاتے ضرور دکھائی پڑے تھے

غزل نمبر ۹۱

بیضہ آسا ننگ بال و پر ہے یہ کنج قفس از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

دنیا کو مختلف لوگوں نے مختلف چیزوں سے تشبیہ دی ہے مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ یہ دنیا نہ تو گیند کی طرح گول ہے نہ تربوز اور کدو کے مانند گول ہے بلکہ اس کی حیثیت مثل ایک مرغی کے انڈے کے ہے اور اس میں تمام انسان مرغی کے بچوں کی طرح قید ہیں جب تک یہ انڈا ٹوٹتا نہیں اُس وقت تک مرغی کے بچے کی زندگی کا آغاز نہیں ہوتا اسی طرح اس دنیا کے انڈے یا جسم کے انڈے سے جب تک روح کو نجات نہیں اس وقت تک انسان کو ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی حاصل نہیں ہوتی یہ واقعہ ہے کہ انڈے سے نکلتے ہی مرغی کا بچہ چہکنا شروع کر دیتا ہے اور نہایت خوشی اور مسرت کے ساتھ اِدھر اُدھر دوڑنا شروع کر دیتا ہے اُسی طرح مرزا صاحب کا خیال ہے کہ جسم کے انڈے سے روح نکل کر عالمِ بالا میں اِدھر اُدھر چہکنا شروع کر دے گی کیونکہ ابدی زندگی وہی ہے۔

غزل نمبر ۹۲

جز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو جیبِ خیال بھی تیرے ہاتھوں سے چاک ہے

جیب: کُرتے یا قمیص کی وہ تھیلی جو گریبان یا دل کے مقام پر لگائی جاتی ہے اور اُس میں کوئی چیز رکھی جاتی ہے۔

مرزا صاحب جب دنیا میں تشریف لائے تھے تو ان کے دل میں آرزوؤں اور تمناؤں کی جگہ تیغِ زخمِ ناز کی کترن بھر دی گئی تھی ان کو چاہیے تھا کہ یہ ٹٹول کر دیکھ لیتے کہ جو ضروری چیزیں عام انسانوں کو دے کر بھیجا جاتا ہے وہ

ان کے پاس ہیں یا نہیں مگر یہ ایک دم پیدا ہو گئے اور چونکہ دل کی تھیلی زخمی تھی لہذا جتنی چیزیں اس میں رکھی جاتیں اُن کے گر جانے کا امکان تھا دنیا میں پہنچکر جب انھوں نے دل کو ٹٹول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ دل کی جیب پھٹی ہوئی ہے چنانچہ آپ نے خیال کیا کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کو آرزوئیں اور تمنائیں نہ ودیعت کی گئی ہوں اس لئے آپ نے خیال کیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ جو آرزوئیں چلتے وقت دل میں رکھی گئی تھیں وہ راستے میں گر گئی ہیں حالانکہ ان کی ساری آرزوئیں اور تمنائیں وہیں رہ گئی تھیں اور نجانے کہاں کا پھٹا ہوا دل ان کے لگا کر ان کو دنیا میں بھیجدیا گیا تھا۔

غزل نمبر ۹۳

لب عیسٰی کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی　　قیامت کشتۂ لعل بتاں کا خواب سنگیں ہے

لب عیسٰی کی جنبش = دم عیسٰی ۔ قیامت سنگین ہے = یعنی بہت گراں ہے

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ بجائے محبوب کے لبوں کی جنبش میں کوئی ناز ہو یا کھلا ملا ہو لیے ہے کہ اُدھر اُس نے عشاق کی جم غفیر کو دیکھا اور ادھر اپنے لبوں کی لبلبی کو جنبش دی اور تمام عشاق اپنی اپنی جگہ پر اٹھا غفیل ہو گئے اور موت کی گہری نیند میں ایسا غرق ہو گئے کہ پھر لاکھ لاکھ اٹھائیے اپنی جگہ پر سے اٹھنے کو تیار نہیں ہوتے ۔ حضرت عیسٰی کے بارے میں مشہور ہے کہ اُن کی جنبش لب سے مُردے زندہ ہو جاتے تھے لیکن مرزا صاحب کا محبوب جن لوگوں کو مارتا ہے اُن کو ایسا زہر دے کر مارتا ہے کہ حضرت عیسٰی ایک نہیں دس بار اُن پر پھونک

ڈال ڈال کر اٹھائیں وہ اپنی جگہ پر سے جنبش نہیں کرتے بلکہ اُن کے جنبشِ لب ان مرنے والوں کے حق میں لوری ثابت ہوتی ہے اور وہ پہلے سے زیادہ گہری نیند سو جاتے ہیں۔

غزل نمبر ۹۴

آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے — نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

مرزا صاحب اس شعر میں صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ موت کا نام سنتے ہی بڑے بڑے بہادر ان انتقال فرما جاتے ہیں در دنیا میں نقشِ پا تک کو جب سیلاب کی آمد کی اطلاع ہوتی ہے تو اُس کی آواز سنتے ہی نقشِ پا تک کانوں میں انگلی رکھ لیتے ہیں تاکہ سیلاب جو طوفانوں کے حق میں موت کی حیثیت رکھتا ہے اُس کی آواز اُس کے کانوں میں نہ آئے غرض دنیا میں موت کے نام سے ہر شخص کا دیوالہ کھسک جاتا ہے۔

غزل نمبر ۹۵

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنا — مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

مرزا صاحب زندگی بھر تمناؤں اور آرزوؤں کے طلسم کے تماشائی بنے رہے جس طرح سینما دیکھنے والوں میں بعض سینما باز محض اس خیال سے ٹکٹ خرید لیتے ہیں کہ چلو دن بھر تضیع اوقات سے بچنے کیلئے ایک جگہ بیٹھنے کو ملے گا اُن کو تماشے کی اچھائی یا برائی سے مطلب نہیں ہوتا اسی طرح مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میں آرزوؤں اور تمناؤں کے طلسم کی دشواریوں اور پریشانیوں کو دیکھنے کی غرض سے تماشائی بنا بیٹھا ہوں مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ آرزو پوری ہو یا لطف حاصل ہو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب چونکہ گھر والی سے عاجز تھے لہذا وہ اپنا زیادہ وقت کھیل

تماشوں میں گذارتے تھے اور رات گئے گھر میں آکر پڑ رہتے تھے۔

غزل نمبر ۹۶

سیاہی جیسے گرجائے دم تحریر کاغذ پر ۔ مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

مرزا صاحب جب پیدا ہونے لگے تو اپنی قسمت میں شب ہائے ہجراں کا جتنا غم تھا وہ سب لکھا جائے مگر جس فرشتہ نے ان کی تقدیر لکھی تھی وہ اول تو سیاہ روشنائی سے لکھی تھی دوسرے اس درجہ بدخط تھا کہ پوری طرح پر وہ نوشتہ پڑھا نہ جاتا تھا کیونکہ جہاں جہاں اُن کی تقدیر میں شب ہجراں کا ذکر تھا وہاں پر بڑے بڑے سیاہی کے چکتے پڑے ہوئے تھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے لکھتے وقت فرشتے کے ہاتھ سے دوات چھوٹ گئی ۔ جس کے سبب اس مقام پر کچھ پڑھا نہ جاتا تھا چنانچہ جب مرزا صاحب دنیا میں تشریف لائے اور ان کے نوشتہ تقدیر کے مطابق ان سے زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا گیا تو جس جگہ روشنائی کے دھبے تھے اور کچھ پڑھا نہ جاتا تھا اس مقام کو بھی یہ سمجھ لیا گیا کہ یہاں شب ہجراں کا ذکر ہوگا نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا صاحب فرشتہ کی بدخطی کے سبب زندگی بھر ہجر و فراق میں مبتلا رہے اور کراماً کاتبین نے اتنی زحمت بھی نہ فرمائی اُن سے کہہ دیا ہوتا کہ صاحب جس مقام پر روشنائی کے دھبے نظر آرہے ہیں اُس مقام پر اصل عبارت کیا ہے۔

غزل نمبر ۹۷

دل ودیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے ۔ کہ اس بازار میں ساغر متاع دست گرداں ہے

دست گرداں = تابع فعل ۔ سرِ راہ بکتی ہوئی چیز یادہ چیز جو دوکان سے خریدی نہ جائے۔

اس شعر میں مرزا صاحب نے جنسی تبادلہ کے ذریعے تبادلہ کا ذکر کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ جہاں تک معرفت کے ساغر کی خریداری کا تعلق ہے وہ نہ تو چاندنی چوک کی کسی دوکان میں دستیاب ہو سکتا ہے اور نہ سو پیسہ پیسہ خرچ کرکے کناٹ پلیس کی کسی دوکان سے دستیاب ہو سکتا ہے کیونکہ یہ متاع صرف جڑی بوٹیوں کی شکل میں مرشدان کامل رکھتے ہیں اور نہ ہی دے سکتے ہیں اور اس کی قیمت میں چونی اٹھنی اور سو پیسہ کام نہیں دیتا بلکہ جس کو خریدنا ہوتا ہے وہ دل اور دین کی جنس دے کر اس متاع کو حاصل کرتا ہے اصل میں مرزا صاحب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر کوئی صاحب براہ راست اللہ میاں سے عشق کرنا چاہتے ہیں تو ان کو چاہیئے کہ وہ فقیروں اور درویشوں میں جا کر زندگی بسر کریں اور پیر طریقت کے ہاتھ پاؤں دابیں اور اس پر یقین کامل رکھیں تب وہ صحیح راستہ اللہ میاں تک جانے کا پا سکتے ہیں ورنہ یوں ہی دنیا میں پڑے رہیں گے۔

غزل نمبر ۹۸

نشارِ تنگیٔ خلوت سے بنتی ہے شبنم ۔۔۔ صبا جو غنچہ کے پردے میں جا نکلتی ہے

یہ شعر نہایت دبوچنے اور جھنجھوڑنے والا شعر ہے مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ وہ ہوا جو کبھی کبھی غنچوں کے پردوں میں داخل ہو جاتی ہے تو غنچہ اس کو اندھیرے اجالے تنہا پا کر کس کے دبوچ لیتا ہے چنانچہ وہ پسینے پسینے ہو جاتی ہے اور یہ جو آپ پھولوں پر شبنم کے قطرے دیکھتے ہیں وہ دراصل باد صبا کے پنڈے کا چھوٹا ہوا پسینہ ہے۔

غزل نمبر ۹۹

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے ناقہ دماغ آہوئے دشتِ تتار ہے

دشتِ تتار۔ چینی ترکستان کا وہ علاقہ جس میں مشہور شہر خطا و ختن واقع ہے جہاں کے ہرن مشکِ نافہ کے لئے مشہور ہیں۔

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ جہاں زلفِ یار سے نکلی ہوئی ہوا پہنچ جاتی ہے وہاں چہار طرف اُس کے محبوب کی زلفوں کی مہک پھیل جاتی ہے اور تمام رہنے والوں کے دماغوں میں مشک کی جیسی خوشبو بھر ہوتی ہے چنانچہ مرزا صاحب نے اِس شعر میں ایک نیا انکشاف فرمایا ہے اور فرماتے ہیں کہ اب تک لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ تتار میں رہنے کی وجہ سے اور وہاں کے آب و ہوا کے اثرات سے ہرنوں کے یہاں ناف میں مشکِ نافہ پیدا ہوتا ہے ایسا نہیں ہے بلکہ یار کی زلفوں سے نکلی ہوئی خوشبو تتار پہنچتی ہے اور وہاں ہرنوں کے دماغ کے بجائے اُن کی ناف میں مشکِ نافہ پیدا کر دیتی ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ دنیا میں جسقدر مشکِ نافہ آج تک دستیاب ہوا ہے وہ محبوب کی زلفوں کے کارخانے سے تیار ہو کر نکلا ہے۔

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ نظارے کا مقدمہ پھر روبکار ہے

مرزا صاحب کے دل نے دیدہ پر دعویٰ کر دیا اور دعویٰ اس بات پر کیا ہے کہ دیدہ نے معشوق کے چشم ابرو اور شکل و صورت کو دیکھنے کے بعد دل کو ایک مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے اگر دیدے نے محبوب کو نہ دیکھا ہوتا تو ظاہر ہے دل میں محبوب کا تصور نہ پیدا ہوتا اور دل گرفتارِ بلا نہ ہوتا چنانچہ اس مقدمہ کی سماعت ہے۔

بے کدا پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے وہ آئے یا نہ آئے کہ یاں انتظار ہے

مرزا صاحب سے ان کے محبوب نے چلتے چلاتے یوں ہی ٹالنے کی غرض سے وعدہ کر لیا کہ دیکھئے آپ اپنی چوکھٹ پر فلاں فلاں وقت سوالیہ جملے کا نشان بنے میرا انتظار کیجیے گا چنانچہ مرزا صاحب نے محبوب کی بات گرہ میں باندھ لی اور کمر کس کے بیٹھ گئے سویرے سے شام تک جب لوگوں نے مرزا صاحب کو ایک جگہ بیٹھے دیکھا تو انھوں نے مرزا صاحب کو سمجھایا کہ آپ کیا اپنا فضول وقت ضائع کر رہے ہیں جبکہ آپ اس کی فطرت سے واقف ہیں کہ وہ اپنا وعدہ بھول جاتا ہے اور کبھی وعدے کی تکمیل نہیں کرتا اس پر مرزا صاحب نے فرمایا کہ صاحب دو چار دن کیا اب دو چار مہینے تک بندہ یہاں سے ہٹنے سے رہا کیونکہ میں تو جھوٹے کو گھر تک پہنچا دونگا میرے پاس سوائے انتظار کرنے کے اور کام ہی کیا ہے۔ چار پائی پر نہ بیٹھا باہر بیٹھ گیا۔ اب وہ چاہے آئیں چاہے نہ آئیں مجھے تو بہر صورت جھوٹے کو گھر تک پہنچانے کے لئے اُن کے وعدہ کا پاس اور لحاظ کرنا ضروری ہے۔

غزل نمبر ۱۰۰

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشہ کہیں جسے ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

آئینہ = یہاں اس سے مراد دوست کی تصویر جو آئینہ میں ہے: تماشہ = انوکھی۔ نادر یا نایاب چیز۔

مرزا صاحب نئے نئے طریقہ پر محبوب کو چکمہ دے کر اپنے پاس بلانا چاہتے ہیں چنانچہ ایک دن فرمانے لگے کہ صاحب میرے دوست و احباب میں ایک نواب اعظم صاحب ہیں وہ آپ کے نادیدہ عاشقوں میں سے ہیں میں نے جب آپ کے حسن کی تعریف کی اور بتایا کہ آنکھیں چغتائی آرٹ سے ملتی جلتی ہیں جن

میں ایک اچھی بھلی چھوٹی سی پلنگڑی بچھائی جاسکتی ہے اور ہاتھوں کی انگلیاں ایسی گاؤدم ہیں کہ انگریزی کھانے کی میز پر کانٹے کی جگہ براہ راست استعمال کی جاسکتی ہیں اور ان پر ماشاء اللہ مہندی زدہ ناخون اتنے بڑے بڑے بغیر تراشے لگے ہوئے ہیں کہ اچھی بھلی بڑے سائز کی بیر بہوٹیاں معلوم ہوتی ہیں یہ سنکر وہ سکتہ کے عالم میں آگئے مصیبت تو یہ ہے کہ آپ میرے یاں آتی نہیں ورنہ میرے بیان کی تصدیق ہو جاتی بلکہ یقین مانئے کہ میں نے چلتے چلاتے اُن سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ دنیا میں آپ جیسا کوئی حسین نہ آج تک پیدا ہوا اور نہ آئندہ پیدا ہونے کے امکانات ہیں چونکہ آپ آتے نہیں لہذا اگر آپ اپنا ایک فوٹو چھ انچ لمبا اور چار انچ چوڑا عنایت فرمادیں تو میں اُن کو دیدوں جس کو دیکھ کر وہ کہیں کہ صاحب آپ کا حسن کیا ایک اچھا بھلا نوٹنکی کا تماشہ ہے۔ مقصد یہ کہ آپ کے بجائے اب سوائے اس کے کہ آپ کی تصویر اُن کو پیش کردی جائے اور کوئی چارۂ کار نہیں پھونکا ہے کس نے گوش محبت میں اے خدا افسونِ انتظار تمنا کہیں جسے مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ عشق و محبت کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ ادھر کسی سے آنکھ لڑی اور محبت ہوئی اور ادھر عاشق بازار سے ماش کا آٹا خرید کر لایا اور اُس کو گوندھ کر اور پلتھی مار کر اُس نے انتظار کرنا شروع کردیا اور سچ پوچھیے کہ اسی پیٹنٹ قسم کے انتظار کا دوسرا نام تمنا یا آرزو ہے اور یہ واقعہ ہر بلحاظ سے کلیہ جو بھی عاشق ہوتا ہے اُسے عشق کی پہلی منزل میں پیش آتا ہے۔ یقین نہ ہو تو آپ مجنوں اور فرہاد علیہ الرحمۃ سے دریافت فرماسکتے ہیں۔

سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

جب انسان غریب الوطنی کی زندگی بسر کرتا ہے اور وطن سے دور ہوتا ہے تو ساری دنیا کی تکلیفیں اُس کو اٹھانا پڑتی ہیں کبھی گھر سے جُدائی کا درد کبھی سر میں درد کبھی درد قلنج کبھی درد گردہ۔ غرض ہزار طرح کے درد اُس کی دُم کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور اُن ہی کا ہجوم رہتا ہے اور ان تمام دردوں کا علاج یہ ہے کہ انسان اِن غموں اور مختلف اقسام کے دردوں کو بھلانے کے لئے سیر سوا سیر خاک لے کر سر پر ڈالے کہ شاید اس درد و غم سے سکون میسّر ہو مگر میرے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ میرے یہاں جو قبلہ و کعبہ قسم کا درد اٹھتا ہے اس کے لئے پورا صحرا بھی اگر میں سر پر رکھ لوں تو اس کی حیثیت ایک مٹھی بھر خاک سے زیادہ نہیں ہو گی اور پورے صحرا کی خاک بھی سر پر ڈالنے سے غم نہیں بھلا پاتا۔

" خاک بر سر کردن " فارسی محاورہ ہے جس کے معنی بھلا دینا ہیں مرزا صاحب نے اس شعر میں اس محاورہ سے فائدہ اٹھایا ہے۔

غالبؔ بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

ایک مولوی صاحب جو ہر کھانے پینے والی چیز کے بیحد شوقین تھے اُن سے ایک صاحب نے کہا کہ مولانا پلاؤ کھائیے گا۔ بولے اے سبحان اللہ کیا کہنے۔ پلاؤ کا تو مجھ سے ایک روحانی تعلق ہے اس وجہ سے کہ پلاؤ تو اللہ بخشے دادا جان کہ اُن کی روز مرہ کی غذا تھی۔ چنانچہ مرتے مرتے فرما گئے تھے کہ دیکھ بیٹا زندگی میں پلاؤ کھانا نہ چھوڑنا ورنہ میں میدانِ حشر میں دامنگیر ہوں گا اس کے بعد ان سے پوچھا کہ مولانا مرغ کے بارے میں کیا خیال ہے بولے ہائے نانا جان مرحوم کو آپ نے یاد

دلادیا۔ مرحوم مرغ کو اس طرح کھاتے تھے کہ اُس کے ناخن تک چاب جاتے تھے اور مرغ کو اپنے مرنے کا غم نہ ہوتا تھا چنانچہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میری اولادوں میں کسی نے مرغ نہ کھایا تو اُس کی بخشش مشکل ہوگی۔ پوچھا مولانا کھیر کے بارے میں کیا خیال ہے بولے کھیر کا ذکر نہ کیجئے کیونکہ اسی کے سہارے ہم پل کر جوان ہوئے ہیں یہ خیال فرمائیے کہ پچھلے ہفتہ اتفاق سے گھر میں کھیر پکانا بھول گئی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاکسار کو کھانے کے بعد ہی لرزے سے بخار آگیا اسی لئے نانی جان مرحومہ کہا کرتی تھیں کہ بیٹا بغیر کھیر کھائے دنیا کی کوئی غذا ہضم ہی نہیں ہو سکتی۔ کہا مولانا پیٹ پر پتھر باندھنے کے بارے میں کیا خیال ہے بولے یہ پیغمبروں کی باتیں ہیں کیا تم چاہتے ہو کہ میں معاذ اللہ پیغمبر ہو جاؤں اس شعر میں مرزا صاحب بھی کچھ ایسی ہی بات فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دنیا میں کوئی انسان آج تک ایسا نہیں پیدا ہوا جس میں کوئی نہ کوئی برائی اور خامی نہ ہو بڑے بڑے پیغمبروں کو لوگ برا کہتے ہیں پھر اگر واعظ صاحب مجھے برا کہتے ہیں تو اُن کو برا کہنے پر برا ماننے کی کوئی بات نہیں ہمیشہ سے دنیا بھر کے اچھوں کو برا کہا جاتا رہا ہے لہذا اگر برائی نہ کروں تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں خدا کا درجہ حاصل کرلوں معاذ اللہ ارے صاحب آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ بقول شخصے ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں۔

غزل نمبر ۱۰۱

شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے   داغِ دلِ بے درد نظر گاہ حیا ہے

مرزا صاحب نے اس شعر میں شبنم کے قطروں کو دو چیزوں سے تشبیہہ دی ہے ایک تو عرقِ ندامت سے اور دوسرے دیدہ سے، دوسرے مصرعہ میں نظر گاہ حیا

لانے سے یہ مراد ہے کہ حیا داغ ہائے لالہ کی بے حیائی دیکھ رہی ہے اور شبنم کے قطرے اُس کے دیدے ہیں۔ مرزا صاحب چونکہ گرم مزاج واقع ہوئے تھے اس لئے انھیں ہر سوزش پسند تھی اور دل کے وہ داغ جو سوزش سے پیدا ہوئے تھے ان پر وہ فخر کیا کرتے تھے مرزا صاحب کا دل چونکہ ضعف کے سبب ٹھنڈا پڑ گیا تھا اس لئے اُس میں ذرہ برابر عشق کی حرارت یا گرمی باقی نہ تھی صرف لے دے کر پرانے عشق کے مرجھائے اور کمھلائے ہوئے داغ رہ گئے تھے جس کو وہ اپنے لئے باعث شرم سمجھتے تھے کیونکہ وہ گرما گرم کڑھائی سے اترے داغوں کے قائل تھے جن میں سوزش جلن اور تپکن تینوں چیزیں ہوں چنانچہ فرماتے ہیں کہ یہ جو شبنم کے قطرے سارے جہان میں بکھرے نظر آتے ہیں وہ در اصل اُن کے داغہائے دل میں سوزش کی کمی دیکھ کر ندامت اور شرمندگی کے قطرے بن گئے ہیں یا ان کی حیثیت اُن آنکھوں کی سی ہے جن میں شرمندگی کے آنسو بھرے ہوں

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق آئینہ بانداز گل آغوش کشا ہے

اس شعر میں کئی لفظی نزاکتیں ہیں پہلی نزاکت تو یہ ہے کہ معشوق کی نزاکت اس بات کی متقاضی ہے کہ اُس کے لئے پھول جیسا نرم و نازک آغوش ہو دوسری نزاکت یہ ہے کہ پنکھڑیوں کی تعداد ... ہی مناسبت سے بصد ذوق کے الفاظ لائے گئے ہیں اور تمثال کے معنی اگر فوٹو کے لئے جائیں تو آئینہ سے مراد وہ آئینہ ہوگا جو فوٹو کی حفاظت کے لئے لگایا جاتا ہے اور اگر تمثال سے عکسِ معشوق مراد لیں تو آئینہ حسب ایں صورت دیکھی جاتی ہے۔

مرزا صاحب کا محبوب بلا کا شوخ تھا ظاہر ہے کہ فوٹو لینے کے بعد کس میں

اتنی جرأت تھی جو اُن کی شوخیوں پر بندشیں عائد کرتا اور تصویر سے اُن کی شوخیوں
کو نکال سکتا۔ مرزا صاحب کو خود تو زندگی بھر محبوب سے ہم آغوش ہونیکی تمنا ہی تمنا
رہی کبھی اس کی تکمیل نہ ہوئی اس لئے اب لے دے کر وہ معشوق کے ہم آغوش
ہونیکی خیالی تصویریں بنا بنا کر خوش ہوا کرتے ہیں کبھی اُن کا فوٹو لا کر اپنے کمرے
میں آئینہ کے مقابل لگاتے اور آئینہ دیکھ کر فرماتے کہ تمھاری نزاکت اور تمھارے
حسن کے آئینہ نے پھول کی طرح آغوش کھول کر تمھاری تصویر کو سینے سے لگا لیا ہے
اور جتائے کھڑا ہے مقصد یہ کہ اگر مرزا صاحب کو اُن سے ہم آغوش ہونے کا موقع نہیں
ملا تو کم از کم اُن کا زر خرید آئینہ ہی مرزا صاحب کی طرف سے اُن کی تصویر کو اپنے
آغوش میں لئے کھڑا ہے۔ نذکر العیش نصف العیش۔

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ اے نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے

کفِ خاکستر = مٹھی بھر راکھ۔ قفسِ رنگ = رنج و غم کا قفس :۔

اس شعر کا مطلب تو صرف اس قدر ہے کہ عاشقوں کی پونجی سوائے نالہ اور
آہ و زاری کچھ نہیں گویا فتح محمد ولد بدھو دکان کرانہ نعع کدو گویا ساری زندگی
منہ نے پیٹنے کے بعد ہاتھ کیا آیا مبلغ دو ایک نالے اور دس پانچ رونے پیٹنے کی آوازیں
مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ قمری جس کا رنگ خاکی ہوتا ہے وہ ایک مٹھی بھر خاک
سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور بلبل کو عشق و محبت نے رنج و غم کا ایک قفس بنا دیا
ہے نہ ان دونوں کے پاس دل ہے نہ جگر کیونکہ اُسے آتشِ عشق نے جلا کر سلفا کر دیا
ہے اگر جگر سوختہ کی کوئی نشانی ہے تو وہ نالہ ہے جو بلبل بلند کرتی رہتی ہے۔
مرزا صاحب جس طرح خود عشق کی آگ میں جلتے رہتے ہیں اُسی طرح اُن کو سارا

جہاں عشق میں جلتا نظر آتا ہے اگر چڑیا چڑے کو دیکھا تو سوچے کہ وہ دیکھئے آتش آگ میں گھلتے گھلتے اب ان کی شکل چڑے سے مل گئی ہے ورنہ آتش عشق میں پگھلنے سے پہلے اچھے بھلے گبرو جوان تھے اسی طرح قمری کو دیکھ کر فرماتے کہ دیکھئے یہی پرند کسی زمانے میں پہاڑ کے مانند تھا اب آتش عشق میں جل کر مٹھی بھر راکھ معلوم ہونے لگا ہے اور اسی طرح بلبل کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ بھی عشق و محبت کا صید بننے کے بعد بالکل رنج و غم کا ایک پنجرہ نظر آرہی ہے اب نہ ان دونوں کے پاس دل ہے اور نہ جگر کیونکہ آتش عشق نے دونوں کو جلا کر خاک کر دیا ہے اور جو یہ باغ میں اڑی اڑی پھرتی ہیں اور پھولوں کو دیکھ کر نالے بلند کرتی ہیں۔ ان کے نالے نہیں ہیں بلکہ ان کے جگر سوختہ کا نشان ہیں۔ مرزا صاحب کو ہر شے عشق و محبت کا تیر کھائے نظر آتی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے اپنی زندگی میں کتنا بڑا عشق کیا ہو گا۔

خو نے مری افسردہ کیا وحشتِ دل کو معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

وحشتِ دل = دل کی بیقراری۔ جوشِ عشق۔

مرزا صاحب جب اپنے محبوب سے ایک مرتبہ ملے تو وہ نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ ان سے بغلگیر ہو لیا مرزا صاحب جن کا دل ہر وقت اُس کے فراق میں تڑپا کرتا تھا جب گھر واپس آئے تو ان کو تھوڑی بہت دل کی دھڑکن کم محسوس ہوئی سوچے یہ کہ شاید محبوب کی خاموشی اور سنجیدگی کے جراثیم دل میں اُتر گئے ہیں جس کی وجہ سے دل پر افسردگی کا عالم طاری ہے ورنہ جس وقت مرزا صاحب اُس سے بغلگیر ہوتے تھے تو بغلگیر ہونے سے پہلے سوچتے تھے کہ وہ پہلے بغلیں بجائے گا اس کے

بعد اُچکے پھاندے گا، شتر غمزے کرے گا اپنی چلبلاہٹ اور شوخی کے مظاہرے
کرے گا مگر جب وہ ملا تو مرزا صاحب سے اس انداز میں ملا کہ جیسے کوئی عید کی نماز
پڑھنے کے بعد کسی اجنبی سے سنجیدگی کے ساتھ بغلگیر ہوتا ہے چنانچہ مرزا صاحب
کو بڑی کوفت ہوئی اور رسوائی کے بعد دل میں سوچے کہ دیکھئے معشوق ہوکر ایسی
بے حوصلگی کے ساتھ عاشق سے بغلگیر ہوا کہ معلوم ہی نہوا کہ عاشق و معشوق
ایک دوسرے سے مل رہے ہیں بلکہ یہ تو عید کی نماز کے بعد والا بغلگیر ہونا تھا جس
میں کوئی مزا ہی نہ آیا۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد   یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ صاحب یہ، تو دنیا میں جس وقت حاضر ہوا تھا اس
وقت میں نے جتنے موٹے موٹے گناہ تھے وہ سب بہ حسن و خوبی کر لئے چنانچہ اب نے
کے بعد اس کی سزا دی جا رہی ہے اور حق بجانب دی جا رہی ہے کیونکہ گناہوں کا گلے
گلے پانی تک مجھے اقرار ہے مگر انصاف کے معنی تو یہ تھے کہ اُن گناہوں کے سلسلے
میں جو جو درگت ہم پر ہوئے اور جو صلواتیں ہم پر پڑیں اور ہم نے نہایت سکونِ
قلب کے ساتھ اُن صلواتوں کو برداشت کیا اس کی بھی تو داد ملنی چاہئے مقصد یہ ہے
کہ جن گناہوں کا ہم ارتکاب کرنا چاہتے تھے اور اُن کے ارتکاب کی ہم میں صلاحیت
نہ تھی وہ گناہ آرزو حسرت اور افسوس کی شکل میں تبدیل ہوگئے اور اُن کی حسرتیں
دل میں لئے لئے ہم حاضر ہوئے ہیں آخر اُن کا بھی کچھ پاس لحاظ ہونا چاہئے یعنی
اس سلسلہ میں جو ثواب ہم کو ملنا چاہئے اس کو اور اُن گناہوں کی پاداش میں جو
سزا مقرر کی گئی ہے اُن کو تول لیا جائے اور جس طرف ترازو کا پلڑا بھاری ہو

وہ ہم کو عنایت کی جائے اور اس کا مرزا صاحب کو پورا الیقین ہے کہ ثواب کا پلڑا ان معنوں بھاری ہوگا کہ وہ صرف چھٹانک چھٹانک بھر یا ڈیڑھ ڈیڑھ چھٹانک کے گناہ کر پائے بقیہ سیر سیر اور سوا سوا سیر والے گناہ تو سرزد ہونے سے رہ ہی گئے لہذا اُن وزنی گناہوں کے معاوضہ میں اتنا وزنی ثواب ملنا چاہیے تاکہ ہمارے گذر بسر کی کوئی صورت نکلے۔

غزل نمبر ۱۵۲

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو　　کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

مرزا صاحب، واعظ اور محتسب کی عبادت اور ریاضت کو ریا کاری قرار دیتے تھے اور اُن کا خیال ہے کہ یہ واعظ اور محتسب جو عبادت کرتے ہیں وہ محض شراب طہور کے لالچ میں کرتے ہیں چنانچہ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ بھئی واعظ صاحب یہ بھی کوئی شراب میں شراب ہوئی جس کو آپ خود پی سکیں اور نہ دوسروں کو پلا سکیں۔ یہ مانا کہ آپ کی شراب ہماری دنیا والی شراب کے مقابلے میں نہایت خوش ذائقہ اور مزے دار ہوگی کیونکہ وہ بڑے بڑے جنت کے انگوروں کی کشید کی ہوئی ہوگی مگر اگر آپ خود نہیں پی سکتے تو ہمیں کو تھوڑی چکھا دیتے کہ اُس کا ذائقہ کیا ہے بھلا یہ بھی کوئی شراب ہے جس کو نہ آپ خود پی سکیں نہ دوسروں کو پلا سکیں۔

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا　　گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی

مرزا صاحب اس شعر میں میدان حشر کا ذکر فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ صاحب جب صور پھونکا گیا تو عام مُردوں کی طرح یہ ناچیز بھی اُٹھ کر میدان حشر میں

حاضر ہو گیا مگر وہاں جو پہنچا تو ہمارے قاتل صاحب یعنی معشوق نے ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی اور کہنا شروع کیا کہ صاحب سب تو اٹھے تھے مگر آپ بغیر ہماری اجازت کے قبر چھوڑ کر یہاں کیوں اُٹھ آئے اس پر مرزا صاحب نے عرض کی حضرت معاف کیجئے گا آپ کچھ مجھے اونچا سنتے دکھائی پڑتے ہیں ذرا بڑھ کر اسرافیل صاحب سے دریافت کیجئے جو ابھی صورِ قیامت پھونکے چلے آرہے ہیں دیکھتا ہوں کہ آپ میدان حشر میں بھی اپنی بے نیازی اور ترش غمزوں سے باز نہیں آتے واللہ اپنے اوپر رحم فرمائیے ورنہ یہ میدان حشر ہے کوئی مذاق نہیں یہاں اس قسم کی باتوں پر لئے دھر لئے جائیے گا۔

گو وہاں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

مرزا صاحب محبوب کے تقدس اور عظمت کا اس شعر میں ذکر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ صاحب یہ بت جن کے ساتھ ہم عشق کئے ہوئے ہیں وہ بھی اپنی جگہ پر تقدس کے مالک ہیں کیونکہ جس جگہ اب خانۂ کعبہ ہے پہلے اُسی مقام پر بُت خانہ تھا لیکن کعبہ کی تعمیر کے بعد ان بتوں کو وہاں سے نکال دیا گیا بہر حال اس اعتبار سے اُن کے تقدس میں کس کو شک ہو سکتا ہے کہ اگر وہ خانۂ کعبہ میں اب نہیں ہیں تو اس سے پہلے تو اس سرزمین میں رہ چکے ہیں گویا ان کا تعلق کسی نہ کسی عنوان سے خانۂ کعبہ سے رہا ہے اس لئے اگر ان کی حیثیت گھوڑے کی نہیں تو اُس کے بُنہ باس کی تو ہے۔ لہذا ہم جو ان کی پرستش کرتے ہیں تو محض اس بنا پر کہ ان کا روحانی تعلق اُس سرزمین سے رہ چکا ہے

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر کہ جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

مرزا صاحب کا محبوب ہر وقت تیوریاں چڑھائے مرزا صاحب سے بدکلامی کیا کرتا تھا آخر ایک دن مرزا صاحب کو بھی تاؤ آ ہی گیا اور فرمانے لگے جی ہاں معلوم ہے آپ بڑے لاٹ صاحب ہیں اور ایسے گرم مزاج .. واقع ہوئے ہیں کہ بات بات پر منہ سے جھاگ بہنے لگتا ہے مگر انسان کو ذرا اپنے غصہ اور گرمی پر قابو رکھنا چاہیے: آپ کی بدکلامی اور ترش روئی کا یہ عالم ہے کہ پرسوں آپ کے والد صاحب قبلہ ملے تھے اور اُن سے جب آپ کا ذکر آیا تو وہ بھی فرما رہے تھے کہ حضرت کیا عرض کیا جائے وہ تو اس بلا کی بدتمیز اور بدکلام ہے کہ اس کے منہ لگتے ڈر معلوم ہوتا ہے اسی طرح ابھی چند روز ہوئے جب نواب اغن صاحب ملے تھے اور فرما رہے تھے کہ ارے صاحب ایک دن تو ایک سبزی فروش سے ایسا تھک فرما رہی تھیں کہ پٹتے پٹتے بچی لہٰذا غور فرمائیے کہ وہ تلخی بھی کس کام کی جس سے عزت آبرو پر بن آئے۔

غزل نمبر ۱۵۳

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے　　یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے

گلفام یہ گلرنگ یعنی سُرخ۔

مرزا صاحب نہ جانے کہاں سے روزِ ازل کسی کا نہایت بزدل اور کمزور دل اٹھا لائے تھے کہ جب دنیا میں پہنچکر اُس کو رنج و غم برداشت کرنا پڑے تو وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا اُس کی بزدلی کی حد و انتہا یہ کہ بڑے بڑے پہاڑ سی غم اٹھانا تو بڑی بات ہے حالت یہ ہے کہ اگر بجائے پوری خوراک کے معمولی طور پر تھوڑی بھی شراب کم ملتی ہے تو زمین و آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے اور چلانا شروع کر دیتا ہے کہ صاحب اتنے تھوڑے سے نشہ میں ہم سے کوئی غم اٹھائے نہ اٹھے گا

ہم کو پورا ڈوز (خوراک) ملنا چاہیئے۔

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ   ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہہ جام بہت ہے

اس شعر میں مرزا صاحب نے نہایت کسر نفسی سے کام لیا ہے اور فرماتے ہیں کہ اے صاحب شراب تو شراب مجھے اگر شراب کی تلچھٹ بھی مل جائے تو میں اُس پر گذر بسر کر لوں گا مگر ساقی کے سامنے میں جو چلو لگا کر ادھا دھند پینا شروع کرتا ہوں اُس کی ایک دوسری وجہ ہے اور وہ یہ کہ اگر اُس کو اطلاع ہو جائے کہ میں اس درجہ قانع ہوں کہ معمولی تلچھٹ پر گذر بسر کر لیتا ہوں تو یقین ملنے کے دوسرے دن سے وہ مجھے اس درجہ حقیر اور ذلیل سمجھنے لگے کہ تمام لوگوں کے پیالوں کی تلچھٹ ایک مٹکے میں جمع کر کے مجھ سے کہیگا۔ لیجئے جناب کی شراب حاضر ہے لہٰذا محض ذلت سے بچنے کے لئے اور ساقی پر دھونس جمانے کے لئے میں اپنی قناعت کا اظہار اُس پر نہیں ہونے دیتا۔

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی   پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

ریائی = دکھاوے کا۔ پاداش = معاوضہ۔ طمع خام = بیہودہ لالچ۔

عام لوگ تو زہد ریائی کو بُرا کہتے ہیں مگر مرزا صاحب کو نہ جانے زاہد سے کس بلا کی نفرت ہے کہ اُس کی ایک بات بھی اِن کو پھوٹی آنکھوں نہیں بھاتی۔ چنانچہ وہ زہد بے ریا کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اور کہتے ہیں کہ صاحب جتنے زاہد قسم کے لوگ ہیں اُن کی ساری عبادت اور ریاضت کا مقصد اس قدر ہے کہ اُن کو کسی نہ کسی عنوان سے جنت کی فکر ہوتی ہے جنت کے حور و غلمان صف بستہ اُن کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں اور جب وہ سجدے میں

جاتے ہیں تو انھیں حوران بہشتی کی خیالی تصاویر اپنے سامنے رکھ کر ان کا انتخاب کیا کرتے ہیں کہ اگر جنت میں جانا ہوا تو ان ان سے اظہار محبت کیا جائے گا کیونکہ ان کی آنکھیں بھی ماشاء اللہ بڑی ہیں اور ہاتھ پیر کی بھی اچھی ہیں اور ناک بھی ستواں ہے۔ ناک نقشہ بھی برا نہیں ہے۔ لہٰذا یہی ٹھیک رہے گی۔

غزل نمبر ۱۵۴

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو عرصہ ہوا ہے دعوت مژگاں کئے ہوئے

مرزا صاحب محبت میں دن رات خون کے آنسو بہاتے رہتے تھے مگر ان کے جگر کو محبوب کے تیر نظر نے چھلنی چھلنی کر دیا تھا جس کی وجہ سے وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا ظاہر ہے کہ اس کے ذریعہ خون حاصل ہوتا ہے لہٰذا مرزا صاحب کا دن رات یہی مشغلہ تھا کہ جب محبوب جگر کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے چلا جاتا تو یہ بیچارے اس کی بوٹیوں کو یکجا کرتے اور یکجا کرنے کے بعد جب وہ مکمل ہو جاتا تو اپنی مژگاں کو دعوت دیتے کہ آیئے ایک ایک پالی پھر ہو جائے یعنی محبوب کی یاد میں آنسو بہائے جائیں یا۔ ممکن ہے کہ یہ بغیر اس کا خیال کئے کہ جگر اپنی جگہ پر ہے یا نہیں محبوب کی مژگاں کو دعوت دیئے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور عین دعوت کے دن جب ٹٹول کر دیکھتے ہیں اور جگر کو غائب پاتے ہیں تو سخت پریشان ہوتے ہیں چنانچہ اب جگر کے ٹکڑے جمع کر رہے ہیں کیونکہ ان کو معلوم ہے کہ مژگاں یار کو تمام چیزوں میں سب سے زیادہ مرزا صاحب کا جگر پسند ہے لہٰذا یہ اس اہتمام میں نظر آتے ہیں۔

پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

مرزا صاحب وحشت اور جنون کو زندگی بھر ضبط کرتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کا دم گھٹنے لگا چونکہ عشق و محبت میں ضبط کرتے کرتے یہ بے حد کمزور اور ناتواں ہو گئے تھے اِس لئے اب اِن کے پاس سوائے اِس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ یہ گریبان پھاڑ کر صحرا کو روانہ ہو جائیں۔ گریبان انھوں نے احتیاطاً پہلے سے پھاڑ رکھا تھا اس لئے اب جب قوت برداشت نے جواب دیدیا تو اب یہ اپنا پرانا پھٹا ہوا گریبان لے کر صحرا نوردی پر آمادہ ہیں۔

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب نظارۂ و خیال کا ساماں کئے ہوئے

مرزا صاحب کی جان عجیب الجھن میں پڑی ہوئی ہے انھوں نے عشق کیا کیا ہے کہ اچھی خاصی گھر پر ایک بیٹر کی پالی بلا رکھی ہے حالت یہ ہے کہ محبوب پر مرزا صاحب تو عاشق تھے ہی اُن کی دیکھا دیکھی دل اور دیدہ دونوں علٰحدہ علٰحدہ ان کی محترمہ پر عاشق ہو گئے دل چاہتا ہے کہ محبوب کے تصور میں پڑا رہے اور سارے کام چھوڑ دے دوسری طرف دیدہ شوق نظارہ سے مجبور ہو کر اس فکر میں ہے کہ محبوب کے کوچہ میں پہنچکر مستقل آسن جمائے بے فکری کے ساتھ محبوب کا نظارہ کیا کرے۔

نتیجہ یہ ہے کہ مرزا صاحب کی جان عجیب گتاخصی میں پڑی ہوئی ہے کہ کس کا ساتھ دیں اور کس کا ساتھ نہ دیں کیونکہ عشق کے سلسلے میں مرزا صاحب کا دل اور دیدہ دونوں کے محتاج ہیں اور اُدھر ان دونوں میں سخت رقابت چل رہی ہے۔

دل پھر طواف کوئے محبت کو جائے ہے پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

پندار کا صنمکدہ ویران کرنا۔ خودداری اور نخوت کو ترک کرنا۔

مرزا صاحب کو عشق میں محبوب کی صلواتیں سننے کا ایسا چسکا لگ گیا ہے کہ اب وہ

محبوب کی صورت دیکھے بغیر اب زندہ ہی نہیں رہ سکتے چنانچہ متعدد بار انھوں نے عہد کیا کہ اب کبھی محبوب کے کوچہ میں بھول کر قدم نہ رکھیں گے مگر پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئے اور ان کو کوچۂ محبوب میں جانا پڑا۔

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا　　جاں نذر دلفریبیٔ عنواں کئے ہوئے

نجانے کس ترنگ میں مرزا صاحب کے محبوب نے نہایت محبت بھرے انداز میں بھاری القاب و آداب کے ساتھ مرزا صاحب کو ایک خط لکھ کر بھیجدیا ہے مرزا صاحب خط کو سونگھ ہی کر پہچان لیتے تھے کہ خط کس کا لکھا ہوا ہے۔ لہٰذا خط کھولنے سے مرزا صاحب کلمۂ شہادت زبان پر لاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے میں محض القاب و آداب پر جان قربان کرتا ہوں اس کے بعد اندر کی عبارت پڑھوں گا اس سے اب مرزا صاحب لوگوں پر یہ رعب ڈالنا چاہتے ہیں کہ ان کا محبوب ان کا بےپناہ احترام کرتا تھا اور ان کو جو خطوط لکھتا تھا اس کے القاب و آداب ہی سے اس کے خلوص و محبت کا پتہ چلتا تھا حالانکہ قطعاً ایسا نہ تھا کیونکہ مرزا صاحب ہمیشہ سے اس کے جور و تشدد کا شکوہ کرتے رہے ہیں۔

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس　　زلف سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے

مرزا صاحب چوبیسوں گھنٹے اس فکر میں رہتے ہیں کہ محبوب کا دیدار ہو جائے مگر جب ملنے کی کوئی صورت باقی نہ رہی تو مرزا صاحب نے اس کی خیالی تصویر بنانا شروع کر دی جیسے وہ اپنے کوٹھے پر اپنی سیاہ زلفیں رُخ پر ڈالے کھڑی ہوئی ہیں اور مرزا صاحب کے انتظار میں گھلی جا رہی ہیں۔ گویا مرزا صاحب واجد علی شاہی عظمت کے مالک ہیں جن پر ہزاروں حسینائیں ہر وقت جان ہتھیلی پر لئے کھڑی رہتی ہیں

اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ   چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے

مرزا صاحب جس قسم کا حسن چاہتے تھے ویسی تصویر اپنی خیالی دنیا میں کھینچ لیتے تھے اور اُس سے مزے لیا کرتے تھے چنانچہ اچانک بیٹھے بٹھائے آپ کو ایک کم سن لڑکی کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا یہ خیال آتے ہی آپ نے آنکھیں بند کر لیں اور ایک خیالی تصویر اپنے سامنے کھڑی کر لی اور اپنی خیالی دنیا میں اُس کو شراب وراب پلا کر اس کا سُرخ اور حسین چہرہ دیکھ کر فرمانے لگے کہ بھئی کیا چیز تیار ہوئی ہے نہ ہرہ لگا نہ پھٹکری۔ مگر مزہ کیا چوکھا رہا ہے۔

پھر جی میں ہے کہ در پر کسی کے پڑے رہیں   سر زیر بار منت درباں کئے ہوئے

مرزا صاحب کو اپنی خیالی دنیا میں جہاں مختلف سائز اور مختلف کینڈے کے معشوق نظر آتے ہیں وہاں وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ معشوق کا دروازہ ہو، اُس کے دروازے پر ایک بلم بردار محافظ کھڑا ہو اور یہ اُس کی خوشامد کر رہے ہوں اور اُس کو طرح طرح کے لالچ دے رہے ہوں کہ ابے نہ تیری اٹھنی اور نہ ہماری چونی پانچ آنے پیسے نقد کر اور اندر جانے دے۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن   بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں مرزا صاحب نے عشق فرمایا تھا اسی زمانہ میں اُن کو کوئی اچھی جگہ مل گئی تھی چنانچہ یہ باعزت طریقے پر عشق کے کوچے سے ریٹائر ہو گئے اس وجہ سے کہ ملازمت کے بعد اِن کے پاس عشق کرنے کے لئے وقت ہی نہ رہا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ہی عرصہ بعد وہ ملازمت چھوٹ گئی اور یہ پھر اسی کوچہ میں واپس آ گئے چنانچہ فرماتے ہیں کہ بھئی ملازمت

نہ چھوڑتے تو کیا کرتے۔ ملازمت میں دل ہی نہیں لگا۔ ملازم ہونے کے بعد بھی محبوب کا تصور دماغ سے نکلنے کا نام ہی نہ لیتا تھا اسی لئے مجبوراً ملازمت سے کنارہ کش ہونا پڑا۔ بات یہ تھی کہ ملازم ہونے کے بعد ہر وقت دل چاہتا تھا کہ دن بھر تصور جاناں ہی میں پڑے ان کی تصویر پر مسمریزم کی مشق کرتے رہیں۔

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے　　بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

اس شعر میں مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ دیکھئے صاحب ہم ابھی سے بتائے دیتے ہیں کہ ہم آنکھوں میں اشکوں کی پچکاریاں بھرے بیٹھے ہوئے ہیں کوئی صاحب ہم کو چھیڑنے کی زحمت گوارا نہ کریں ورنہ پھر ہم ان کے کپڑوں کی تباہی کے ذمہ دار نہ ہوں گے کیونکہ ہمارے صرف چھیڑنے کی دیر ہے ادھر ہم کو کسی نے چھیڑا کہ ہم نے اپنے نالوں سے زمین و آسمان سر پہ اٹھالیا۔ اور سیلاب گریہ سے علاقے کے علاقے تباہ کرنا شروع کردیئے۔

غزل نمبر ۱۵۵

وید امن ہے بیداد دوست جاں کیلئے　　رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لئے

نوید یہ خوشخبری؛۔

مرزا صاحب پر عشق و محبت کے سلسلے میں پہلے دو طرفہ حملے ہوتے تھے ایک طرف ان پر محبوب جور و تشدد کرتا تھا دوسری طرف ان کو آسمان سے شکایت تھی کہ وہ چوبیسوں گھنٹے ان پر ڈھیلے بازی کیا کرتا ہے چنانچہ جب محبوب نے نئے نئے پینترے بدل کر اور نئے نئے انداز سے ان پر مظالم کرنا شروع کئے تو مرزا صاحب کو بیحد خوشی ہوئی چنانچہ فرماتے ہیں کہ قبلہ میں آپ کا بے حد ممنون احسان ہوں کہ آپ نے

جتنے جور و تشدد کے حربے تھے وہ سب استعمال کر لئے جتنی کہ اب فلک کجرفتار کے پاس کوئی داؤں جور و تشدد کا باقی نہیں اس لئے آپکے جور و تشدد سے اتنا فائدہ ہوا کہ آسمان کے جور سے نجات مل گئی اور اب اگر وہ مجھ پر ظلم و تشدد کرنے کے لئے کوئی نئے حربے کی تلاش کرتا ہے تو اُسے ملتا ہی نہیں کیونکہ وہ سب آپ استعمال کئے بیٹھے ہیں۔

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے　　رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونچکاں کیلئے

مرزا صاحب کے جسم میں جتنا خون تھا وہ جونک بن کر مژگانِ دوست چوستی رہی اور مرزا صاحب سانپ کے بچوں کی طرح مژگانِ دوست کو پالتے رہے۔ مرزا صاحب کے جسم میں ظاہر ہے کہ خون ہی کتنا تھا پھر اُس پر اپنی مژگان اور مژگانِ یار گویا دُو دُو کو بیک وقت پالنا دشوار تھا جوانی میں تو خیر مرزا صاحب کو پتہ نہ چلا کیونکہ جوانی میں جسم میں خون ہی خون تھا لیکن اب بڑھاپے میں جب مرزا صاحب کے جسم میں خون کی ایک چھینٹ نہ رہی اور مژگان یار کی طرف سے خون کا مطالبہ ہوا تو مرزا صاحب بھی جل گئے۔ اور جل کر کہنے لگے کہ صاحب اب چاہے آپ کی مژگاں بھوکی رہیں یا فاقوں سے پڑی رہیں ہم ذمہ دار نہیں ہیں۔ ہم جتنا خون تھا وہ پلا چکے اب تھوڑا بہت خون ہم نے اپنی ذاتی مژگاں کے لئے رکھ چھوڑا ہے ہم نے کوئی زندگی بھر کا ٹھیکہ نہیں لیا تھا اب اتنے دنوں ہم پلا چکے اب گھر میں اتنے بزرگ موجود ہیں اُن سے کہیئے کہ وہ آپ کو اپنا خون پلائیں۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

مرزا صاحب اس شعر میں حضرتِ خضر علیہ السلام کی لمبی چوڑی عمر پر اعتراض فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ صاحب، آپ کی عمر بھی خوب ہے کہ ازل سے ابد تک لمبی چوڑی چلی گئی ہے جس میں نہ کوئی دل کشی ہے اور نہ کوئی دلچسپی نہ آپ کے کوئی دوست واحباب ہیں نہ آپ کو کوئی جانتا ہے اور نہ آپ کسی کو نظر آتے ہیں ایک تنہائی کی زندگی گذار رہے ہیں لہٰذا اس لمبی چوڑی عمر سے کیا فائدہ یہاں ملاحظہ ہو کہ اگرچہ عمر جناب کی عمر کے مقابلے میں محض چھٹانک بھر کی ہے مگر اس عمر میں بیوی کی جگہ بیوی محبوبہ کی جگہ ۔ محبوبہ ۔ ڈومنی کی جگہ ڈومنی ، سب ہی چیزیں اللہ کی دی ہوئی میسر ہیں اور ان دلچسپیوں کے علاوہ دن رات دوست احباب کے جمگھٹے ہیں ۔ شرابیں چل رہی ہیں ۔ شعر و شاعری سے فضا گونج رہی ہے حقہ سلگ رہا ہے ۔ آموں کی فصل میں آم ، خربوزوں کی فصل میں خربوزے غرض دنیا کی کونسی نعمت ہے جو میسر نہیں اگرچہ عمر چھوٹی ہے مگر اس چھوٹی پہ نہ جایئے بلکہ یہ دیکھئے کہ ماشاء اللہ اس میں رنگینی کتنی ہے ؟ آپ تو چوروں کیطرح منہ چھپائے ہیں

فلک نہ دور رکھ اُس سے مجھے کہ میں ہی نہیں درازدستیِ قاتل کے امتحاں کے لئے

درازدستی = ظلم

اگر انسان کے منہ کو کوئی چیز لگ جاتی ہے تو پھر ذرا مشکل ہی سے چھوٹتی ہے مثلاً اگر کسی افیونی کو افیون خانے سے نکال کر فردوس بریں میں مقام علیین عطا کر دیا جائے تو وہ ہاتھ جوڑ کر کہے گا کہ حضرت مجھے تو میرا افیون خانہ ہی

جنت معلوم ہوتا ہے ہماری چھپکلی کے مقابلے میں آپ کے فردوس بریں کی ہر چیز بے حقیقت ہے۔ یہی حال ہر بازی والے کا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ڈانٹ ڈپٹ کا عادی ہو گیا ہے تو بغیر ڈانٹ ڈپٹ کے اُس کو زندگی میں کوئی دلکشی اور چہل پہل نظر آتی چنانچہ ایک عورت جس کا شوہر زندگی بھر اس کے کپڑے لتے بیچکر اور باندان اور گھر کا دوسرا اثاثہ بیچ بیچ کر زندگی گزارتا رہا اور صبح شام آ کر بیوی کی روٹیاں کھاتا اور اُلٹے اُس پر ڈانٹ ڈپٹ کرتا اور بسا اوقات پٹائی کرتا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ شخص مر گیا اس کے مرنے پر اُس کی بیوی نے روتے روتے زمین و آسمان سر پر اُٹھا لیا چلاتی تھی اور بین کرتی تھی کہ ہائے اب پابندی سے روز کون گھر کا اثاثہ رہن رکھ رکھ کر مزے اڑائے گا۔ کون دونوں وقت ہڈیوں کا چورا بنائے گا! اور کون ہر سال بچوں میں اضافہ کرتا رہے گا۔ یہی حال مرزا صاحب کا ہے۔ مرزا صاحب پر ان کا محبوب عام معشوقاؤں کی طرح جور و تشدد کیا کرتا تھا اور اس جور و تشدد کا خون مرزا صاحب کے منہ کو ایسا لگا تھا کہ ان کو اگر فلک کج رفتار نے جور و تشدد سے بچانے کی کوشش بھی کی تو مرزا صاحب نے الٹے اس کی خوشامد شروع کر دی کہ اے فلک کج رفتار مجھ پر جو جور و تشدد اور دراز دستی ہو رہی ہے وہ ہونے دے اگر تجھ کو بچانا ہے تو کسی اور عاشق کو اُس کے محبوب کے جور و تشدد سے بچا۔ یہاں تو جور و تشدد کے ایسے عادی ہو گئے ہیں کہ اگر صبح سے شام ہم پر ڈانٹ ڈپٹ نہ ہو تو ہمارا کھانا ہی ہضم نہ ہو۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا میری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

مرزا صاحب نے اس شعر میں دو چیزوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس شعر کی یہی دونوں چیزیں جان ہیں ایک یہ کہ پاسبان نے عاشق کے ساتھ کیا سلوک کیا دوسرے یہ عاشق پاسبان سے چاہتا کیا تھا یہ دونوں باتیں اگرچہ واضح طور پر نہیں بیان کی گئی ہیں اور صرف کنایہ میں ادا کی گئی ہیں لیکن پہلے مصرع میں لفظ " شامت " اور دوسرے میں " قدم " کا لفظ اس بات کی وضاحت کرتا ہے حالات کیا رہے ہوں گے اب صورت حال ملاحظہ ہو کہ معشوق کے دروازے پر پہرا ہو رہا ہے اور یا علی حیدر اور جاگتے رہو اور جاگتے رہو کے نعرے بلند ہو رہے ہیں اور مرزا صاحب کے محبوب کے آستانے پر کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ مگر مرزا صاحب رات کے سناٹے میں دبے پاؤں فقیر کا لباس پہن کر اس کی ڈیوڑھی میں ایک جگہ دبک کر لیٹ جاتے ہیں۔ دروازے کا پاسبان جو غالباً کوئی پہاڑی دہاڑی ہوگا وہ یہ سمجھ کر کہ کوئی فقیر و قیر ہے تھک کر پڑ رہا ہے دس گیارہ بجے رات تک تو وہ کچھ نہیں بولا۔ اب مرزا صاحب کی شامت اعمال ملاحظہ ہو کہ جب ذرا اور سناٹا ہو گیا اور آپ سوچے کہ اب کوئی صورت محبوب تک رسائی کی نکالی جائے تو سوچتے سوچتے آخر میں یہ سمجھ میں آیا کہ پہاڑی ملازم اپنے آقا کے بے حد وفادار ہوتے ہیں لہذا رشوت کے ذریعہ تو کام نکلنے سے رہا اب صرف ایک صورت یہ ہے کہ

ایک دم اُٹھ کر اُس کے قدموں پر گر پڑو یہ انسان ہی تو ہے شاید اس طرح قدموں پر گرتا دیکھ کر اُس کو رحم آجائے اور وہ جانے کی اجازت دیدے چنانچہ عین اُس وقت جبکہ یہ اڑنی نوکر تقریبًا نیند میں تھا اور یہ اطمینان کرکے کہ کسی قسم کا کھٹکا نہیں ہے سونے جا رہا تھا کہ مرزا صاحب کو جو شیطان نے انگلی دکھائی تو یہ اُس کے قدموں پہ جا گرے اور اُس کے قدم پکڑ کر اُس کی خوشامد درآمد کرنے لگے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کام کچھ بنا نہیں کیونکہ "شامت" سے خود بخود ایک بھیانک تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور پتہ چل جاتا ہے کہ مرزا صاحب پر کیا گذری ہوگی۔